المذكرات التفسيرية

ما يتعلق بسورة الكهف

برموقع نواں کل ہند مسابقة القرآن الكريم فی الحفظ والتفسير، وحفظ الحديث

تحریک وتحیض

خادم القرآن، رئیس الجامعہ، ہمدردِ قوم وملت

الحاج حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

دامت فیوضہم العالی

زیرِ نگرانی

مولانا حذیفہ صاحب وستانوی

دامت برکاتہم

ناظم تعلیمات جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

ترتیب وتشریح

مفتی عبدالمتین صاحب کانڑگاؤں

مفتی افضل صاحب دھلیوی

اساتذۂ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

ناشر

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

اظہارِ حقیقت مع طریقۂ استفادہ

ارشادِ خداوندی: **"انا انزلنا الیک الذکر لتبین لناس"** کے مطابق قرآن پاک کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کی تفہیم، تفسیر سے وابستگی اور پھر اس کے بعد اس کو عملی جامہ پہنانا ایک مؤمن کا ایمانی تقاضہ ہے، الحمد للہ! مدارسِ دینیہ اس سلسلہ میں اپنی مقدور بھر کوشش کئے ہیں، اور کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کے بانی ورئیس کی اولِ تاسیس سے امت کو قرآن سے وابستہ کرنے کی فکر رہی، اور اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی مساعی مسلسل ہو رہی ہے۔ من جملہ مساعی کے ایک سعیٔ جمیل مسابقاتِ قرآنیہ کی سنہری اور مقبول کڑی ہے، جس کے تحت جامعہ پچھلے ۲۶ سالوں سے مدارس کے درمیان حفظِ قرآن مع التجوید، تفسیر اور حفظِ حدیث کے مسابقات کرواکے ہندوستان کی ۲۳ سے زائد ریاستوں کے پانچ ہزار سے زائد مدارس کو تحریکِ مسابقات سے وابستہ کر چکا ہے۔

اب کی مرتبہ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰۱۸ء میں مسابقات کی فرعِ تفسیر کے سلسلہ میں مشورہ کے دوران مولانا حذیفہ سلمہ کی رائے سورۂ کہف کی مقدار متعین کرنے کی ہوئی، جس کو رئیس جامعہ نے منظور فرمایا۔ اور اس کے مذکرے کی تیاری کے لیے جامعہ کے دو ہونہار فاضل لائق فائق اساتذہ جناب مفتی عبدالمتین صاحب اور مفتی افضل صاحب حفظہما اللہ کو اس کا مکلّف بنایا۔ ان حضرات نے اپنی درسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ انتہائی جد وجہد کر کے سورۂ کہف سے متعلق تفسیری مواد جمع کیا، جو آپ کے پیشِ خدمت ہے۔

اللہ ان کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

فرعِ ثالث کے طلباء جن کو تفسیر کی فرع میں حصہ لینا ہے ان کو مندرجۂ ذیل امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اساتذہ کی نگرانی میں کوشاں رہنا چاہئے۔

(۱)تلاوتِ آیات مع رعایتِ تجوید(حدراً)۔

(۲)ترجمۂ آیات مع صحتِ تلفظ۔

(۳)ربط بین الآیات۔

(۴)شانِ نزولِ آیات

(۵)حل مفردات القرآن مع تحقیقِ لغوی،نحوی،صرفی۔

(۶)بلاغتِ قرآنی کا اجراء مذکرۂ تفسیریہ کی روشنی میں۔

(۷)تفسیرِ آیاتِ قرآنی۔

(۸)درس وپیغام آیاتِ قرآنی۔

(۹)اللہ آپ کے لیے یاد کرنے،اور ہمارے لیے آپ کی محنت کی قدر کرنا آسان فرمائے۔

اس مذکرۂ تفسیر کی تیاری میں کئی اساتذہ کرام نے مختلف نوعیت کی جدوجہد کی ہے، کسی نے کمپوزنگ وسیٹنگ کی تو کسی نے نظرِ ثانی اور تصحیح کی، کسی نے مخلصانہ اور فکرمندانہ نگرانی کے ذریعہ تعاون کیا ہے۔اللہ تعالی سب کی مساعیِ جمیلہ کو قبول فرمائے، اور تبلیغِ تفسیر وحدیث کی اس تحریک کا پورا پورا اجر ان کو عطا فرمائے۔

ادارۃ المسابقات سب ہی معاونین مخلصین اساتذہ کا دل گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

از

(مولانا)عبدالرحیم(صاحب)فلاحی

(استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا)

اجمالی فہرست

نمبر شمار		صفحہ
◉	آئینہ سورۂ کہف	◉
۱	**مقدمہ** (آیت ۱ر تا ۸)	۱۹
۲	**قسمِ اول** (آیت ۹ر تا ۳۱)	۳۹
۳	واقعۂ اُصحابِ کہف	۳۹
۴	(۱) **فتنۂ دین وایمان**	۴۹
۵	قصۂ اصحابِ کہف کا پیغام کفار کے نرغے میں پھنسی مظلوم ومجبور مسلمان اقلیت کے نام	۹۵
۶	بعض المستفاد من قصة أصحاب الكهف	۱۰۰
۷	**قسمِ ثانی** (آیت ۳۲ر تا ۴۹)	۱۱۸
۸	(۲) **فتنۂ مال ودولت**	۱۱۸
۹	دو باغ والے شخص کے قصہ سے ہمیں کیا سبق ملا؟	۱۵۲
۱۰	**قسمِ ثالث** (آیت ۵۰ر تا ۵۹)	۱۵۹
۱۱	(۳) **فتنۂ ابلیس**	۱۵۹
۱۲	**قسمِ رابع** (آیت ۶۰ر تا ۸۲)	۱۸۲
۱۳	حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا تعلیمی وعلمی سفر نامہ	۱۸۲
۱۴	قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام سے ہمیں کیا سبق ملا؟	۲۴۱
۱۵	**قسمِ خامس** (آیت ۸۳ر تا ۹۸)	۲۴۵

۱۶	**(۴) فتنۂ جاہ ومنصب (سیاست)**	۲۴۵
۱۷	شاہ ذوالقرنین کا سیاسی سفرنامہ	۲۴۵
۱۸	فتنۂ یاجوج وماجوج	۲۶۲
۱۹	قصۂ ذوالقرنین سے ہمیں کیا سبق ملا؟	۲۸۴
۲۰	کامیاب قائد ورہبر، ناظم ومہتمم، مدیر ومعتمد، متولی وسرپرست کے لیے رہنما اُصول واقعۂ ذوالقرنین کی روشنی میں	۲۸۸
۲۱	**قسمِ سادس** (آیت ۹۹/تا ۱۱۰)	۲۹۴

کتاب پڑھنے سے پہلے دعا کرلیں!

اللّٰھم اجعل القرآن ربیع قلوبنا ، ونور صدورنا ، وجلاء أحزاننا ۔ اللّٰھم اجعله شفیعًا لنا ، وشاهدًا لنا لا شاهدًا علینا ۔ اللّٰھم ألبسنا به الحلل ، وأسكنا به الظلل ، واجعلنا به یوم القیامة من الفائزین ، وعند النعماء من الشاکرین ، وعند البلاء من الصابرین ۔ اللّٰھم حبب أبنائنا وطلابنا في تلاوته وحفظه والتمسك به ، واجعله نورًا علی درب حیاتهم ، برحمتك یا أرحم الراحمین ، سبحان ربك رب العزة عما یصفون ، وسلام علی المرسلین ، والحمد للّٰه رب العالمین ۔

آئینہ سورۂ کہف

(۱) اسمائے سورت: (۱) سورۃ الکہف۔ (۲) سورۃُ أصحابِ الکہف۔

وجہ تسمیہ ''سورۂ کہف'': ''کہف'' عربی میں ''غار'' کو کہتے ہیں، اور ''اصحابِ کہف'' کے معنی ہیں ''غاروالے''۔ اس سورت میں چوں کہ غار میں چھپنے والے نوجوانوں کا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے، جنہیں ''اصحابِ کہف'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اسی ''غار'' کے نام پر اس سورت کو ''سورۃ الکہف'' یا ''سورۃُ أصحابِ الکہف'' کہا جاتا ہے۔ یہ **تسمیة الکل باسم الجزء** کے قبیل سے ہے۔

(۲) تعارُف سورۂ کہف:

تعدادِ آیات: قراءِ مکہ ومدینہ کے نزدیک......ایک سو پانچ (۱۰۵)

قراءِ شام کے نزدیک......ایک سو چھ (۱۰۶)

قراءِ کوفہ کے نزدیک......ایک سو دس (۱۱۰)

قراءِ بصرہ کے نزدیک......ایک سو گیارہ (۱۱۱)

تعدادِ رکوعات: بارہ (۱۲)

تعدادِ کلمات: ایک ہزار پانچ سو اُناسی (۱۵۷۹)

تعدادِ حروف: چھ ہزار تین سو چھ (۶۳۰۶)

تعداد اجزائے آیاتِ احکام: تریسٹھ (۶۳)

تعداد مسائلِ مستخرجہ: دوسو ساٹھ (۲۶۰)

تعداد اسبابِ نزول: پانچ (۵) ہیں۔ (آیت: ۲۸، ۸۳، ۱۰۹، ۱۱۰) اور ۲۸ رویں آیت میں دو سببِ نزول ہیں۔

تعداد مسائلِ تصوف وسلوک: انتالیس (۳۹)

ترتیبِ مصحفی: سورۂ اِسراء/ بنی اسرائیل کے بعد، اور سورۂ مریم سے پہلے۔ (۱۸ نمبر)

ترتیبِ نزولی: سورۂ غاشیہ کے بعد اور سورۂ نحل یا سورۂ شوریٰ سے پہلے۔ (۶۹ نمبر)

ترتیب باعتبار حزب یا منزل: چوتھی منزل میں سورۂ کہف شامل ہے۔

مکی ومدنی: (۱) بروایت فرقد: شروع کی ۸ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔

(۲) بروایت ابن عطیہ: مکمل سورۂ کہف بالاتفاق مکی ہے۔ اور یہی قول اَصح (زیادہ صحیح) ہے۔

حذفِ الف: سورۂ کہف میں بطورِ اختصار چند جگہوں سے الف حذف کیا گیا ہے، وہ جگہیں یہ ہیں: **تزٰور عن كهفهم** . (آیت : ۱۷)...... **لا مبدل لكلمٰته** . (آیت : ۲۷)

تذروه الريٰح . (آیت : ۴۵)...... **نفسًا زكية** . (آیت : ۷۴)

(امام ابوعمرو الدانی رحمہ اللہ زاکیۃ پڑھتے ہیں)

لتخذت عليه . (آیت : ۷۷)...... **لكلمٰت ربي** . (آیت : ۱۰۹)

اسم کہف: حضرت مقاتل نے کہف (غار) کا نام ''مانجلوس'' لکھا ہے۔

تعدادِ اصحابِ کہف: صحیح قول کے مطابق اصحابِ کہف کی تعداد سات تھی، اور آٹھواں اُن کا کتا ''قطمیر'' تھا۔

اسمائے اصحابِ کہف: جیسے اسماء اصحابِ کہف میں اختلاف ہے، ایسے ہی اُن کے نطق میں بھی کثیر اختلاف ہے: (۱) مُكَسَلْمِينَا . تَمْلِيْخَا . مَرْطُوْنُسُ . سنونس . سارينوتس . ذو نواس . كعسططيونس .

(۲) یملیخا (یہ کھانا خریدنے گیا تھا) . مکسلمینا . کشفوطط . طبیونس . کشافطیونس . اذرفطیونس . یوانس بوس .

(۳) مکسلمینا . مخشلیشا . تملیخا . مرطونس . کنشطونش . بیرونس . دینموس . (پہلے بادشاہ کا نام دقیانوس، اور دوسرے بادشاہ کا نام تدرسیس، اور کتے کا نام قطمیر یا قطمیروا ہے)۔

فوائد اسمائے اصحابِ کہف: بعض لوگ ان اسماء کو تعویذات میں لکھتے ہیں۔ مختلف مقاصد (مثلاً:

کھیتی کی حفاظت، آسیب سے حفاظت وغیرہ) کے لیے یہ تعویذ مجرب بھی ہے۔

(از قطبِ عالم مولانا گنگوہی رحمہ اللہ): اسماء اصحابِ کہف بعبارتِ ذیل کاغذ پر لکھ کر جس مکان میں مریض یا مریضہ ہو، اس کی دیواروں پر جگہ جگہ چسپاں کر دیئے جاویں، اور بیس کا نقش مندرجہ ذیل ایک کاغذ پر لکھ کر مریض کو دکھایا جاوے، دیکھنے سے گھبرائے گا، اور انکار کرے گا، مگر زبردستی اس کی نظر اس پر ڈلوائی جائے، اور جبراً نقش کو تعویذ بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جاوے۔

اسمائے اصحابِ کہف یہ ہیں:

" إلٰهي بِحُرْمَةِ – يَمْلِيخَا ، مُكْسَلْمِينَا، كَشْفُوطَطُ ، لَمُبُونَسُ ، كَشَافَطْيُونَسُ ، يُوانِسُ بُوسُ ، و كلبُهم قِطمِير – وعلى الله قصدُ السبيل ومنها جائر ولو شآء لهدٰكم أجمعين – وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وبارك وسلم " ۔

(۳) سببِ نزولِ سورۂ کہف: [۱] **بقول مفسرین عظام:** حافظ ابوجعفر ابن جریر طبری حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس سورت کا شانِ نزول یہ نقل کرتے ہیں کہ۔ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن اَبی معیط دو آدمیوں کو مدینہ منورہ کے یہودی علماء کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ تورات وانجیل کے یہودی علماء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوائے نبوت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ چنانچہ وہ یہودی علماء کے پاس گئے، تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ محمد سے تین سوالات کرو، اگر وہ ان کا صحیح جواب دے دیں، تو سمجھ لینا کہ واقعی وہ اللہ کے سچے نبی ہیں، ورنہ اُن کا دعوائے نبوت صحیح نہیں، وہ تین سوالات یہ ہیں:

۱- اُن نو جوانوں کا عجیب وغریب واقعہ بیان کریں، جو کسی زمانے میں شرک سے بچنے کے لیے اپنے شہر سے نکل کر کسی غار میں چھپ گئے تھے۔

۲- اُس شخص کا حال بتائیں جس نے مشرق سے مغرب تک پوری دنیا کا سفر کیا تھا۔

۳- رُوح کی حقیقت کیا ہے؟

چنانچہ یہ دونوں شخص مکہ مکرمہ واپس آئے، اور اپنی برادری کے لوگوں کو ساتھ لے کر انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تین سوالات دریافت کیے، تیسرے سوال کا جواب سورۂ اِسراء (آیت

نمبر:۸۵)میں آ چکا ہے،اور پہلے دوسوالات کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔

[۲] **بقول محدث اسلام ومفکر اسلام رحمہما اللہ:** محدث اسلام حضرت شاہ ولی اللہ اور مفکر اسلام حضرت ابوالحسن علی میاں ندوی رحمہما اللہ کے نزدیک درحقیقت نزولِ آیات کے واقعات واسباب اکثر اتنی اہمیت نہیں رکھتے ہیں،جتنی بہت سے علماءِ مفسرین نے بیان کی ہے،اور بڑی دراز نفسی اور دردسری سے کام لیا ہے،......نزولِ سورۂ کہف کا سببِ اصلی یہودیوں کے سوالات کا جواب ہی نہیں، بلکہ انسانی نفوس کی تہذیب وآراستگی،عقائد باطلہ کا خاتمہ اور اعمالِ فاسدہ کا انسداد ہے، چنانچہ کسی عاقل وبالغ گروہ میں عقائد باطلہ کا وجود بذاتِ خود آیات واحکام کے نزول کا کافی ووافی سبب ہے،اسی طرح اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا وجود آیاتِ احکام کے نزول کا محرک،اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں،نشانیوں اور عبرت انگیز واقعات کا ذکر آیا ہے،اس سے غفلت وبے پرواہی آیاتِ تذکیر کا سبب ہے۔ہاں!البتہ بعض آیات کے جن میں خود کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا اس سے قبل پیش آیا، چنانچہ سامع کا خلجان دُور کرنے کے لیے جو اس اشارہ سے پیدا ہوتا ہے،اس موقع پر واقعہ کی تفصیل ضروری ہے۔

اصحابِ کہف اور مکی مسلمانوں کے حالات میں مناسبت: اصحاب کہف کا یہ قصہ بہت مناسب وقت اور صحیح موقع ومحل میں بیان کیا گیا ہے،اس لیے کہ مکہ کے مسلمان اس وقت اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے،جن کا سامنا قیصر(رومن ایمپائر)کے ظلم وتشدد اور استبداد کے نقطۂ عروج میں اصحابِ کہف کو کرنا پڑا، یہ وقفہ جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے،اس وقفہ سے بہت مشابہ تھا،جس وقفہ میں ترکِ وطن اور غار میں رُوپوشی سے پہلے یہ صاحبِ ایمان نوجوان تھے،اس سلسلے میں قرآنِ مجید کی اس بلیغ ومعجزانہ تصویر سے بڑھ کر کوئی تصویر نہیں ہوسکتی،جن میں مکہ کے مسلمانوں کا پورا نقشہ بیان کردیا گیا ہے۔

(۴) فضیلتِ سورۂ کہف:

(۱)(عن أبي فروۃ) جب سورۂ کہف نازل ہوئی،تو ستر ہزار فرشتے اس کے ہمراہ آئے تھے، آسمان وزمین کے مابین کا حصہ بھر گیا تھا،اور اس کی تلاوت کرنے والے کو بھی اتنا ہی ثواب ملتا

ہے۔جو شخص جمعہ کے دن اس سورہ کی تلاوت کرتا ہے،اُس دوسرے جمعہ تک کے گناہ بلکہ مزید تین دن کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں،اور ایسا نور دیا جاتا ہے،جو آسمان تک پہنچ جاتا ہے،اور وہ فتنۂ دجال سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

(۲)(عن أبي الدرداء رضی اللہ عنہ) جس شخص نے سورۂ کہف کی اول دس آیتیں یاد کرلی، وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگیا۔

(۳) جس شخص نے سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں پڑھ لیں، وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگیا۔

(۴) جس شخص نے جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھ لی،وہ آٹھ دن تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

(۵)(عن أبي سعید الخدری رضی اللہ عنہ) جو شخص جمعہ کی رات میں سورۂ کہف پڑھے،تو اس کے اور کعبۃ اللہ کے درمیان ایک نور قائم ہوجاتا ہے۔

(۶)(عن أنس رضی اللہ عنہ) جو شخص سورۂ کہف کی تلاوت کرتا ہے اُس کے لیے آسمان وزمین کے درمیان کی جگہ نور سے بھردی جاتی ہے،اور قبر کے فتنہ سے اس کی حفاظت ہوتی ہے۔

(۷)(عن أبي الدرداء) جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھے، وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

(۸)(عن سمرۃ بن جندب) جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات یاد کرلے،اس کو فتنۂ دجال کچھ نقصان نہ دے گا۔اور جس نے پوری سورۂ کہف تلاوت کی وہ جنت میں داخل ہوگا۔

(۹)(عن علی رضی اللہ عنہ) جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرے،تو آٹھ دن تک اُس کی ہر فتنہ سے حفاظت ہوگی،اور اگر اس مدت میں دجال کا خروج ہوگیا،تو اس کے فتنہ سے بھی حفاظت ہوگی۔

(۱۰)(عن أبي ہاشم) جو شخص کماحقہٗ سورۂ کہف کی تلاوت کرے،جیسا کہ وہ نازل کی گئی،تو وہ قیامت کے دن اُس کے لیے نور کی شکل میں ہوگی۔

(۱۱) صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے سورۂ کہف کی تلاوت کررہے تھے،گھوڑا پاس میں بندھا ہوا تھا،اچانک گھوڑا بدکنے لگا، انہوں نے

آسمان میں دیکھا کہ ایک بادل اُن کو ڈھانپے ہوئے ہے، اور قریب ہوتا جا رہا ہے، جب اس بات کا ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: " **فإنها السكينة تنزلت عند القرآن ، أو : تنزلت للقرآن** " . (وہ سکینہ تھی جو تلاوتِ قرآن کی برکت سے نازل ہو رہی تھی)۔

مختلف روایات میں جمع وتطبیق: فضیلتِ سورۂ کہف میں وارد روایات دو قسم کی ہیں:

(۱) وہ روایات جن میں تلاوتِ سورۂ کہف کو فتنۂ دجال سے حفاظت کا ذریعہ بتلایا گیا ہے۔ (۲) وہ روایات جن میں سورۂ کہف کو بروز جمعہ پڑھنا باعث نور کہا گیا ہے۔

پہلی قسم کی روایات؛ آیاتِ محفوظہ وآیاتِ مقروءہ کی مقدار میں مختلف ہیں، مثلاً:

دس آیات حفظ کرنا یا پڑھنا ضروری ہے، ...... یا پانچ آیات، ...... یا تین آیات، ...... یا مکمل سورۂ کہف مع رعایتِ صحت وتجوید، ...... یا ابتدائی دس آیات، ...... یا آخری دس آیات، ...... یا مطلقاً کوئی بھی دس آیات، ...... یا ابتدائی چند آیات، ...... یا وسطِ سورہ کی چند آیات۔ ...... ان مختلف روایات میں جمع وتطبیق کی صورت یہ ہے کہ مکمل سورۂ کہف حفظ کر لی جاوے، تاکہ تمام روایات پر عمل ہو جائے۔

دوسری قسم کی روایات دو ہیں، دونوں مرفوع وموقوف ہیں: ایک وہ جس میں جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے پر "**أضاء له من النور ما بينه وبين البيت العتيق**" کی خبر دی گئی ہے۔ اور دوسری روایت جس میں جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے پر "**أضاء له من النور ما بين الجمعتين**" کی خبر ہے۔ تمام اہلِ علم نے ان روایتوں کی تصحیح وتحسین فرمائی ہے، البتہ ابونعمان محمد بن فضل نے "**يوم الجمعة**" کی بجائے "**ليلة الجمعة**" کی قید لگائی ہے۔

نوٹ: سورۂ کہف جمعہ کی رات میں یا جمعہ کے دن پڑھنا مسنون ہے۔

☆ ...... جمعرات کے دن غروبِ شمس کے بعد سے جمعہ کے دن غروبِ شمس تک سورۂ کہف کو پڑھا جا سکتا ہے۔

تلاوتِ سورۂ کہف اور فتنۂ دجال میں معنوی مناسبت:

☆ ...... قرآن مجید میں چھوٹی بڑی (قصارِ مفصل اور طوالِ مفصل) ہر طرح کی سورتیں موجود تھیں، ان سب کو چھوڑ کر سورۂ کہف کا انتخاب کیا گیا، اور یہ خاصیت اس میں رکھی گئی کہ جو اس کو پڑھے یا حفظ کرے، وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس منفرد سورت میں عہد آخر کے اُن تمام فتنوں سے بچاؤ کا سب سے زیادہ سامان ہے، جس کا سب سے بڑا علَم بردار دجّال ہے ہوگا۔ اس میں اس تریاق کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو دجال کے پیدا کردہ زہریلے اثرات کا توڑ کر سکتا ہے، اور اس کے بیمار کو مکمل طور پر شفایاب کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سورت سے پورا تعلق پیدا کر لے، اور اس کے معانی اپنے دل وجان میں اُتار لے (جس کا راستہ اس سورہ کا حفظ اور کثرتِ تلاوت ہے) تو وہ اس عظیم اور قیامت خیز فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ اور اس کے جال میں ہرگز گرفتار نہ ہوگا۔

☆ ...... اس سورہ میں ایسی رہنمائی، واضح اشارے بلکہ ایسی مثالیں اور تصویریں موجود ہیں، جو ہر عہد میں اور ہر جگہ دجال کو نامزد کر سکتی ہیں، اور اس بنیاد سے آگاہ کر سکتی ہیں، جس پر اس فتنہ اور اس کی دعوت وتحریک قائم ہے۔ مزید برآں یہ کہ یہ سورہ ذہن ودماغ کو اس فتنہ کے مقابلہ کے لیے تیار کرتی ہے۔ اس کے خلاف بغاوت پر اُکساتی ہے، اس میں ایک ایسی روح اور اسپرٹ ہے جو دجالیات اور اس کے علم برداروں کے طرزِ فکر اور طریقۂ زندگی کی بڑی وضاحت اور قوت کے ساتھ نفی کرتی ہے، اور اس پر سخت ضرب لگاتی ہے۔

☆ ...... اہلِ ایمان کو چاہیے کہ سورۂ کہف کی تلاوت کا اہتمام کریں، ان آیات میں ایسی قدرتی تاثیر ہے کہ ایسے لوگوں کو دجال کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ اور دجالی فتنے کے ظہور سے پہلے ان آیات کے وِرد کا فائدہ یہ ہوگا کہ دجالی قوتوں کے منفی پروپیگنڈے کا اثر انسان کے دل ودماغ اور ایمان وعمل پر کم سے کم ہوگا۔

☆ ...... ابن خزیمہ کا قول ہے: میں نے ابوالحسن الطنافسی کو کہتے سنا، فرما رہے تھے: میں نے عبد الرحمٰن المحاربی کو کہتے سنا ہے کہ: اس حدیث کو [یعنی جس میں جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کی

ترغیب دی گئی ہے]، ہر استاد کے تربیتی نصاب میں شامل کرنا چاہیے، تاکہ وہ مکتب کے تمام بچوں کو سکھادے۔‘‘

☆......اندازہ کیجیے! اتنے زمانہ پہلے ہمارے اکابر کو فتنوں سے بچنے کا اس قدر اہتمام تھا۔ آج ہم فتنوں کے بھنور میں پھنسے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، اور مزید عظیم فتنے ہمارے سر پر کھڑے ہیں۔ ہمیں تو ان چیزوں کا بہت اہتمام کرنا چاہیے، بالفرض اگر حقیقی عظیم فتنے ہمارے دور میں ظاہر نہ ہوئے تو چھوٹے دجالوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور میڈیا وار سے تو ان آیات کی برکت ہمیں ضرور محفوظ رکھے گی۔

☆......سورۂ کہف کے معانی وحقائق پر غور کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ سورۂ کہف صرف ایک موضوع پر مشتمل ہے، جس کو میں ’’ایمان ومادیت کی کشمکش‘‘ یا ’’غیبی قوت اور عالمِ اسباب‘‘ سے تعبیر کرسکتا ہوں، اس میں جتنے اشارات، حکایات، وواقعات اور مواعظ اور تمثیلیں گزری ہیں، وہ سب انہیں معانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کبھی کھل کر، کبھی درپردہ۔

☆...... یہ صورت دجالی وحماری تہذیب وتمدن کی، -جو سترہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی، پروان چڑھی [یورپی وصلیبی اقوام کی عالمِ اسلام پر فیصلہ کن یلغار کا آغاز] اور بیسویں صدی میں پک کر تیار ہوئی- نیز اس کے نقطۂ عروج اور اختتام اور اس کے رہبرِ اعظم کی- جس کو زبانِ نبوت میں ’’دجال‘‘ کہا گیا ہے- سچی اور بولتی ہوئی تصویر انسانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

☆......عہد حاضر کی مادی تہذیب کا سب سے بڑا حربہ ملمع سازی اور فریب کاری ہے، جو دجال اور دجالی کارندوں کا ہتھیار ہے۔ تہذیب وتمدن کی تشکیل اور انسانیت کی رہنمائی میں عیسائیت ویہودیت کا ملتا جلتا (ملمع سازی وفریب کاری کا گھناؤنا) کردار آج پوری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، (اس سورہ کو پڑھنے سے ہم اس ملمع سازی وفریب کاری سے بچ سکتے ہیں)۔

(۵) ماقبل سورت سے ربط:

(۱) گزشتہ سورت (بنی اسرائیل/اسراء) کا آغاز تسبیح سے ہوا، اور اختتام تحمید پر ہوا۔ اور قرآن وحدیث میں تسبیح وتحمید ایک دوسرے کے ساتھ مقرون ہیں ﴿فسبح بحمد ربک﴾ اور

﴿سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم﴾، اس لیے سورت کا آغاز تحمید سے ہوا، جو گزشتہ سورت کی ابتدا اور آغاز کے ساتھ مناسب ہے، اور گزشتہ سورت کے خاتمہ کا عین ہے۔

(۲) کفارِ مکہ نے علمائے یہود کے کہنے پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوالات کیے تھے، اُن میں سے ایک سوال (جو روح سے متعلق تھا) کا جواب سورۂ اِسراء میں بیان کیا گیا، اب اس سورت میں دیگر دو سوالوں کا جواب مذکور ہے۔

(۳) روح سے متعلق سوال کے جواب کے بعد فرمایا: ﴿وما اوتیتم من العلم الا قلیلا﴾ کہ تم کو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں دوسرے سوال کے جواب کے بعد، یعنی اصحابِ کہف کے قصہ کے بعد حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا قصہ ذکر فرمایا، تاکہ معلوم ہوجائے کہ بندہ کو جو علم دیا گیا ہے وہ قلیل ہے، گویا قصۂ موسیٰ وخضر ﴿وما اوتیتم الخ﴾ کی ایک دلیل ہے۔

(۴) پہلی سورت میں مقامِ نبوت کے علو اور عروج کا، اور اس کی عزت ورفعت کا اور معجزاتِ نبوت کا، اور نبی کی آیاتِ بینات کا بیان تھا، اور اس سورت میں مقامِ ولایت کا، اور اولیاء اللہ کی کرامتوں کا اور عُزلت، گوشہ نشینی، فقیری اور درویشی کا بیان ہے۔

(۵) گزشتہ سورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکینِ مکہ کی ایذا رسانی کے وقت یہ دعا بتلائی گئی: ﴿وقل رب ادخلني مدخل صدق واخرجني مخرج صدق﴾ چناں چہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ مکرمہ سے نکلنا خروجِ صدق ہوا، اور مدینہ میں داخل ہونا دخولِ صدق ہوا، اسی طرح اصحابِ کہف کا اپنے شہر سے نکلنا جہاں کفر وشرک کا فتنہ بپا تھا، یہ خروجِ صدق ہوا، پھر شہر سے نکل کر کہف (غار) میں عزلت گزیں وگوشہ نشیں ہوجانا یہ دخولِ صدق ہوا۔

(۶) سورۂ اسراء میں یہود کو بطورِ تنبیہ چیلنج کیا گیا تھا: ﴿وما اوتیتم من العلم الا قلیلا﴾ (الآیۃ/۸۵) تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اور سورۂ کہف میں علم کے سلسلے میں قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام کے ذریعے دلیل قائم کی گئی: ﴿فوجدا عبدًا من عبادنا اٰتیناه رحمة من عندنا وعلّمناه من لّدنّا علما﴾ . (الآیۃ/۶۵)

(۷) سورۂ اسراء کی آیت/۱۰۴:﴿فاذا جاء وعد الأخرة جئنا بكم لفيفًا﴾ میں وعدۂ آخرت کا ذکر تھا، اس کی تفصیل وتشریح سورۂ کہف کی آیت/ ۹۸ تا۱۰۱:﴿فاذا جاء وعد ربي جعله دكّآء وكان وعد ربي حقًّاO وتركنا بعضهم يومئذ يموج في بعض ونفخ في الصور فجمعناهم جمعًاO وعرضنا جهنم يومئذ للكٰفرين عرضاO الذين كانت اعينهم غطاء عن ذكري وكانوا لا يستطيعون سمعًاO﴾ میں مذکور ہے۔

سوال: تین سوالات ایک ساتھ کیے گئے، تو تینوں کے جوابات ایک ہی سورت میں ذکر کرنے کے بجائے دوسورتوں میں کیوں؟

جواب: (۱) پہلا سوال جو روح سے متعلق تھا، اس کی وضاحت وتفصیل بیان نہیں کی گئی، بلکہ مختصراً جواب دیا گیا، اور بقیہ دوسوالوں کا جواب مفصل وموضح دیا گیا، اس لیے ایک سوال کا جواب سورۂ بنی اسرائیل میں، اور بقیہ دو کے جواب سورۂ کہف میں ہیں۔

(۲) روح سے متعلق سوال کا جواب سورۂ اسراء میں ہے، کہ ''روح'' اور ''اسراء/معراج'' میں مناسبت ومشارکت ہے، جیسے معراج واسراء کی حقیقت کا ادراک عقولِ انسانی نہیں کرسکتیں، ایسے ہی روح کی حقیقت کا ادراک کرنے سے بھی عقلیں قاصر ہیں۔

(۳) معراج واسراء میں بلندی کی طرف عُروج ہوتا ہے، اور روح میں اُس بلندی سے ہُبوط ہوتا ہے۔

(٦) **ابتدا وانتہائے سورہ میں ربط:** ابتدائے سورت واختتامِ سورت میں تصحیحِ عقیدہ کا بیان ہے (درصورتِ اعلانِ وحدت، انکارِ شرک، اِثباتِ وحی، واِثباتِ رسالت)۔ یعنی سورت کا آغاز؛ توحید، رسالت اور تذکیرِ آخرت سے ہوا تھا، اور سورت کو انہی تین مضامین پر ختم بھی کیا گیا۔

(۷) **آیاتِ سورۂ کہف کی تقسیمِ وضعی/موضوعی:**

تقسیمِ وضعی یا موضوعی کے اعتبار سے سورۂ کہف ایک مقدمہ اور چھ اقسام پر مشتمل ہے۔

مقدمہ: ۱-تا-۸/کل ۸/آیتوں میں مقدمہ، اور مقدمہ میں ابتدا بالحمد، وصفِ قرآن، اِنزالِ قرآن، خاص بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر شفقت وعنایتِ باری تعالیٰ، زینتِ حیاتِ دنیوی کی حکمت اور اس کا انجام بیان کیا گیا۔

قسمِ اول: ۹-تا-۳۱/کل ۲۳/آیتوں میں فتنۂ دین وایمان؛ یعنی قصۂ اصحابِ کہف، اس قصہ میں اعجاز ودلیلِ قدرتِ خداوندی، اور دعوتی وتربیتی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

قسمِ ثانی: ۳۲-تا-۴۹/کل ۱۸/آیتوں میں فتنۂ مال ودولت واولاد کی وضاحت؛ یعنی دو شخصوں کی مثال، جن میں سے ایک شخص کے ساتھ زینتِ حیاتِ دنیوی کا اِغوا ودھوکہ، اور انجامِ بد؛ عقوبت وعذاب کا تذکرہ۔ اور دوسرے شخص کے ساتھ عدمِ رغبتِ حیاتِ دنیوی، زہد وقناعت؛ دنیوی چمک دمک سے اعراض، اور حسنِ انجام؛ نصرتِ خداوندی کا تذکرہ ہے۔ اور اخیر میں دنیوی زندگی اور اس کی رونق؛ مال ودولت اور اولاد، اہل وعیال کے انجام کا ذکر ہے۔

قسمِ ثالث: ۵۰-تا-۵۹/کل ۱۰/آیتوں میں فتنۂ ابلیس لعین؛ یعنی اِغوائے شیطانی، شیطان سے عدمِ موالات کا تذکرہ، اور اس کا انجام مذکور ہے کہ شیطان جس کا ولی ہوتا ہے اسے آیاتِ قرآن، اطاعتِ خداوندی سے اعراض پر آمادہ کرتا ہے، گناہوں کی دلدل میں پھنساتا ہے، حتی کہ اُسے جہنم کے گڑھے میں ڈھکیل کر ہی دَم لیتا ہے۔

قسمِ رابع: ۶۰-تا-۸۲/کل ۲۳/آیتوں میں فتنۂ علم؛ یعنی قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام کا تذکرہ، اور اس کے ضمن میں رزقِ معنوی من جانب اللہ، اسی طرح تادیب، توجیہ، عبرت ونصیحت، تحصیلِ علوم میں تربیتی پہلو، اور دنیوی زندگی کے تفصیلی قضیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

قسمِ خامس: ۸۳-تا-۹۸/کل ۱۶/آیتوں میں فتنۂ مُلک وسلطنت؛ یعنی قصۂ ذوالقرنین، اور اس کے ضمن میں رزقِ مادّی ومعنوی من جانب اللہ، اسی طرح تادیب، توجیہ، عبرت ونصیحت کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

قسمِ سادس: ۹۹-تا-۱۱۰/......کل ۱۲/آیتوں میں استہزائے کافرین مع رُسل وآیاتِ خداوندی، اس استہزا پر عقابِ خداوندی، اس کے بالمقابل مؤمنین صالحین کی فضیلت اور بروزِ قیامت ان کے علوِ درجات کا تذکرہ، اور جناتِ فردوس میں داخلے کا وعدہ ہے۔

(۸) **سورۂ کہف کے مشہور موضوعات:**

ترسیخ وتصحیحِ اُصولِ عقیدہ، ارکانِ ایمان، معالجۂ شرک، قصصِ قرآنی بغرضِ تائیدِ مؤمنین۔

سورۂ کہف کے چار مشہور قصے: سورۂ کہف چار قصوں پر مشتمل ہے، جو اس کے سنگِ میل یا ستون کہے جاسکتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ وہ محور ہیں، جن کے گرد اس کی ساری تعلیم وموعظت اور دانش وحکمت گردش کررہی ہے۔ وہ چار قصے یہ ہیں:

(۱) اصحابِ کہف کا قصہ۔ (آیت: ۹-تا-۲۶)

(۲) صاحب الجنتین (دو باغ والے) کا قصہ۔ (آیت: ۳۲-تا۴۴)

(۳) حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ۔ (آیت: ۶۰-تا-۸۲)

(۴) ذوالقرنین کا قصہ۔ (آیت: ۸۳-تا-۹۷)

یہ قصے اپنے اسلوبِ بیان اور سیاق وسباق کے لحاظ سے جدا ہیں، مقصد اور رُوح کے لحاظ سے ایک ہیں۔ اور اس روح نے ان کو معنوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور ایک لڑی میں منسلک کردیا ہے۔

سورۂ کہف ایمان ومادیت کی کشمکش کی کہانی: سورۂ کہف دو نظریات، دو عقیدوں اور دو قسم کی نفسیات کی کشمکش کی کہانی ہے، ایک مادیت اور مادی چیزوں پر عقیدہ۔ دوسرے ایمان بالغیب اور ایمان باللہ، اس میں ان عقائد، اعمال واخلاق اور نتائج وآثار کی تشریح کی گئی ہے، جو ان دونوں قسم کی نفسیات یا نظریات کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اس اول الذکر نظریہ کو اختیار کرنے کے خلاف آگاہی دی گئی ہے، جو صرف مادہ اور اس کے مظاہر پر یقین رکھتا ہے، اور خدا اور غیبی قوتوں کا منکر ہے۔

(۹) ضرب الأمثال: سورۂ کہف میں کل تین امثلۂ واقعیہ بیان کی گئیں، اور ان میں یہ بتلایا گیا کہ اِحقاقِ حق کے لیے کثرتِ مال، کثرتِ جاہ وسلطنت کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس کے بغیر بھی حق، حق ہی ہوتا ہے۔

مثالِ اول: ﴿واضرب لهم مثلا رجلين جعلنا لأحدهما جنتين من أعناب وحففناهما بنخل وجعلنا بينهما زرعا﴾. (الآية: ۳۲ - ۴۴)

مثالِ ثانی: ﴿واضرب لهم مثل الحياة الدنيا كماء أنزلناه من السماء ماء

فاختلط به نبات الارض فأصبح هشيما تذروه الرياح وكان الله على كل شيء مقتدرا﴾. (الآية: ۴۵)

مثالِ ثالث: ﴿وإذ قلنا للملائكة اسجدوا لأدم فسجدوا إلا ابليس كان من الجن ففسق عن أمر ربه أفتتخذونه وذريته من دوني وهم لكم عدو بئس للظالمين بدلا﴾. (الآية: ۴۹)

(۱۰) بعض مشاہد قیامت کا بیان: نفخِ صور، جمعِ ناس، حشر ونشر، عرض جہنم علی الکفار، تسییرِ جبال، وضعِ کتاب (اعمال نامہ) واحوالِ مجرمین، انجام کافرین وخاسرین، حبطِ اعمالِ کافرین، جنات الفردوس برائے مؤمنین وصالحین۔

(۱۱) سورۂ کہف کے اِجمالی اَغراض ومقاصد: وصفِ کتابِ کریم،...... مخلوقاتِ ارضی برائے زینت وابتلائے انسان،...... ملکوتِ سماوات وارض میں غور وفکر از قصۂ اصحابِ کہف، ...... وصفِ کہف واصحابِ کہف، ...... مدتِ لبثِ اصحابِ کہف در کہف،...... عددِ اصحابِ کہف،...... اَمرِ جلوسِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع فقرائے مؤمنین،...... ذکرِ ملاقاتِ وبال ونکال برائے کفار بروزِ قیامت،...... ضربِ امثال برائے توضیحِ حالِ فقرائے مؤمنین واَغنیائے مشرکین، ...... ضربِ مثل برائے حیاتِ دنیا،...... عرضِ صُحف ونامۂ اَعمال در آخرت وخوفِ مجرمین،...... عداوتِ ابلیس مع آدم وبنو آدم، قصصِ موسیٰ وخضر علیہما السلام،...... قصص ذو القرنین، ...... سدّ یاجوج وماجوج، ...... کیفیت وصنعتِ سد ذو القرنین، ...... وصفِ اعمالِ مشرکین، ...... ذکرِ انعاماتِ ربانی برائے مؤمنین در جنت،...... اِخبار در لامتناہی علوم الٰہی۔

(۱۲) دروسِ مستفادہ از سورۂ کہف: احساسِ نعمت بر اِنزالِ قرآن ،...... اسلوبِ قرآن در اِنذار وتبشیر ،...... حکمتِ تزیینِ حیاتِ دنیا؛ برائے اختبار وآزمائشِ انسان،...... زہد در دنیا واجتنابِ خطواتِ شیطان،...... آداب مع اللہ، مع اب، مع انبیاء ومع اولیاء،...... ولایت کفار ومؤمنین،...... اَول فتنۂ بنی اسرائیل از نساء،...... حرکتِ اشیاء وقرار اشیاء در قبضۂ خداوندی،...... رضا بر قضاءِ الٰہی،...... احتراز واجتناب از قنوط ویأس (نا اُمیدی ونا کامی)،...... اعتماد ویقین بر

خدا......شکر برتوفیقِ خداوندی......کلمۂ تحصین برائے حفاظتِ نعمتِ باری تعالیٰ: ﴿ما شاء الله لا قوة إلا بالله﴾، وغیرہ۔

(۱۳) **محاورِ اساسیہ در سورۂ کہف:** عصمتِ اَمواجِ فتنِ متلاطمہ۔ فتنۂ ایمان (ابتلا وآزمائشِ مؤمنین)۔ فتنۂ سلطان۔ فتنۂ شباب (اصحابِ کہف)۔ فتنۂ اہل وعشیرہ (خاندان)۔ فتنۂ مال۔ فتنۂ اولاد۔ فتنۂ اِبلیس لعین۔ فتنۂ علم (قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام)۔ فتنۂ یاجوج وماجوج۔ فتنۂ اَہواء (خواہشات)۔

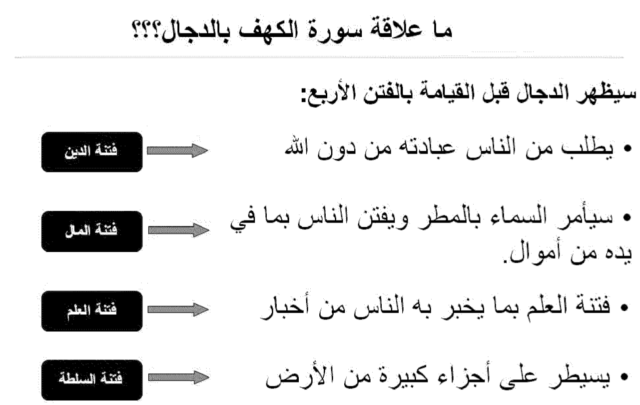

Oبسم اللہ الرحمٰن الرحیمO

مقدمہ (آیت ۱ تا ۸)

حمد باری تعالیٰ......عظمتِ قرآنِ کریم......نزولِ قرآن کے مقاصد
مجرمین کو آگاہی اور مؤمنین صالحین کو بشارت

آیت: ۱، ۲، ۳، ٤، ٥:

﴿الحمد لله الذي انزل على عبده الكتٰب ولم يجعل له عوجا O قيما لينذر باسًا شديدا من لدنه ويبشر المؤمنين الذين يعملون الصّٰلحت ان لهم اجرا حسنا O ماكثين فيه ابدا O وينذر الذين قالوا اتخذ الله ولدًا O ما لهم به من علم ولا لآبائهم كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون إلا كذبا O﴾ .

ربط: ﴿الحمد لله الذي أنزل﴾ اس آیتِ کریمہ میں قرآن کریم کی عظمتِ شان اور اس کی صفات بیان کی گئیں:

(۱) پہلی صفت "لم يجعل له عوجا" یعنی کلام فصیح وبلیغ اور اس کی تعلیم انقلابی ہے، اور یہ افراط وتفریط سے پاک ہے۔

(۲) دوسری صفت "قیما" یعنی مستقیم ہے، جو کہ صراطِ مستقیم کی تشریح وتوضیح بیان کرتی ہے، اور بقول بعض مفسرین: قیم کا معنی یہ ہے کہ اس میں کوئی تناقض وتعارض نہیں۔

﴿لينذر بأسًا شديدًا من لدنه﴾ میں نزولِ کتاب کا پہلا مقصد بیان کیا جارہا ہے، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کافرین ومنکرین کو عذابِ الٰہی سے ڈرائیں، اور مؤمنوں کو دنیا وآخرت کی بشارت سنائیں۔

﴿ويبشر المؤمنين﴾ میں دوسرا مقصد ہے کہ مؤمنین جو اعمالِ صالحہ کرتے ہیں، قرآن پر عمل کرتے ہیں انہیں جنت کی خوش خبری دیجیے۔

﴿ما لهم به من علم﴾ میں نزولِ کتاب کا تیسرا مقصد: خاص کافروں کی تخویف ہے، جو اللہ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ان مخصوص لوگوں میں اول قوم یہود اور دوسری قوم نصاریٰ ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وقالت اليهود عزير ابن الله وقالت النصارى المسيح ابن الله ذلك قولهم بافواههم﴾۔

☆......مفردات لغویه......☆

الحمدُ : هو الوصف بالجميل ثابت للّٰه تعالى .

أنزل : أنزل ينزل إنزالا، از بابِ افعال، فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب، اس (اللہ) نے کتاب نازل فرمائی۔

عوجًا : مصدر از باب سمع يسمع .کجی، ٹیڑھا پن۔

قيّمًا : مصدر قيامٌ سے صفتِ مشبہ، مستعمل از باب نصر ینصر۔

"قیما" حال ہے "الکتاب" سے، یا فعل محذوف کا مفعول ثانی ہے: أي جعله قيما۔

" قيّم " کے دو معنی ہیں: (۱) بمعنی "مستقیم": درست۔ٹھیک۔وہ جس میں کوئی ادنیٰ کجی اور میلان کسی جانب نہ ہو۔جیسے: " ذلک دين القيمة "یہی طریقہ درست مضامین کا بتلایا گیا ہے۔(۲) بمعنی "مُقوِّم": نگراں۔محافظ۔جس کا مفہوم ہوگا کہ جیسے قرآن کریم اپنی ذات میں کامل ومکمل ہر قسم کی کجی، افراط وتفریط سے پاک ہے، اسی طرح دوسروں کو بھی استقامت پر رکھنے والا اور مصالحِ عباد کی حفاظت کرنے والا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآنِ کریم خود بھی کامل ومکمل ہے، اور مخلوقِ خدا کو بھی کامل ومکمل بنانے والا ہے۔

عِوجًا قيّمًا : امام حفص رحمہ اللہ نے "عوجا" پر سکتہ کیا ہے، یعنی سانس توڑے بغیر وقف کیا ہے، تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ "قیما" کا تعلق "عوجا" سے نہیں، بلکہ "الکتاب" سے ہے، یا یہ نیا جملہ ہے۔

بأسًا : معنی عذابِ عاجل یا آجل، اس کی جمع " أبْؤُسٌ " ہے۔

شديدًا : سخت، شدۃٌ مصدر سے فعیلٌ کے وزن پر صفتِ مشبہ ہے، از باب نصر ینصر۔ منصوب بوجہ مفعول بہ۔

بأسًا شديدًا : موصوف صفت ہوکر لینذر کا مفعول بہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔اور لینذر کا فاعل " العبد" ہے، أي: لينذر العبد۔

يُبشِّرَ : تاکہ وہ خوش خبری دے۔از باب تفعیل، فعل مضارع معروف، صیغہ واحد مذکر غائب۔منصوب بوجہ لام تعلیل۔

امام حمزہ اور امام کسائی رحمہما اللہ " يبشر "کو تخفیف کے ساتھ بابِ افعال سے پڑھتے ہیں، اور باقون تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھتے ہیں۔

ماكثين : ٹھہرنے والے۔مکثٌ مصدر سے اسم فاعل جمع مذکر سالم، واحد ماکثٌ ہے، از باب نصر ینصر۔بحالتِ نصب بر بنائے حال۔

ويُنذِرَ : منصوب ہے پہلے "لِيُنذرَ "پر عطف ہونے کی وجہ سے۔

كبرت كلمةً : بڑی بات، بڑی بھاری بات۔ كبرت از باب کرم یکرم، فعل ماضی معروف، صیغہ واحد مؤنث غائب، معنی بڑا ہونا۔

كلمة : اس کی جمع کلمات ہے، معنی بات۔ کبرت کا فاعل محذوف ہے: أي كبرت مقالتهم۔" كلمةً " منصوب بر بنائے تمیز۔(ضمیر فاعل مستتر ہے، تمیز اس کی تفسیر کے لیے ہے، دنیائے نحو میں اسے "فاعل مفسر بالتمیز کہا جاتا ہے)۔

أفواههم : خلافِ قیاس جمع ہے " فمٌ "کی، بمعنی منہ۔

تخرج من أفواههم : یہ جملہ حالتِ نصبی میں ہے کلمةً کی صفت ہونے کی وجہ سے، کلمةً منصوب ہے تمیز ہونے کی وجہ سے۔

ان يقولون : میں اِن نافیہ ہے۔

كذبًا: منصوب ہے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے۔

إلا كذبا: مصدر محذوف" قولا " کی صفت ہے۔

☆......اعراب......☆

الحمد لله الذي انزل على عبده الكتٰب ولم يجعل له عوجا .

الحمد مبتدا مرفوع۔ لله جار مجرور متعلق بخبر مبتدا۔ أنزل فعل ماضی، ھو ضمیر اس کا فاعل، علی عبدہ جار مجرور مل کر متعلق بأنزل۔ ھا ضمیر مضاف الیہ، الکتاب مفعول بہ منصوب، واو عاطفہ، لم حرفِ نفی، یجعل مضارع مجزوم، فاعل ھو ضمیر، لام حرفِ جر، ھا ضمیر محل جر میں متعلق ہے محذوف مفعولِ ثانی کے۔ عوجا مفعول بہ اول منصوب ہے۔

ماكثين فيه أبدًا . ماکثین حال منصوب لھم کی ھم ضمیر سے۔ في حرف جر، ھا ضمیر محل جر میں ہے متعلق ماکثین سے۔ أبدًا ظرفِ زمان منصوب متعلق ماکثین سے۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿**عبده**﴾ میں "ہ" ضمیر کا مرجع "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

☆......﴿**لم يجعل له**﴾ میں " له " کی ضمیر میں دو احتمال ہیں:

(۱) " له " میں "ہ" ضمیر کا مرجع "عبدہ" ہے۔ یعنی بندہ کی سیرت و کردار میں کسی طرح کی کوئی کجی نہیں رکھی۔

(۲) یا "له" أي؛ للكتٰب۔ یعنی کتاب میں معنی ومفہوم کی کوئی کجی نہیں رکھی۔

☆......﴿**لينذر .. يبشر**﴾ دونوں کے فاعل میں دو احتمال ہیں:

(۱) لينذر : أي ؛ لينذر الكتاب (القرآن) . يبشر : أي ؛ يبشر الكتاب (القرآن) . من لدنه : أي ؛ من لدن الله . یعنی سیدھی کتاب لوگوں کو خدا کی طرف سے آنے والی سخت عذاب سے آگاہ کردے۔

(۲) لينذر أي ؛ لينذر عبد الله . يبشر أي ؛ يبشر عبد الله . یعنی تاکہ اللہ کا راست باز بندہ لوگوں کو خدا کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے آگاہ کردے۔

☆......﴿**ماكثين فيه ابدا**﴾ میں فیہ سے مراد: في الأجر۔

☆......﴿**ما لهم به من علم**﴾ " به " کی ضمیر میں چار احتمال ہیں:

(۱) " به " میں "ہ" ضمیر کا مرجع "اللہ" ہے۔ یعنی اللہ کے تعلق سے ان کو اور ان کے باپ دادا کو کچھ علم نہیں (کہ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا)۔

(۲) " به " أي ؛ بالولد . قولِ مفتریٰ مراد ہے؛ یعنی بیٹے کے تعلق سے ان کو اور ان کے باپ دادا کو کچھ علم نہیں، بھلا اللہ کے بھی کوئی بیٹا ہوسکتا ہے۔

(۳) " به " أي؛ بالقول . یعنی وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بارے میں وہ اور ان کے باپ دادا کچھ نہیں جانتے، وہ کیسی نادانی کی بات کہہ رہے ہیں۔

(۴) " به " أي ؛ بالاتخاذ . یعنی وہ اور ان کے باپ دادا بالکل نہیں جانتے۔ الخ

☆......﴿**كبرت**﴾ أي؛ كبرت المقالة. ان کے لیے یہ بڑی خوف ناک بات ہے، جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿**عوجا قيما**﴾ میں تکریر برائے تاکید ہے۔

☆......﴿**انزل على عبده الكتٰب ولم يجعل له عوجاO قيما**﴾ اس آیت میں تقدیر کلام یوں ہے: ﴿**انزل على عبده الكتٰب قيما ولم يجعل له عوجا**﴾ یہاں مقدم کو مؤخر کرنے میں کلام کی سلاست وروانی میں اضافہ ہوا۔

☆......﴿**يبشر**﴾ ﴿**ينذر**﴾: ان دونوں میں صنعتِ طباقِ جلی، فعلی، وایجابی ہے۔

طباقِ جلی: کلامِ نثر یا کلامِ شعر میں دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کردینا، جیسے: ﴿**هو الأول والآخر والظاهر والباطن**﴾۔

طباقِ فعلی: دو فعلوں کے درمیان طباق ہو، جیسے: ﴿**لينذر باسًا شديدا من لدنه ويبشر المؤمنين**﴾ .

طباقِ ایجابی: جس میں دو معنوں کے درمیان تضاد ہو، اور دونوں مثبت یا دونوں ہی منفی ہوں؛ یعنی ایجاب وسلب کا اختلاف نہ ہو۔ جیسے: **ینذر** اور **یبشر** دونوں کے معنی متضاد ہیں، لیکن دونوں ہی صیغے مثبت ہیں۔

☆......﴿**لینذر بأسًا شدیدًا**﴾ اس میں اِطناب بذکر الخاص بعد العام۔ اور حذفِ بدیع بھی ہے؛ کہ مفعولِ اول کو حذف کیا گیا ہے، پورا جملہ یوں تھا: "**لینذر الکافرین بأسًا**"۔

اِطناب: کسی مفہوم کو زائد عبارت میں ادا کرنا بشرطیکہ وہ زیادتی فائدہ کے لیے ہو، جیسے: **خلقت بیدي**۔

☆......﴿**ما لهم به من علم**﴾: **علم** بمعنی سندِ نقلی اور دلیلِ عقلی کے معنی میں ہے۔ **من علم** میں **من** زائد، تاکیدِ نفی کے لیے ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......قرآنِ کریم کی شکل میں اتنی عظیم الشان نعمت؛ قانونِ الٰہی کی شکل میں مسلمانوں کو بواسطہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہوئی، یہ مسلمانوں کے لیے مقامِ فخر وشکر ہے۔ اور صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے یہ قانونِ الٰہی ہدایت ورحمت ہے۔

☆......ہر مسلمان کو اس قانونِ الٰہی کو پڑھنے، سمجھنے، اور اس میں غور وفکر اور تدبر کرکے، دیگر اقوام میں بھی اس کی دعوت عام کرنی چاہیے، کہ اس کی عبارت انتہائی سلیس وفصیح، اسلوبِ بیان نہایت مؤثر اور شگفتہ اور تعلیم نہایت متوسط ومعتدل ہے، جو ہر زمانہ اور ہر مزاج کے مناسب اور عقلِ سلیم کے مطابق ہے۔ وہ بالکل سیدھی ہے، کوئی کتنا ہی غور کرے، بال برابر کجی نہیں پائے گا، اور یہ کتاب لوگوں کو راہِ راست پر لانے والی ہے، وہ بندوں کی تمام ضروریات اور معاد ومعاش کے مصالح کی ضامن ہے، اور مخلوقِ خدا کو کامل ومکمل بنانے والی ہے۔

☆......داعی کو چاہیے کہ راہِ دعوت الی اللہ میں ترغیب وترہیب، اور انذار وتبشیر دونوں طریقوں سے کام لے، صرف ایک سے کام نہ چلائے، ورنہ دعوت مؤثر نہ ہوگی۔ مثلاً: اگر

عذاب کا تذکرہ کرے، تو ساتھ ہی نعمتوں کا ذکر بھی کرے۔ گناہوں پر مؤاخذہ کا تذکرہ کرے، تو خدائی عفو ودرگزر کا بیان بھی کرے، تاکہ کوئی شخص اللہ پاک کی رحمت سے مایوس نہ ہوجائے۔ جیسا کہ خود قرآن میں ترغیب وترہیب کی مثالیں موجود ہیں: ﴿**نبّئ عبادي أني انا الغفور الرحیمO وأن عذابي هو العذاب الالیم**﴾ (سورة الحجر: ۴۹، ۵۰)

﴿**غافر الذنب وقابل التوب شدید العقاب**﴾. (سورة غافر: ۳)

﴿**اعلموا ان اللّٰه شدید العقاب وأن اللّٰه غفور رحیم**﴾. (سورة المائدة: ۹۷)

☆......گروہِ کافرین کی طرح، غیر اقوام کی؛ غلط کاموں میں، اندھی عقیدت اور اس میں غلو کے پیرو نہ بنیں، اور باطل ولغو عقیدوں سے اپنے آپ کو باز رکھیں۔

☆......﴿**کلمة تخرج من افواههم**﴾ عیسائی مذہب کا بنیادی عقیدہ؛ یعنی خدا کے متعلق ولدیت کا عقیدہ جس میں ایک کو تین اور تین کو ایک تسلیم کرنے پر آدمی مجبور ہے، (عیسائیوں کے مطابق) یہی عیسائی مذہب کی صداقت کی دلیل ہے۔ نہ عقل ہی میں اس کے ماننے کی گنجائش ہے، اور نہ انسانی فطرت ہی اس کو قبول کرسکتی ہے۔ بہرحال اسی کا نتیجہ یہ ہوا، اور اس کے سوا دوسرا نتیجہ اس کا اور ہو ہی کیا سکتا تھا کہ ایسا مسئلہ جو دماغ کے لیے بھی ٹھیس اور دل کے لیے بھی صرف ٹھوکر ہے، وہ ماننے والوں کے افواہ یا ذہنی دائرے ہی میں گھومتا رہا۔ افواہ سے آگے دل ہو یا دماغ کسی سے کسی قسم کا کوئی رشتہ یہ عقیدہ قائم نہ کرسکا۔

☆......﴿**الحمد للّٰه الذي انزل علی عبده الکتٰب ولم یجعل له عوجا**﴾ اگر کسی کو نزلہ کی وجہ سے چھینکیں بکثرت آتی ہوں، تو گیارہ (۱۱) بار یہ آیت کسی کھانے کی چیز پر پڑھ کر مریض کو کھلایا جائے۔

☆......سوالات......☆

سوال: حمدلہ سے شروع ہونے والی سورتیں قرآن میں کتنی ہیں اور کون کونسی؟

جواب: کل پانچ سورتیں ہیں، جن کا آغاز حمدلہ سے ہوتا ہے: (۱) سورۂ فاتحہ [۱/

نمبر]۔(۲) سورۂ انعام[۶رنمبر]۔(۳) سورۂ کہف[۱۸رنمبر]۔(۴) سورۂ سبا[۳۴ر نمبر]۔(۵) سورۂ فاطر[۳۵رنمبر]۔

سوال: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ازل سے ابد تک وصفِ محمودیت کے ساتھ متصف ہے، پھر خود اپنی تعریف کا کیا مطلب؟

جواب: (۱) کتابِ عزیز قرآن مجید کی اہمیت وعظمت بتانا، اور لوگوں کو تعلیم دینا مقصد ہے، کہ قرآن پاک پوری انسانیت کے لیے ایک عظیم نعمت ہے، اور ایسی عظیم نعمت اُتارنے والی ذات بھی عظیم ولائقِ تعریف ہے۔

(۲) بعض علماء نے ﴿الحمد للّٰه﴾ سے پہلے محذوف ﴿قولوا﴾ مقدر مانا ہے، معنی ہے: ﴿قولوا الحمد للّٰه ؛ أي احمدوا ربكم على إنزاله الكتاب هاديًا لكم ، قائمًا بأموركم ، دالا على كل ما تحتاجون إليه ، لا اختلاف بين آياته ولا تعارض بينها﴾ .

سوال: ﴿لم يجعل له عوجا﴾ کے بعد ﴿قيما﴾ بمعنی مستقیم لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے کہ جس میں کجی نہیں ہوگی، وہ یقیناً سیدھا اور مستقیم ہوگا، تو پھر قیما لانے کا کیا فائدہ؟

جواب: (۱) بقول امام فرا: ﴿قيما﴾ سے مراد" قائما على الكتب السماوية كلها " ہے۔ یعنی سابقہ تمام کتبِ سماویہ کے مضامین پر مشتمل اور ان کی تصدیق کرنے والی ہے، نیز ان کے بعض احکامات کو منسوخ کرنے والی ہے، اس صورت میں کوئی تکرار نہ ہوگا۔

(۲) مشہور قول کے مطابق اس کو تاکید پر محمول کیا جائے گا۔

سوال: ﴿أنزل على عبده﴾ میں ''عبد'' سے کون مراد ہے؟

جواب: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔

سوال: ﴿إنذار﴾ کا کیا معنی؟

جواب: الإنذار : الإعلام المقترن بتخويف وتهديد . (ایسا سرکاری اعلان یا

الٹی میٹم جو تخویف وتہدید کے ساتھ ہو)۔

سوال: إنذار وإعلام میں کیا فرق ہے؟

جواب: (۱) اِنذار کا معنی ہے: ''انجام کی اطلاع، آگاہی، تنبیہ، الارم، آخری وارننگ'' اور اعلام کا معنی ہے: ''سرکاری اعلان، الٹی میٹم، دھمکی، نوٹس، اناونسمنٹ''۔

(۲) إنذار وإعلام میں عموم خصوص کی نسبت ہے، ہر اِنذار اِعلام ہوتا ہے، لیکن ہر اِعلام اِنذار نہیں ہوتا۔

(۳) اِنذار متعدی بہ دو مفعول ہوتا ہے، اعلام نہیں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول میں: ﴿وأنذرتكم نارًا تلظّى﴾ .(الليل: ۱۴) اور ﴿إنا أنذرناكم عذابًا قريبًا﴾ (النبأ: ۴۰)

سوال: ﴿بأسًا شديدا﴾ کو ﴿من لدنه﴾ سے مقید کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: عذابِ عظیم کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کی طرف سے کوئی ہدیہ ملے، تو وہ اسے ''ہدیہ عظیمہ'' کہتا ہے، ایسے ہی ﴿بأسًا شديدًا من لدنه﴾ أي ؛ عذابًا عظيمًا من عنده .

سوال: ﴿ماكثين﴾ کی جگہ ﴿خالدين﴾ کیوں نہیں استعمال کیا گیا؟

جواب: مکث اور خلود میں فرق ہے:...... ''مکث'' بمعنی لُبث وانتظار ہے، یعنی کسی جگہ انتظار کرتے ہوئے ٹھہرنے کو ''مکث'' کہتے ہیں۔ اور ''خلود'' کے معنی مطلق ہمیشہ کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، آیت کریمہ میں مؤمنین صالحین کے لیے اجرِ حسن کا تذکرہ ہے، وہ جنت میں اسی اجرِ حسن کا انتظار کرتے ہوئے ٹھہریں گے۔

سوال: ﴿قالوا اتخذ الله ولدًا﴾ قولِ اتّخاذِ ولد میں کون کونسے فرقے شامل ہیں؟

جواب: تین فرقے شامل ہیں: (۱) فرقۂ اُولیٰ ؛ مشرکینِ عرب، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے: ﴿وجعلوا الملائكة الذين هم عباد الرحمٰن إناثًا﴾ . (سورة الزخرف : ۱۹) ﴿وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدًا سبحانه بل عباد مكرمونO لا

يسبقونه بالقول وهم بامره يعملونO﴾ . (سورة الأنبياء : ۲۶ ، ۲۷)

(۲) فرقۂ ثانیہ؛ یہود بے بہبود، جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے: ﴿وقالت اليهود عزيرٌ ن ابن اللّٰه﴾ . (سورة التوبة : ۳۰)

(۳) فرقۂ ثالثہ؛ نصاریٰ، جو حضرت مسیح یعنی عیسی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے: ﴿وقالت النصارى المسيح ابن اللّٰه﴾ . (سورة التوبة : ۳۰)

سوال: ولدًا اور ابن میں کیا فرق ہے؟

جواب: (۱) ولد: ہر وہ بچہ جسے ماں نے جنا ہو، یعنی صلبی بیٹا۔ ولید اور مولود بھی اسی معنی میں آتے ہیں۔ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں۔

ابن یہ لفظ صرف صلبی بیٹے کے لیے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ اس کے استعمال کا دائرہ وسیع ہے، جیسے بنو آدم، بنو اسماعیل وغیرہ۔

(۲) ابن کا لفظ نسب و رشتہ کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے، جیسے عیسی ابن مریم، مریم بنت عمران وغیرہ، ولد اس طرح نہیں ہے۔

(۳) ابن و بنت بطورِ کنیت مستعمل ہیں، ایک ادنی سی مشابہت بھی کافی ہوتی ہے، جیسے؛ ابو تراب، ابو هريره ، ام الخبائث ، أم الامراض ، ابن الوقت ، ابن السبيل ، بنت الكرم وغیرہ، ولد اور اس کے مشتقات کنیت کے لیے مستعمل نہیں ہیں۔

سوال: عقیدۂ ولدیت کے بارے میں علامہ مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: عقیدۂ ولدیت کی بدولت عیسائی سمجھتے ہیں کہ مخلوق کے پیکر میں خالق ہمارے سامنے آ گیا۔ اور یورپ کی موجودہ لا مذہبیت یا بے دینی خود اسی مذہب اور دین کی پیداوار ہے، جسے یورپ نے قبول کیا تھا، اور یہ مذہب یا دین کیا تھا؟ وہی ''نظریہ ولدیت'' تھا، جس کی تعبیر قرآن میں ﴿قالوا اتخذ اللّٰه ولدًا﴾ سے کی گئی ہے۔

سوال: مكث . لبث . عكف میں کیا فرق ہے؟

جواب: لبث: بہت طویل مدت تک ٹھہرنا۔ مکث: کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرنا۔ عکف: کسی متبرک مقام پر بغرض عبادت ٹھہرنا۔

سوال: ﴿كبرت كلمة﴾ میں کلمة سے کیا مراد ہے؟

جواب: کلمہ سے کلام و جملہ مراد ہے، خواہ ایک جملہ ہو یا جملوں کا مجموعہ ہو، اسے کلمہ کہہ دیا جاتا ہے، جیسے؛ ﴿حتى إذا جاء أحدهم الموت قال رب ارجعونO لعلي اعمل صٰلحًا فيما تركت كلا إنها كلمةٌ هو قآئلها﴾ . (سورة المؤمنون : ۹۹ ، ۱۰۰) اس میں رب ارجعون جملہ پر ''کلمہ'' کا اِطلاق کیا گیا۔

سوال: ﴿كبرت كلمة﴾ یعنی اتخاذِ ولد للہ؛ بڑی سنگین و مجرمانہ بات ہے، اس سنگین بات کی قدرے تفصیل قرآن کریم کی کسی آیت کے ذریعے کریں!

جواب: قرآن پاک کی سورۂ مریم آیت: ۸۸ تا ۹۲ / اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وقالوا اتخذ الرحمن ولدًاO لقد جئتم شيئًا اِدًّاO تكاد السمٰوٰت يتفطّرن منه وتنشقّ الارض وتخِرّ الجبال هَدًّا O اَن دعوا للرحمٰن ولدًاO وما ينبغي للرحمن ان يتخذ ولدًاO﴾ ۔ (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کی کوئی اولاد ہے!O [ایسی بات کہنے والو!] حقیقت یہ ہے کہ تم نے بڑی سنگین حرکت کی ہےO کچھ بعید نہیں کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیںO کہ ان لوگوں نے خدائے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہےO حالانکہ خدائے رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ اُس کی کوئی اولاد ہوO)۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حاملِ قرآن کی ذمہ داری......دنیا کی چمک دمک و رونق فانی ہے
خودفراموشی خدافراموشی کا سبب ہے......دنیا کی پرستش کی مذمت

آیت : ٦ ، ٧ ، ٨ : ﴿فلعلک باخع نفسک علی اثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفا o انا جعلنا ما علی الارض زینة لھا لنبلوھم ایھم احسن عملاo و انا لجاعلون ما علیھا صعیدا جرزاo﴾ .

ربط : پہلی آیت میں حاملِ قرآن کی ذمہ داری بیان کی جارہی ہے، جیسا کہ صاحبِ قرآن؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے کفر اور معاندانہ طرزِ عمل سے سخت صدمہ ہوتا تھا، تو آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ دعوت وتبلیغ کا فرض ادا کرتے رہیں، دل میں گھٹنے اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے، نہ اس بات پر پچھتانے کی ضرورت ہے کہ میری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہوتی؟ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، ﴿انک لا تھدي من احببت ولکن اللّٰہ یھدي من یشاء﴾ داعی کا کام صرف دعوت دینا ہے، وہ اپنی محنت میں کامیاب ہے، کم نصیب اگر دُنیا کی سجاوٹ میں محو ہوکر، اللہ تعالیٰ کو بھول جائیں، اور آپ کی نصیحت ودعوت کو قبول نہ کریں، تو انہیں کا نقصان ہے، آپ کو اس پر اتنا افسوس بھی نہیں کرنا چاہیے۔

اور دوسری آیت میں خوش نما کائنات اور دل فریب دنیا کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جتنی چیزیں زمین پر سجی ہوئی بارونق نظر آرہی ہیں، ایک دن وہ سب فنا ہوجائیں گی، اور تب پتہ چلے گا کہ دُنیا کی ظاہری خوب صورتی بڑی بے وقعت و ناپائیدار تھی۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

فلعلک : میں فا جزائیہ ہے۔ **لعلّ :** کلمۂ ترجّی ہے۔

باخعٌ : ہلاک کرنے والا۔ اسم فاعل، صیغہ واحد مذکر، از باب فتح یفتح۔

نفسک : نفس معنی جان، جمع " أنفس، نفوس "۔

"ک" ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ ہے۔

آثار : پیچھے، اس کا واحد "اَثر" اور "اِثر" ہے، معنی: پیچھے، بعد۔

اسفًا : غم کی وجہ سے۔ غم کرتے ہوئے۔ مصدر از باب سمع یسمع۔ ترکیب میں مفعول لہ یا حال واقع ہے۔ حال ہونے کی صورت میں یہ مصدر اسم فاعل "آسفًا" کے معنی میں ہوگا۔

زینة : اگر جعل بمعنی خلق ہو، تو زینة مفعول لہ ہوگا۔ اور اگر جعل بمعنی صیَّر ہو تو زینة مفعول ثانی بھی ہوسکتا ہے۔

صعیدًا جُرزًا : چٹیل زمین، چٹیل میدان۔ مراد زمین کی تمام چیزوں کو فنا کرنا ہے۔ موصوف صفت مل کر مفعول بہ ہے۔

صعید : صعودٌ مصدر سے بروزن فعیل صیغۂ صفت مشبہ ہے۔ معنی ہے: سطح زمین، زمین کا بلند حصہ۔ **جُرزا :** جَرزٌ مصدر سے فُعُلٌ کے وزن پر صفت مشبہ ہے، معنی بنجر زمین، چٹیل میدان۔

فلعلک باخعٌ : استفہام انکاری بمعنی نہی ہے۔ یعنی " **لا تبخع نفسک لإعراضھم عن الإیمان أسفًا** "۔

"باخع": حالتِ رفعی میں ہے لعل حرف ترجی کی خبر واقع ہونے کی وجہ سے۔ نفسک باخع کا مفعول بہ ہے۔

لنبلوھم : فعل مضارع منصوب ہے لامِ تعلیل کی وجہ سے۔

☆......اعراب......☆

فلعلک باخع نفسک علی اثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفا .

فا استینافیہ، لعل حرفِ ترجی، کاف ضمیر لعل کا اسم منصوب، باخع خبر مرفوع، نفسک مفعول بہ منصوب باخع اسم فاعل کا۔ کاف مضاف الیہ، علی آثارھم جار مجرور مل کر متعلق باخع سے، ھم ضمیر مضاف الیہ، إن حرفِ شرط جازم، لم حرفِ نفی، یؤمنوا مضارع مجزوم فعل شرط، علامتِ جزم حذفِ نون۔ واو فاعل، باحرفِ جر، ھا حرفِ تنبیہ، ذا اسمِ اشارہ مبنی

محلِ جر میں ہے، متعلق یؤمنوا کے۔ **الحدیث** اسم اشارہ سے بدل، یا عطفِ بیان مجرور، أسفا مفعول لہ منصوب۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿**فلعلّک**﴾ : **لعلّ** کے ذریعے مرجوعنہ کا ایسا بعد بیان کیا جاتا ہے، جس کے حصول کی امید نہ کی جا سکے، جیسے ﴿**فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى**﴾ (سورۃ طه : ۴۴) مگر آیتِ مذکورہ ﴿**فلعلك باخع نفسك**﴾ میں **لعل** محض رجا کے لیے نہیں ہے، بلکہ نہی (حکمِ واجبی) کے لیے ہے۔

☆......﴿**باخعٌ نفسک**﴾ : استعارہ تمثیلیہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کو مشرکین کی ایسی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی کہ جن کے احباب اُن کا ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ پس وہ اُن کی جدائیگی کے صدمہ اور رنج کی بنا پر اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا ارداہ کر لیں۔

استعارہ تمثیلیہ : وہ مجازِ مرکب ہے جس میں ایک جملہ تشبیہ کے علاقے کی وجہ سے اپنے معنیٔ موضوع لہ کے علاوہ دوسرے معنی میں مستعمل ہو، کسی ایسے قرینہ کے ساتھ جو معنیٔ موضوع لہ مراد لینے سے مانع ہو۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......حاملِ قرآن وداعی اسلام کو چاہیے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتا رہے، چاہے لوگ اس پر کان نہ دھریں، اور طعن وتشنیع کریں، اس لیے کہ ہدایت وتوفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

☆......آیتِ مذکورہ ﴿**باخع نفسک**﴾ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انتحار یعنی خود کشی حرام ہے۔

☆......تعلیم گاہوں کے قیام کا مقصد؛ بہتر سے بہتر کام کرنے والوں کو چھانٹنا اور ممتاز کرنا ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ کس کو اعلیٰ نمبرات حاصل ہوئے؟ یا کس کو طِلائی یا نُقرئی تمغہ

ملا؟ اگر چہ ضمناً امتحان کے نتیجے میں بد شوق طلبہ فیل ونا کام ہو ہی جاتے ہیں، وہ سرزنش کے مستحق بھی ہوتے ہیں، مگر تعلیم گاہ کے قیام کی غرض وہ طلبہ نہیں ہوتے۔

☆......انسان کو چاہیے کہ دنیا کی ظاہری زیب وزینت پر فریفتہ ہو کر نہ رہ جاوے؛ کہ یہ خود فریبی وخود فراموشی ہے، اور خود فراموشی خدا فراموشی کا سبب ہے۔ دنیا کی زیب وزینت کو بہ نگاہِ عبرت دیکھیں نہ کہ بہ نگاہِ تماشا۔

جگہ جی لگانے کی دُنیا نہیں ہے ☆ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

☆......آج مسلم معاشرہ جو مغربی ویورپی اقوام کی مادّی ترقی، دنیوی ٹھاٹ باٹ، زمینی گل وگل زار، ظاہری بناؤ سنگار، عیش وعشرت دیکھ کر رِیجھ رہا ہے، وہ سمجھ لیں کہ یہ زرق برق دنیا فانی ہے، اور مغربی ویورپی اقوام ترقی کے بامِ عروج پر ہونے کے باوجود آسمانی ہدایت سے تہی دست ہیں، جس کی بنا پر وہ حقیقی سُرور وطمانینت اور ابدی نجات وفلاح سے کوسوں دُور ہیں۔ لہٰذا اس ناپائیدار زینت پر فریفتہ ہونا کج طبعی اور فتورِ عقل کی دلیل ہے۔

جہاں از رنگ وبو ساز دا سیر است ☆ ولے نزدیک اربابِ بصیرت
نہ رنگ دلکشش را اعتبار یست ☆ نہ بوئے دلفریبش را مدار یست

(دنیا رنگ وبو کی اسیر ہے۔ لیکن اہلِ بصیرت کے نزدیک نہ اس کے دل کش رنگ کا اعتبار ہے، نہ اُس کی دل فریب بو پر زندگی کا مدار ہے۔)

☆......سوالات......☆

سوال: **لعلّ** : کلمۂ ترجّی ہے۔ یعنی کسی چیز کی امید کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ معنی اس آیت میں بنتے نہیں، تو اس کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟

جواب: عربیت کے بعض ماہرین نے لکھا ہے کہ ''لعل'' استفہام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو اگر اس آیت میں استفہامِ انکاری کے معنی میں لے لیا جائے، تو کسی تکلف اور توجیہ کی ضرورت نہیں پڑتی، میرے نزدیک یہی راجح ہے، اب آیت کا مطلب ہوگا؛ اے

پیغمبر! کیا تو ان کافر ومشرک لوگوں کے پیچھے اپنی جان کو غم میں ہلاک کر ڈالو گے؟!

سوال: ﴿**فلعلک باخع نفسک الخ**﴾ اس طرح کا مضمون قرآنِ پاک میں کہیں اور مذکور ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے؟

جواب: جی ہاں! اس کے علاوہ اور جگہوں پر بھی اس طرح کا مضمون وارد ہوا ہے، جیسے:

(۱) ﴿**لعلک باخع نفسک ألا یکونوا مؤمنین**﴾ . (سورة الشعراء : ۳)

(۲) ﴿**فلا تذهب نفسک علیهم حسرات**﴾ . (سورة فاطر : ۸)

(۳) ﴿**ولا تحزن علیهم ولا تک في ضیق مما یمکرون**﴾ . (النحل : ۱۲۷)

(۴) ﴿**فلا تأس علی القوم الفٰسقین**﴾ . (سورة المائدة : ۲۶)

(۵) ﴿**فلا تأس علی القوم الکٰفرین**﴾ . (سورة المائدة : ۶۸)

سوال: **زینة الارض** سے کیا مراد ہے؟

جواب: حیوان، نباتات، نہریں، معادن وغیرہ سب زینتِ ارض میں شامل ہیں۔

سوال: ﴿**إنا جعلنا ما علی الارض زینة لها**﴾ کیا مخلوقاتِ ارضیہ میں جو درندے، موذی جانور اور بہت سی مہلک مضر چیزیں ہیں، جیسے سانپ، زہر، بچھو وغیرہ، تو کیا وہ سب بھی زینتِ ارض میں شامل ہیں؟ کیا انہیں بھی رونق کہا جا سکتا ہے؟

جواب: اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) بروایت سعید بن جبیر عن ابن عباس: رجال؛ یعنی مرد حضرات مراد ہیں۔

(۲) بروایت مجاہد عن ابن عباس: علماء وصلحاء مراد ہیں۔ (بقول ابن الأنباری: اِن دونوں صورتوں میں "ما" بمعنی "مَنْ" ہوگا، اس لیے کہ موضعِ ابہام میں ہے۔)

(۳) بقول مجاہد: جو کوئی چیز رُوئے زمین پر ہے، وہ زینت ارض میں شامل ہے۔ **کما قال صاحب التفسیر المظهري۔**

(۴) بقول مقاتل: نباتات، اشجار، وانہار مراد ہیں۔

صاحب تفسیر مظہری، اور صاحب تسہیل لتأویل التنزیل کی رائے کے مطابق:

تیسرے قول میں عموم ہے، کہ لفظ "ما" عام ہے، یعنی زمین پر موجود تمام چیزوں کو مراد لیا جانا بہتر ہے۔ نیز یہ چیزیں زینت اس اعتبار سے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی صنعت، قدرت، وحدت اور صفاتِ کاملہ پر دال ہیں، جیسا کہ حکیم الامت علامہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ﴿**انا جعلنا ما علی الارض زینة لها لنبلوهم أیهم احسن عملا**﴾ اس حسنِ عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ ان اشیائے ارضیہ، انہار واشجار وجبال ومعادن کو حق سبحانہٗ تعالیٰ کے انوارِ جلال وجمال کے مشاہدہ کا آئینہ بناوے۔ اور ابن عطاء نے فرمایا ہے کہ حسنِ عمل یہ ہے کہ کل (حوادث) سے بے التفاتی کرے، اور بعض نے کہا ہے کہ اہلِ معرفت ومحبت زینتِ ارض ہیں، اور حسنِ عمل ان کی طرف احترام کے ساتھ نظر کرنا ہے۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مِن وجہٍ تو یہ چیزیں موذی اور خراب ومہلک ہیں، مگر مجموعۂ عالَم کے لحاظ سے کوئی بھی چیز خراب وتکلیف دہ اور موذی نہیں، کیوں کہ ہر بری چیز میں قدرت نے دیگر بہت سے فوائد رکھے ہیں، جیسا کہ زہریلے جانوروں اور درندوں سے ہزاروں انسانی ضروریات معالجات وغیرہ میں پوری کی جاتی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

نکمی کوئی بھی شے نہیں زمانے میں ☆ کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

سوال: علماء وصلحاء کے زینتِ ارض ہونے کا کیا مطلب؟

جواب: رجال، علماء وصلحاء خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، معرفتِ خداوندی کا سبب بنتے ہیں، مخلوق کا رشتہ خالق سے جوڑتے ہیں۔

سوال: نباتات واشجار کے زینتِ ارض ہونے کا کیا مطلب؟

جواب: جیسے انسان کے لیے کپڑے اور زیورات زینت ہوتے ہیں، ایسے ہی زمین کے لیے نباتات، شجر وحجر اور نہریں وغیرہ کپڑے اور زیورات کے درجے میں ہیں۔

سوال: ﴿أحسن عملا﴾ سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

جواب: (ا)" أن يكون العمل في نفسه صحيحًا صوابًا ، وذلک بموافقته للكتاب والسنة ، وأن يكون عامله مخلصا فيه لله يبتغي به وجه الله "یعنی اس جملے سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی نفسہٖ عمل صحیح ودرست ہو۔ کتاب وسنت کے موافق ہو، اور عامل اس عمل کے کرنے میں مخلص ہو۔ جو بھی کام کیا جائے، اس کا مقصود محض رضائے الٰہی کا حصول ہو۔

(۲)" العبرة بحسن العمل لا بكثرته "یعنی ہم سے "حسنِ عمل" کا مطالبہ کیا گیا ہے، کثرتِ عمل کا نہیں۔

سوال: اس طرح کا مضمون قرآن میں اور کہاں مذکور ہے؟

جواب: اس طرح کا مضمون سورۂ ملک میں مذکور ہے، ارشاد ہے: ﴿الذي خلق الموت والحياة ليبلوكم ايكم احسن عملا﴾ . (سورة الملک)

سوال: ﴿وانا لجاعلون ما عليها صعيدا جرزا﴾ کی تفسیر، دیگر قرآنی آیات سے کیجیے!

جواب: ﴿كل من عليها فان﴾ . (سورة الرحمن : ٢٦)

﴿اتاها امرنا ليلا او نهارا فجعلناها حصيدا كأن لم تغن بالأمس﴾ .

(سورة يونس : ٢٤)

﴿واضرب لهم مثل الحياة الدنيا كماء انزلناه من السماء فاختلط به نبات الارض فأصبح هشيمًا تذروه الرياح وكان الله على كل شيء مقتدرا﴾ . (سورة الكهف : ٤٥)

☆☆☆☆☆☆☆

قابلِ توجہ تنبیہات

تنبیہ (۱): قرآن کریم کے بیان کردہ جن واقعات میں خصوصیت سے افسانہ طرازی، جولانیٔ طبع، اور خیال آرائیوں سے کام لے کر ایک حقیقی اور سچے واقعہ کو کہانی اور بے حقیقت افسانہ بنایا گیا ہے، انہیں میں سے اصحاب کہف ورقیم کا بھی واقعہ ہے، اس سلسلے میں ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بہت سی ایسی خبریں اور روایتیں تحریر کی ہیں، جن کی تفصیلات سے قرآن خاموش ہے، آیاتِ قرآنی کا مفہوم ان جھوٹی اور بے بنیاد روایتوں کے بغیر بھی واضح اور صاف ہے، اس کے باوجود ان روایتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان روایتوں کے ضعف، موضع یا قابلِ اعتبار ہونے کی وضاحت نہیں کی گئی ہے، جس سے قاری کو دھوکہ ہوتا ہے۔

تنبیہ (۲): علامہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابن اسحاق کی ایک طویل روایت لکھی ہے، اس کے علاوہ وہب ابن منبہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایتیں بھی نقل کی ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کس زمانے میں تھے؟ کس جگہ ٹھہرے تھے؟ کس زمانے میں وہ پیدا ہوئے؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان لوگوں کے نام کیا تھے؟ ان کے کتے کا کیا نام تھا؟ کتے کا رنگ کیسا تھا؟ زرد تھا یا سرخ؟ ان سارے سوالات کو ان روایتوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جب کہ قرآن میں بالقصد اس کو پوشیدہ رکھا گیا ہے، اور بیان نہیں کیا گیا ہے، احادیثِ صحیحہ سے بھی ان سوالات کے جوابات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے، صحیح معلومات کے یہ دونوں مستند ذریعے جب اس مسئلہ میں خاموش ہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ معلومات کسی غیر مستند ذریعہ ہی سے آئی ہوگی، اس لیے ان روایتوں کی نہ تصدیق کی جا سکتی ہے، اور نہ تکذیب۔

تنبیہ (۳): دشمنانِ اسلام کی طرف سے بالقصد اسلام کے خلاف ایک گہری اور دُوررَس سازش کے تحت، بدنیتی سے بہت سی ہوائی باتیں اُڑائی گئی ہیں، بددینوں اور ملحدوں نے چاہا کہ اسلام کے اندر ایسی بے سروپا، خلافِ عقل اور دیومالائی واقعات بھر دیئے جائیں کہ مسلمان ساری دنیا میں توہم پرست، خلافِ عقل ومشاہدہ باتوں پر یقین کرنے والا ایک فرقہ بن کر رہ جائے، خدا

محدثین عظام کی قبروں کو رحمت کے پھولوں سے بھر دے کہ انہوں نے کسوٹی پر پرکھ کر ان جھوٹے قصوں، کہانیوں اور افسانوں کے تار پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں، اگر اتنی کڑی چھان بین نہ کی جاتی، تو آج اسلام کی تعلیمات اور اس کی کتاب مضامین ومفاہیم کے لحاظ سے محرف ہو کر انجیل وتورات کی پوزیشن میں آجاتی، اور حقیقت خرافات میں گم ہو کر رہ جاتی۔

تنبیہ (۴): حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سیاق وسباق اور قرآن کے شیوہ بیان کے جو مذاق شناس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ محض کسی گزرے ہوئے واقعہ کا دہرانا، یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل وتمیز کا مضحکہ ہے، اسی لیے قرآنی قصص وحکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری مشغلہ ہے۔ قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف انہی اجزا کا وہ انتخاب کر لیتا ہے، جن سے خاص مقصد کے ذہن نشین کرانے اور سلجھانے میں مدد ملتی ہو۔

آپ مزید فرماتے ہیں:

سورۂ کہف کے ان قصص وحکایات کی تاریخی تحقیق، یعنی کہاں اور کب یہ واقعات پیش آئے، تاریخی آثار اور کتابوں سے انہی کے متعلق کس قسم کے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں، یا ہو چکے ہیں، یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے، جس غرض سے قرآن اتارا گیا ہے اس کے لحاظ سے بحث وتحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری ہے۔ یوں علمی نقطۂ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سراغ رسانی علم کی خدمت ہے، اس خدمت کو بھی انجام دے، تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی قدر وقیمت کی مستحق ہوگی، لیکن جس نتیجے تک پہنچانے کے لیے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہے، اس کے لیے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

قسمِ اول (آیت ۹/تا ۳۱)

واقعۂ أصحابِ کہف

طوفانی فتنوں کے دور میں؛ دین وایمان کی حفاظت کے لیے ایک راستہ!

دین کے راستہ میں قربانی دینے والوں کی کس کس طرح مدد کی جاتی ہے؟!

عجائباتِ قدرتِ خداوندی...... گوشہ نشینی اختیار کرنا

تاریخ نگاری ومضمون نویسی کا سلیقہ

آیت: ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲:

﴿أم حسبت ان أصحٰب الكهف والرقيم كانوا من ايٰتنا من عجبا ۝ اذ اوى الفتية الى الكهف فقالوا ربنا اٰتنا من لدنک رحمة وهيء لنا من أمرنا رشدًا ۝ فضربنا على اٰذانهم في الكهف سنين عددًا ۝ ثم بعثناهم لنعلم أي الحزبين أحصى لما لبثوا امدًا ۝﴾ .

ربط: ان آیات میں اصحابِ کہف کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے، جو آپ کی نبوت ورسالت اور قیامت کی دلیل بھی ہے، اور کفار کی طرف سے پوچھے گئے سوال کا جواب بھی۔ مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں: اِن چار آیتوں میں پورے واقعۂ اصحابِ کہف کا خلاصہ کیا گیا ہے، اس سے تاریخ نگاری اور مضمون نویسی کا سلیقہ سیکھا جا سکتا ہے، یعنی اگر کوئی لمبا مضمون یا طویل داستان بیان کرنی ہو، تو گفتگو کے آغاز ہی میں ساری بات کا نچوڑ پیش کر دینا چاہیے، تاکہ مخاطب کو انتظار کی تکلیف سے نجات ملے، اور اجمال کے بعد تفصیل جاننے کا شوق پیدا ہو۔

☆......مفرداتِ لغویه......☆

أم حسبت : أفحسبت/أفظننت/بل ظننت . اَم منقطعہ بمعنی استفہام انکاری۔

أن أصحٰبَ الكهف : حسبتَ کا مفعول بہ ہے۔

كانوا من اٰيٰتنا عجبًا : كانوا اَنّ کی خبر،اور عجبًا كانوا کی خبر ہے۔

الكهف: الثَّقبُ المُتَّسِعُ في الجَبل/ الغار في الجبل [الذي لجأ إليه الفتية المذكورون] .

الفرق بين الغار والكهف : غار چھوٹا ہوتا ہے،اور کہف وسیع۔اُردو میں چھوٹا غار، بڑا غار کہہ کرفرق کرتے ہیں۔ كهف ج كهوف۔

رقيم : بروزن فعيل بمعنی مرقوم : لکھا ہوا۔نوشتہ۔

أوى : أوى يأوي از باب ضرب، فعل ماضی معروف،صیغہ واحد مذکر غائب۔مصدر اُوِيٌّ ہے۔معنی ہے: پناہ لینا۔

الفِتية : فتًى کی جمع تکسیر ہے۔اور جمع قلت کے اوزان میں سے ہے۔

رحمة : رحمت عام ہے، جو ہدایت، وسعتِ رزق، رعایت وحفاظت، دشمن بادشاہ کے خوف سے نجات،اور مغفرت کو شامل ہے۔

هيء لنا : بمعنی اجعل لنا/ أي : يسِّر لنا من الأمور ما نسترشد به في دنيانا ولأُخرانا . تیار کرنا، مہیا کرنا۔از باب تفعيل فعل امر صیغہ واحد مذکر حاضر۔مصدر تهيئةٌ ہے۔

رَشَدًا : درستی،ہدایت۔مصدر از باب سمع يسمع . ترکیب میں مفعول بہ واقع ہے۔

فضربنا على آذانهم : أي : غطينا على آذانهم حتى لا يصل السمع إليها ومن ثم لا يستيقظوا . یعنی کانوں کو بند کر دینا۔غفلت کی نیند کو اِن الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سنين عددًا : ظرف منصوب موصوف،اور عددًا سنين کی صفتِ منصوب ہے۔یا بر بنائے مصدر منصوب ہے۔

بعثناهم : أي : أقمناهم من نومهم / أحييناهم . اُن کو نیند سے اُٹھایا۔بیدار کیا۔ از باب فتح يفتح فعل ماضی معروف صیغہ جمع متکلم۔هم ضمیر جمع مذکر غائب مفعول بہ ہے۔

أي : مبتدا ہے،اسمائے استفہام میں سے ہے،جب یہ صدرِ کلام میں ہو تو ماقبل ان میں عمل نہیں کرتا،سوائے حروفِ جر کے،لیکن ان کا مابعد اس میں عمل کرتا ہے، جیسے: ولتعلمن اينا اشد عذابا وابقى .

أحصى : (۱) از باب افعال فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب،اس نے شمار کیا۔

(۲) بقول بعض: لفظ أحصى حذفِ زوائد کے ساتھ خلافِ قیاس إحصاءٌ مصدر سے اسم تفضیل ہے۔

أمدًا : أي : عددًا . مدت،وقت۔جمع آمادٌ ہے۔ترکیب میں مفعول بہ یا تمیز ہے۔

☆......اعراب......☆

فضربنا على اٰذانهم في الكهف سنين عددًا .

فا عاطفہ، ضربنا فعل ماضی،نحن ضمیر فاعل، على آذانهم جار مجرور متعلق ضربنا کے، هم ضمیر مضاف الیہ، في الكهف جار مجرور، سنين ظرفِ زمان منصوب متعلق بضربنا، علامتِ نصب یائے ملحقہ بجمع مذکر، عددًا بمعنی معدودة سنين منعوت کی نعت، یا مضاف محذوف کی صفت،أي: ذوات عدد،اس صورت میں عددًا مصدر ہوگا۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿فضربنا﴾ ﴿ثم بعثناهم﴾ میں طباقِ معنوی ہے،اس لیے کہ پہلے کا معنی: "أنمناهم" اور دوسرے کا معنی: "أيقظناهم" ہے۔

طباقِ معنوی وخفی : وہ طباق ہے جس میں ایک معنی کو اس کے مقابل کے ساتھ تو اکٹھا نہ کیا جائے، بلکہ ایک معنی کو اس کے مقابل کے متعلق کے ساتھ جمع کیا جائے۔

☆......﴿فضربنا على اٰذانهم﴾ میں استعارہ تبعیہ ہے۔نومِ ثقیل کو کانوں پر پردہ

ڈال دینے سے تشبیہ دی گئی، جیسا کہ رہائشی لوگوں پر خیمہ ڈال دیا جاتا ہے۔ لفظ مستعار فعل ’’ضربنا ‘‘ ہے۔ اور بعض علما کے نزدیک استعارہ تمثیلیہ بھی ہوسکتا ہے۔

استعارہ تبعیہ: وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار فعل ہو، یا اسم مشتق، یا حرف ہو۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......جو شخص اپنے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ تنہا اور الگ تھلگ رہ کر اپنے دین کو محفوظ رکھتے ہوئے زندگی گزارے گا، تو اس کے لیے بہتر اور افضل یہ ہے کہ لوگوں سے اختلاط نہ رکھے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ جماعت کی پابندی کرے، سلام کرے، سلام کا جواب دے، مسلمانوں کے حقوق ادا کرے، مثلاً: بیمار کی عیادت کرے، جنازہ میں شرکت کرے، وغیرہ۔ (علامہ ابن حجر از خطابی)

☆......عُزلت و گوشہ نشینی کا حکم دے کر اصل مقصود و مطلوب مصاحبت واختلاط کی فضولیات کو چھوڑنا ہے، اس لیے کہ اس میں اہم اُمور سے دل کو غافل اور وقت کو ضائع کرنا ہے۔

☆......اگر تم کو کسی ایسے ساتھی کی رفاقت نصیب ہو، جس کی سیرت و کردار سے اللہ کی یاد آتی ہو، تو تم اس کی رفاقت کو ضروری سمجھو، اور کبھی بھی اس سے جدائی نہ اختیار کرو، اس کو حقیر ومعمولی نہ سمجھو، بلکہ اس کو غنیمت جانو۔

☆......اچھی رفاقت مومن کے لیے مالِ غنیمت اور اس کا گم شدہ مال ہے۔

☆......نیک وصالح ساتھی تنہائی سے بہتر ہے، اور گوشہ نشینی وتنہائی برے ساتھی سے بہتر ہے۔

☆......فقہائے کرام فرماتے ہیں: خوفِ فتنہ کے وقت انسان پر لازم ہے کہ اپنا دین سلامت لے کر اس مقام سے چلا جائے، اور کلمۂ کفر کے تلفظ سے تقیۃً بھی احتراز رکھے۔

☆......﴿ربنا اٰتنا من لدنک رحمة وهيء لنا من أمرنا رشدًا﴾ (ہمیں مقصد میں بھی کامیاب کر، اور ہمارے لیے ذرائع اور سامان بھی اپنی مرضیات کے مطابق مہیا کردے)، فقہائے کرام نے یہاں سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ جب انسان اپنے دین

کے لیے خوفِ فتنہ سے ترکِ وطن کرے، تو اسی طرح کی دعا حق تعالیٰ سے کرے کہ حق تعالیٰ نے اس دعا کو موقعِ مدح واستحسان میں پیش کیا ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿أم حسبت أن اصحٰب الكهف والرقيم كانوا من اٰيٰتنا عجبا﴾ کی مراد واضح کیجیے!

جواب: ظاہراً خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اور باطناً یہود کو، یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! (اِن یہود وکفار کو بتائیں جو اس قصے کو عجیب وغریب سمجھ رہے ہیں کہ) یہ قصۂ اصحابِ کہف ورقیم ہی صرف عجیب وغریب نہیں، بلکہ قدرت کی جتنی بھی آیات ونشانیاں ہیں، سب ہی عجیب وغریب ہیں، مثلاً: خلقِ سماوات وارض، اختلافِ لیل ونہار، تسخیرِ شمس وقمر، تسخیرِ نجوم وکواکب، وغیرہ۔ اور غارِ ثور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے یارِ غار ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حفاظت کرنا، اور دشمنوں کو اندھا بنا دینا کہ غارِ ثور کے منہ پر کھڑے ہو کر بھی اِن دونوں کو نہ دیکھ سکیں، یہ اصحابِ کہف کے قصہ سے کم عجیب نہیں، اور اگر نزولِ سکینت ومعیتِ خداوندی کی نعمت اور ملائکہ کی حراست وحفاظت پر نظر کیجیے تو غارِ ثور کا واقعہ اصحابِ کہف کے واقعہ سے بہت زیادہ عجیب ہے۔ اور یہ قرآنِ کریم تو سب سے عجیب وغریب اور اعظم نشانی ہے؛ کہ قیامت کے روز اس کے تابعین یعنی امتِ محمدیہ کے افراد زیادہ ہوں گے۔

سوال: رقیم سے کیا مراد ہے، کس علاقے میں واقع ہے؟

جواب: رقیم کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) اطرافِ شام میں بلقا کے قریب اس بستی کا نام ہے، جہاں سے اصحابِ کہف نکلے تھے، اس قول کی اسناد ضعیف ہے۔ كما قال ابن حجر في فتح الباري .

(۲) اُس پہاڑی کا نام ہے جس میں وہ غار واقع ہے۔

(۳) اصحابِ کہف کے کتے کا نام ہے۔

۲۲

(۴) بقول قتادہ: رقیم سے مراد اُن کے پاس موجود ''دراہم''۔

(۵) وادی (میدان) کا نام ہے، جو اس کوہ کے دامن میں واقع ہے، جس میں وہ غار ہے۔ (بقول قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد)

(۶) مفسر قرآن علامہ ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ کے نزدیک اصحابِ کہف کا اُندلس [اسپین/ ہسپانیہ] میں ہونا زیادہ راجح ہے۔

(۷) ایک قول کے مطابق ملک اردن کے عمان میں بحرمُردار (بحرمیت) کی سمت میں بَترا (پٹرا) کے قریب واقع ہے۔

(۸) رقیم ''اَیلہ'' یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے، جو بلادِ رُوم میں واقع ہے۔ **أطلس الحديث النبوي** میں ہے: **والصحيح أنهم ببلاد الرُّوم ، بين عمورية ونيقية ، بينها وبين طرسوس عشرة أيام ، عند أفسوس في جبال طوروس جنوبي الأناضول** (صحیح یہ ہے کہ بلادِ روم میں عموریہ اور نیقیہ کے درمیان واقع ہے، وہاں سے طرسُوس تک دس دن کا فاصلہ ہے، افسُوس جنوبی اناضول/ اناطولیہ کے پہاڑ طوروس کے پاس واقع ہے، اُفسوس: طرسوس کا شمال مغربی علاقہ ہے)۔

(۹) وہ تختی جس میں اصحابِ کہف کے نام اور حالات لکھے گئے تھے، اور جو کہف کے دہانے پر نصب کی گئی تھی۔

(۱۰) سیسہ کی وہ تختی جس پر اصحابِ کہف کے نام وغیرہ لکھ کر شاہی خزانہ میں رکھی گئی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس قول کو اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ مفتی سعید صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا مختار قول بھی یہی ہے۔

(۱۱) صاحب تسہیل شیخ ابوعبداللہ فرماتے ہیں: رقیم بمعنی مرقوم ہے، جیسے فعیل بمعنی مفعول، قتیل بمعنی مقتول، جریح بمعنی مجروح۔ اور رقیم سے مراد وہ صحیفہ ہے جس میں اُن کی شریعت مرقوم تھی۔ یا سونے کی تختی جس میں ان کے اسماء، انساب، قصہ، سببِ

خروج مکتوب تھے۔ یا وہ چٹان جس پر اُن کے نام منقوش تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

(۱۱) باعتبار تخریجِ طبری (عن سماک عن عکرمہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ پورے قرآن کی تفسیر میں جانتا ہوں، مگر ''حنانا''، ''أوّاہ'' اور ''رقیم'' کی تفسیر کا مجھے علم نہیں۔ علمائے مفسرین نے اس قول کے بارے میں فرمایا: '' **لكن هذا سند ضعيف عن ابن عباس**''۔

(۱۲) مذکورہ بالا جتنی بھی تفسیری روایتیں نقل کی گئیں، اگر یہ روایتیں ذکر نہ کی جاتیں، تو زیادہ مناسب تھا، ان روایات کی نہ تصدیق کی جاسکتی ہے، نہ تکذیب۔ قرآن کریم نے بہت واضح لفظوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ: خدا ہی ان کی صحیح تعداد (اور صحیح واقعہ) جانتا ہے، اس لیے بلاوجہ اس معاملہ میں بحث اور کٹ حجتی نہیں ہونی چاہیے۔

سوال: **أصحاب الرقيم** کسے کہتے ہیں اور کیوں؟

جواب: رقیم ایک لکھی ہوئی تختی تھی، جس پر بادشاہِ وقت نے اصحابِ کہف کے نام کندہ کرا کے غار کے دروازے پر لگا دیا تھا۔ اسی لیے ان اصحابِ کہف کو اصحاب الرقیم بھی کہا جاتا ہے۔ (بروایت ابن عباس منقول از ضحاک، سدی و ابن جبیر)

سوال: أصحاب الكهف اور أصحاب الرقيم دونوں الگ الگ ہیں یا ایک ہی جماعت؟

جواب: بقول جمہور: اصحابِ کہف اور اصحابِ رقیم یہ ایک ہی جماعت کے دو لقب ہیں۔

سوال: عُزلت کی تعریف کیا ہے؟

جواب: عُزلت : **الخروج عن مخالطة الخلق بالانزواء والانقطاع** . یعنی گوشہ نشینی اختیار کرنا، الگ ہو کر مخلوق کے اختلاط سے دُور رہنا۔

سوال: عُزلت وخلوت دونوں ایک ہیں یا الگ الگ؟

جواب: علامہ سہروردی رحمہ اللہ ''عوارف المعارف'' میں فرماتے ہیں کہ خلوت عزلت سے الگ ہے، خلوت کا معنی ہے انسان کا تنہا ہونا، جو غیروں سے ہوتی ہے، اور نفس و دواعیٔ نفس،

اور اللہ سے غافل کرنے والے اُمور سے الگ وڈور رہنے کو عُزلت کہتے ہیں۔ خلوت کثیر الوجود، جب کہ عُزلت قلیل الوجود ہے۔

سوال: عُزلت کا کیا حکم ہے؟

جواب: لوگوں میں فتنہ وفساد واقع ہونے کی صورت میں گوشہ نشینی اختیار کرنا افضل ہے، الا یہ کہ وہ اس فتنہ وفساد کو ختم کرنے پر قادر ہو، تو اس پر اس کے خاتمہ کی سعی کرنا حسبِ حال وحسبِ استطاعت واجب ہوگا۔

سوال: فتنہ وفساد کے زمانہ کے علاوہ میں عزلت بہتر ہے یا اختلاطِ ناس؟ آیاتِ کریمہ: ﴿واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا﴾.(آل عمران : ۱۰۳)﴿ولا تكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا﴾. (آل عمران :۱۰۵) اور حدیث پاک: "المؤمن الذي يخالط الناس ويصبر على أذاهم ، خيرٌ من المؤمن الذي لا يخالطهم ولا يصبر على أذاهم " . (مسند الإمام أحمد) سے تو پتہ چلتا ہے کہ "عُزلت" سے بہتر "اختلاط" ہے؟

جواب: بقول امام نووی رحمہ اللہ: بُرے لوگوں کے شر سے محفوظ رہتے ہوئے اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنا، اور اُن سے اختلاط رکھنا وہ پسندیدہ طریقہ ہے، جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیائے کرام علیہم السلام، خلفائے راشدین، ان کے بعد صحابہ وتابعین اور اُن کے بعد علمائے مسلمین اور صلحاء نے اختیار کیا ہے۔ (یہ تطبیقی جواب ہے)۔

سوال: ﴿فضربنا على اٰذانهم﴾ کی تعبیر اختیار کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: کیوں کہ بوقت نیند سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے، مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے۔ جب نیند مکمل وغالب ہوتی ہے، تو پھر کان بھی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں، کہ آواز سے سونے والا چونکتا ہے، پھر بیدار ہوتا ہے۔

سوال: ﴿فضربنا على اٰذانهم﴾ کی مزید وضاحت کیجیے!

جواب: (۱) بقول امام قرطبی رحمہ اللہ: اِلقائے نوم مراد ہے۔ یہ وہ فصاحتِ قرآنی ہے جس نے اہلِ زبانِ عرب کو بھی چیلنج کیا، وہ اس طرح کی تعبیر بنا کر لانے سے بھی قاصر وعاجز تھے۔

(۲) بقول زجّاج رحمہ اللہ: قوتِ سماعت کو بند کر دیا گیا، تا کہ نیند سے بیدار نہ ہو سکیں۔

(۳) بقول ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: کانوں پر نیند طاری کر دی یعنی شور وشغب اور آواز کے نفوذ سے کانوں کو محفوظ رکھا گیا۔

(۴) ایک قول یہ بھی کہا گیا کہ: ضربنا بمعنی استجبنا ہے، یعنی؛ استجبنا دعاء هم ، وصرفنا عنهم شرَّ قومهم وأنمناهم ، یہ سب متقارب المعنی ہیں۔

(۵) بقول قُطرُب: اہلِ عرب کے ہاں کہاوت مستعمل ہے: " ضرب الأمير على يد الرعية "– یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب امیر اپنی رعایا کو فساد سے روک دے۔

اسی طرح کہا جاتا ہے: " ضرب السيد على يد عبده المأذون له في التجارة " یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی آقا اپنے غلام ماذون فی التجارۃ کو تصرفات سے روک دے۔

(۵) بقول علامہ شنقیطی رحمہ اللہ: لفظ ضربنا بطورِ کنایہ نوم کے معنی میں ہے۔ اور ضربنا کا مفعول محذوف ہے، أي ؛ ضربنا على آذانهم حجابًا مانعًا من السماع ، فلا يسمعون شيئًا يوقظهم ، والمعنى : أنمناهم إنامة ثقيلة ، لا تنبههم فيها الأصوات .

سوال: لفظ " آذان " کو خاص کرنے کی کیا وجہ؟

جواب: اس لیے کہ آذان یعنی کان انسان کے اُن اعضا میں سے ہیں جو نیند کے طویل وقلیل ہونے میں مؤثر ہوتے ہیں، اکثر وبیشتر انسان شور وشغب کی وجہ سے نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ حدیث پاک میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ کان کی سماعت بند ہو، تو نیند طویل ہوتی ہے: " ذاک رجلٌ بال الشيطان في أذنيه "– آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کے بارے میں فرمایا، جو قیام لیل نہیں کرتا، اور نماز چھوڑ کر سویا رہتا ہے، شیطان اُس کے کانوں میں پیشاب کر دیتا ہے۔

سوال: جب لفظ " سنين " جو جمع ہے، سے پتہ چل گیا کہ کئی سال ہیں، تو لفظ "عددًا" بڑھانے کی کیا ضرورت؟

جواب: صاحبِ تفسیر مظہری علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سنین کے بعد لفظ **عددًا** بڑھانے سے کثرتِ سنین کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح صاحب تفسیر ماجدی علامہ دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **عددًا** کا اضافہ یا تو تاکید کے لیے ہے، یا کثرتِ عدد کے اظہار کے لیے ہے۔(ذکر اللّٰہ علی سبیل التأکید وقیل ذکرہ یدل علی الکثرۃ)

سوال: ﴿**ثم بعثناهم لنعلم**﴾ سے کوئی کور مغز، عقل سے پیدل؛ ملحد و زندیق نعوذ باللہ اگر یہ سوال کرے کہ؛ کیا اللہ کو پہلے سے علم نہیں تھا، جو لنعلم کہا گیا؟

جواب: (۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کو" ما کان ، ما هو کائن ، اور ما سیکون" کا علم ہے، لنعلم بمعنی "لنظهر" ہے، أي ؛ لنظهر الحقیقة للناس" ہے، کہ اللہ کو تو پہلے سے علم ہے، لیکن لوگوں پر اُن کی حقیقت ظاہر ہو جائے، جیسا کہ آیتِ کریمہ ﴿**ولیبتلي اللّٰه ما في صدورکم ولیُمحِّص ما في قلوبکم واللّٰه علیمٌ بذات الصُّدور**﴾ . (سورة آل عمران : ۱۵۴) — ﴿**ولیبتلي**﴾ کے بعد ﴿**واللّٰه علیمٌ بذات الصدور**﴾ لانا اس کی واضح دلیل ہے۔

سوال: ﴿**أي الحزبین**﴾ سے کون مراد ہیں؟

جواب: (۱) بقول علامہ قرطبی رحمہ اللہ: اصحابِ کہف مراد ہیں۔ ظاہرِ آیت یہی ہے۔

(۲) اُس زمانے کے کافرین کی دو جماعتیں مراد ہیں، جنہوں نے اصحابِ کہف کے بارے میں اختلاف کیا تھا۔

(۳) اُس زمانے کے مؤمنین کی دو جماعتیں مراد ہیں، جن کے مابین اصحابِ کہف کے سلسلے میں اختلاف ہوا تھا۔

(۴) بقول علامہ شنقیطی رحمہ اللہ: اکثر مفسرین کے نزدیک حزبین سے مراد اصحابِ کہف، اور اہلِ شہر ہیں، جن کے زمانے میں اصحابِ کہف کو بیدار کیا گیا تھا۔

الغرض! تفسیر قرآن بالقرآن کے اعتبار سے حزبین سے اصحابِ کہف ہی کی دو جماعتیں مراد ہیں، جس پر قرینہ ﴿**وکذلک بعثناهم لیتسآء لوا بینهم**﴾ موجود ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱) فتنۂ دین وایمان

فتنۂ دین وایمان (ایمان ومادّیت)......قصۂ اصحابِ کہف نوجوانوں کے لیے آئیڈیل......حقیقی ایمان واستقامت......شرک بے دلیل وسب سے بڑا ظلم......اصنام پرستی پر احساسِ ندامت اور مشرکین سے علیحدگی

آیت : ۱۳ ، ۱٤ ، ۱٥ ، ۱٦ :

﴿نحن نقص علیک نباهم بالحق انهم فتیة اٰمنوا بربهم وزدنٰهم هدیO وربطنا علی قلوبهم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السمٰوٰت والارض لن ندعوا من دونه الٰهًا قلنا اذًا شططًا O هؤلاء قومنا اتخذوا من دونه اٰلهة لولا یاتون علیهم بسلطٰن بین فمن اظلم ممن افتری علی اللّٰه کذبًاO واذ اعتزلتموهم وما یعبدون الا اللّٰه فأوٗا الی الکهف ینشر لکم ربکم من رحمته ویهیء لکم من امرکم مرفقًا O﴾ .

ربط : گزشتہ آیات میں اصحابِ کہف کا اجمالی قصہ بیان فرمایا، اب ان آیتوں میں کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے، تاکہ اہلِ صبر واستقامت اور رہ روانِ منزلِ آخرت کے لیے مشعلِ ہدایت بنے۔

قصہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: زمانۂ اصحابِ کہف، اصحابِ کہف کا اصرار علی التوحید، اپنی قوم کو عبادتِ اصنام پر ندامت دلانا، اپنی قوم سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ کہف میں اُن کے حالات، مکانِ کہف، قدرت، لطف وعنایتِ خداوندی، ۳۰۹ر سال کے بعد صحیح حالت میں بیداری، شرائے طعام میں وکالت، لوگوں کا ان کے حال پر مطلع ہونا، لوگوں کی اُن کے بارے میں مختلف آراء، تعدادِ اصحابِ کہف، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو ارشاد

وتعلیم ؛ کہ مستقبل کی کسی بھی خبر کو مشیئتِ باری تعالیٰ کے ساتھ معلق کیا جائے، اصحابِ کہف کی مدتِ لُبث فی الکہف۔

☆......مفرداتِ لغویه......☆

بالحق : محذوف سے متعلق ہوکر نبأٌ کا حال ہے، أي : متلبّسًا بالحق .

فتية : جمع تکسیر وجمع قلت ہے " فتًى " کی۔ نیز اس کا تثنیہ فتیان وفتوان . اور مزید جمع :فِتیانٌ وفُتُوٌّ وفُتِيٌّ ہے۔ اور مؤنث کے لیے : فتاة واحد، ج: فتياتٌ ہے۔ معنی ہے: (۱) جواں مرد (نوجوان/ مراہقت ورُجولت کے درمیان کی عمر)۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿قالوا سمعنا فتىً يذكرهم يقال له ابراهيم﴾۔ (۲) سخی، (۳) بہادر، (۴) خادم: قرآنِ مجید میں ہے: ﴿قال لفتاه اتنا غداء نا﴾۔

اوزانِ جمع قلت: أَفْعِلَةٌ ، أَفْعُلٌ ثم فِعْلَةٌ ☆ كذلک أفعَالٌ جُموعُ قِلَّةٍ

فائده : علمائے تفسیر کے مطابق: اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصلاحِ اعمال واخلاق اور رُشد وہدایت کا زمانہ جوانی ہی کی عمر ہے، بڑھاپے میں پچھلے اعمال واخلاق ایسے پختہ ہوجاتے ہیں کہ کتنا ہی اس کے خلاف حق واضح ہوجائے اُن سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانے والے بیشتر نوجوان ہی لوگ تھے۔

لن ندعوا : فعل مضارع منصوب بلن، صیغہ جمع متکلم۔ آخر کا واوٗ، واوِ جمع نہیں، بلکہ لام کلمہ ہے، مگر چوں کہ واوِ جمع کے مشابہ ہے اس لیے قرآنی رسم الخط میں اس کے بعد الف لکھا جاتا ہے، پڑھا نہیں جاتا۔

جملہ اٰمنوا : فتية کی صفت ہے۔

شططًا : مصدر از باب نصر وضرب . معنیٔ اصلی ہے: حد سے زیادہ دور ہونا۔ اور جو حق بات سے دور ہو اس کو بھی شَطَطٌ کہتے ہیں۔

فأْوُا : فا جزائیہ ہے۔ اور " اِؤُا "فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ از باب ضرب. أوى يأوي اُوِيًّا. ٹھکانہ لینا، اُترنا۔ اور " اِؤُا " کی اصل "اِءْ وِيُوا " ہے، آخر کی ي امر کی وجہ سے گر گئی، پھر پہلے واو کو دوسرے واو کی مناسبت سے ضمہ دے دیا، اور شروع میں ہمزۂ ساکنہ، ہمزۂ متحرکہ کے بعد آیا ہے اس لیے اس کو ماقبل کی حرکت کے موافق ي سے بدل دیا، " اِيوُوا " ہوا۔

مرفقا : اسم آلہ، جمع مرافق : وہ چیز جس کے ذریعے نفع حاصل کیا جائے۔ کہنی کو بھی "مرفق" اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کے سہارے آدمی آرام پاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: مرفقة : تکیہ۔ مرافق الدار : مکان سے فائدہ حاصل کرنے کی جگہیں، جیسے: پرنالہ، بیت الخلاء، دروازہ، راستہ وغیرہ اسبابِ راحت۔

مِرفقًا : امام نافع اور ابن عامر نے " مَرفِقا " بفتح المیم وکسر الفاء پڑھا۔ اور باقون نے " مِرفَقا " بکسر المیم وفتح الفاء پڑھا۔

من أمركم : مرفقًا کا حال بھی ہوسکتا ہے، اور فعل يهيء سے متعلق بھی۔

☆......اعراب......☆

نحن نقص عليک نباهم بالحق انهم فتية اٰمنوا بربهم وزدنٰهم هدى.

نحن ضمیر منفصل مبنی محلِ رفع میں مبتدا، نقص فعل مضارع مرفوع، فاعل نحن برائے تعظیم، علی حرفِ جر، کاف ضمیر محل جر میں متعلق نقص کا، نبأهم مفعول بہ منصوب، هم ضمیر مضاف الیہ، بالحق جار مجرور متعلق بحال فاعل یا مفعول، إنهم حرفِ مشبہ بالفعل، هم ضمیر محل نصب میں إن کا اسم، فتية خبر مرفوع، آمنوا فعل بافاعل، بربهم جار مجرور متعلق آمنوا کا، هم مضاف الیہ، و عاطفہ زدناهم فعل بافاعل، هم ضمیر مفعول بہ اول، هدى مفعول بہ ثانی منصوب، علامتِ نصب فتحۂ مقدرہ علی الألف ہے۔

☆......بلاغت......☆

﴿انهم فتية آمنوا﴾ جملہ استینافیہ ہے۔ التفات من التكلم إلى الغيبة ہے۔

﴿وربطنا على قلوبهم﴾ استعارة تبعية ؛ لأن الربط هو الشد ، والمراد شددنا على قلوبهم كما تشد الأوعية بالأوكية . ربط باندھنے کے معنی میں ہے، مراد ہے: ہم نے اُن کے قلوب کو مضبوط کیا، باندھ دیا، جیسا کہ برتن کو بندھن سے مضبوط کر دیا جاتا ہے۔ اس جملہ میں لفظِ مستعار فعل "ربطنا"، فعل ہے، بمعنی "شددنا"۔

استعارہ تبعیہ: وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار فعل ہو، یا اسم مشتق، یا حرف ہو۔

﴿إذ قاموا فقالوا﴾ میں جناسِ ناقص ہے۔ یعنی "قاموا، قالوا" دونوں لفظوں میں نوعیتِ حروف مختلف ہیں۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......اس سورت میں جو "سات جواں مردوں کا قصہ" مذکور ہے، اس میں نوجوان عنصر کے لیے خصوصی پیغام ہے، جو ہر زمانے میں کام دے سکتا ہے، اور صرف دل ودماغ پر نہیں، بلکہ صلاحیتوں، حوصلوں اور عزائم پر بھی ایک تازیانہ کا کام دے سکتا ہے، کبھی شبنم ٹپکاتا ہے، کبھی پھول کی جھڑیاں لگاتا ہے، الغرض قصۂ اصحابِ کہف ہر دور کے نوجوانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ اور آئیڈیل ہے۔

☆......کفر وشرک کی گھٹاٹوپ تاریکی، نسل پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، ظاہر پرستی، اور انسانیت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا توحید کی اصل اساس وبنیاد، اور سچی خدا پرستی ہے۔

☆......کسی قوم اور معاشرہ وسماج میں کوئی ترقی وتعمیری کام کرنے، اور حالات سازگار بنانے کے لیے نوخیز اور جواں سال عمر والوں کا انتخاب کرنا چاہیے، کہ وہ نئی اور صالح دعوت کو جلد قبول کر لیتے ہیں، کیوں کہ سن رسیدہ اور پختہ کار لوگوں کے پاؤں میں تجربات، مفادات، رسم ورواج اور خوف واُمید کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، اور اُن کو کسی نئے

تجربے اور انقلابی قدم سے باز رکھتی ہیں۔ چنانچہ قریش اور مکہ کے اکثر بوڑھے سردار بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف اور دشمن تھے۔

☆......عموماً تمام مسلمانوں کو، اور خصوصاً نوجوانوں کو چاہیے کہ دین وایمان کے سلسلے میں اُن پر کیسے بھی حالات آجائیں، دِین وایمان سے رُوگردانی نہیں کرنی چاہیے، اور ناموافق ونامساعد حالات میں بھی، ان سات جواں مردوں کی طرح اپنے دل ودماغ، حوصلوں اور عزم وارادہ کو بھی جوان رکھنا چاہیے، تاکہ بروقت صحیح ومناسب فیصلہ لیا جاسکے۔ اور ایمان پر استقامت کی دولت نصیب ہوسکے۔

☆......خدا پرستی اور اصلاحِ حال کی صحیح دعوت وتبلیغ کرنے والے، اور اُس کو ماننے والے ابتدا میں ہمیشہ سے تھوڑے ہی ہوئے ہیں، اس لیے امت کی اصلاح اور دعوت وتبلیغ میں قلتِ افراد کا شکوہ نہیں ہونا چاہیے۔ جب بھی کسی اہم اِقدام کا ارادہ کرلے، تو سب سے پہلے خدا کو اپنا کارساز یقین کرکے اُس سے دعا کرے اور رحمت ومدد مانگے۔

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے! ☆ پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے!

☆......صرف زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام ایمان نہیں، بلکہ اعضاء وجوارح سے اس پر عمل کرنا حقیقی ایمان ہے۔ ﴿قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا﴾ . (الحجرات: ۱۴)

☆......ہماری پرورش کا ذمہ دار، اور ہمارا رازق وہ خدا ہے، جو آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار ہے، دنیوی حکومتیں، ملازمتیں معیشتیں، اقتصادیات ومصنوعات ہماری قسمت وروزی کی مالک نہیں، بلکہ مالک صرف اللہ ہے، اس لیے چند روزہ راحت، عیش وعشرت والی، اور خوش حال وفارغ البال زندگی گزارنے کے لیے حکومتوں اور غیروں کا حاشیہ بردار ہوکر رہنا، اُن کی رکاب میں چلنا، اُن کی ہاں میں ہاں ملانا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

☆......کسی حکومت اور قلمرو میں اچھی زندگی گزارنے کے لیے اس حکومت کے باطل عقیدے کو اختیار کرنا، اس کے غلط نظریات پر سکوت وخاموشی اختیار کرنا، یہ حقیقت پسندی

وخدا پسندی نہیں، بلکہ مصنوعیت پسندی وخود پسندی ہے۔

☆......مسلمانوں (خصوصاً جن کو دینی حمیت وغیرت کی بنا پر حوالۂ زنداں کیا گیا) کو ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ اگر برے حالات میں ایمان واسلام پر استقامت کے نتیجے میں، حکومتوں، ظالموں کی طرف سے، دینِ اسلام سے پھرنے، یا اس کے خلاف کوئی گھناؤنی سازش کروانے کے لیے ترہیبات وترغیبات کا سہارا لیا جائے، کوڑوں یا توڑوں کی طاقت بتائی جائے، تو صبر وتحمل اور قربانی واِیثار کا مظاہرہ کریں، اللہ پاک اِن حالات میں دل کو قوت وسکون اور طمانیت کی دولت نصیب فرمائیں گے۔

☆......اگر کسی شہر، یا ملک میں رہ کر اللہ کی عبادت نہ ہوسکتی ہو، تو اس کو چھوڑ کر دُور دراز علاقوں میں سکونت اختیار کرنا، اور شرکیہ وکفریہ مقامات سے ہجرت کرنا، اور ایسے علاقوں میں پناہ لینا جہاں عبادت صحیح طریقہ سے کی جاسکے، تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔

☆......آج ہمارا دور ایسی مادی چیزوں سے بھرا ہوا ہے کہ قدم قدم پر ہم کو خدا سے غافل کرنے والی چیزیں ملتی ہیں، اور ہمیں اُن کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر چیز خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کرنے والی ہے، ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات، موبائل فون، حتیٰ کہ خالص ادب جس کو پاک، معصوم اور غیر جانب دار ہونا چاہیے وہ بھی غیر جانب دار نہیں رہا، فسق کا ایجنٹ بنا ہوا ہے، معصیت، سفلی جذبات اور فحش اخلاق کا مشاطہ وایجنٹ بنا ہوا ہے، ایسے خطرناک دریا میں ہمیں ڈال دیا گیا اور نعرہ لگایا جارہا ہے کہ......دامنِ ترمکن ہشیار باش......خبردار بیٹا دامن تر نہ ہونے پائے، تو دامن بچانے کے لیے ہمیں ضرورت ہے ﴿زدناهم هدى﴾ پر غور کرنے کی، جہاں سے ایمان کا چراغ روشن ہوسکتا ہے، دین کی حرارت ومحبت پیدا ہوسکتی ہے، اس کے بغیر ہم ان نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

☆......ترکِ وطن کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حالات سہنے کے بعد جدھر چاہے منہ اُٹھائے ہر شخص الگ الگ راہ پر نہ چل دیں، بلکہ ایک ساتھ جماعتی طریقہ پر اس شہر کو خیر باد کہیں،

۲۸

اپنے دین وعقیدہ کو سینے سے لگائے، اور حرزِ جان بنائے ہوئے، خدا کی رحمت کے طلب گار، اور کشائش وکامیابی اور نصرِ مبین کے منتظر اور امیدوار رہیں۔ یہ وہ مناسب طریقہ اور صحیح راستہ ہے، جو اہلِ ایمان کو ہر اس موقع پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جب زمین ان پر تنگ ہوچکی ہو، سارے دروازے ان کے لیے بند کردیئے جائیں، اور ان کی سب سے قیمتی دولت؛ دین وایمان کے ضائع ہونے کا پورا اندیشہ اور خطرہ ہو۔

☆......ایک مسلمان مہاجر کو جو اپنی سوسائٹی اور ماحول سے بغاوت کرتا، اور آمرانہ حکومت اور مادی طاقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، ہدایت وثابت قدمی کی سب سے زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خائف اور مضطرب دل کو سکون اور قوت عطا فرمائے۔

☆......جب کوئی شخص متعفّن ونجس تہذیب، اور اس کے ظالم وبدکردار علَم برداروں اور حامیوں سے اپنا رشتہ ختم کرکے، اپنے بے لگام معاشرہ وماحول سے بغاوت کرکے کسی اطمینان بخش جگہ کی طرف ہجرت کرے، تو اس مہاجر اور پناہ گیر کو چاہیے کہ اپنے ساتھ اپنی شریعت وتہذیب (قرآنِ کریم وحدیثِ شریف کی کتب) اپنے ساتھ رکھ لیں، جیسا کہ اصحابِ کہف علومِ نبوت کے آثارِ باقیہ اور صحیفوں کے اوراق اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

☆......سوالات......☆

سوال: آیت نمبر: ۱۰، ۱۱، ۱۲ر میں قصۂ اصحابِ کہف کو اجمالاً بیان کیا، پھر آیت: ۱۳ر سے تفصیلاً بیان کیا جارہا ہے، ایک ساتھ بیان کیوں نہیں کردیا گیا؟ اس کی کیا وجہ؟

جواب: قرآنِ پاک میں بکثرت ایسا ہوا ہے کہ ایک بات پہلے اختصار اور اِجمال کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، اس کے بعد اس کو تفصیل سے بیان فرمایا جاتا ہے، اور موعظت وتذکیر کے لیے یہ اسلوب زیادہ مفید ہوتا ہے۔

سوال: ہدایت کسے کہتے ہیں؟

جواب: الدلالة علی ما یوصل إلی المطلوب . وقد یقال : ھي سلوک طریق یوصل إلی المطلوب. ہدایت وہ راستہ جو انسان کو مطلوب ومقصود تک پہنچادے۔

سوال: ﴿زدناھم ھدی﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے؟

جواب: **عند الاحناف: الإیمان لا یزید ولا ینقص .** ایمان زیادتی ونقصان کو قبول نہیں کرتا ہے۔

عند المالکیة : الإیمان یزید ولکن لا ینقص ، ویزید بالطاعات. ایمان میں زیادتی تو ہوتی ہے، لیکن کمی نہیں ہوتی، اور طاعات سے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

عند جمھور المحدثین : الإیمان یزید وینقص ، ویزید بالطاعات وینقص بالمعاصي. ایمان میں زیادتی ہوتی ہے طاعات کے ساتھ، اور کمی ہوتی ہے گناہوں کے ساتھ۔

خلاصہ یہ کہ یہ نزاع واختلاف حقیقی نہیں، بلکہ محض لفظی ہے، نتائج کے اعتبار سے سب اہل سنت والجماعت متفق ہیں، زیادہ چوں وچرا کی حاجت نہیں۔

جہاں جہاں ایمان میں زیادتی کا ذکر ہے اس سے مراد ایمان کی قوت میں پختگی، ایمان کی تازگی، ایمان کے اندر درجات میں اضافہ، اس اعتبار سے ایمان بے شک زیادتی کو قبول کرتا ہے، حقیقت ماہیت ایمانی نہیں، بلکہ ایمان کے بعد اس کی تصدیق اور تعیین کے درجات بڑھتے رہتے ہیں۔

سوال: مقامِ اصحابِ کہف کہاں واقع ہے؟

جواب: اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) اُندلس کے شہر؛ غرناطہ کے ایک گاؤں ''لوشہ'' میں۔ لیکن اندلسی مفسر علامہ قرطبی، اور ابن عطیہ نے خود مشاہدے کے باوجود اس کا جزم نہیں کیا۔ البتہ علامہ ابوحیان اندلسی کے نزدیک اصحابِ کہف کا اُندلس میں ہونا راجح ہے۔

(۲) حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اور مولانا ابوالکلام

آزاد نے کہا کہ فلسطین میں ''ایلہ/عقبہ'' کے قریب شہر ''پٹرا/ بطرا'' ہے، جس کا پرانا نام رقیم/ راقمہ ہے۔ لیکن محققین آثارِ قدیمہ کو اس میں تأمل ہے۔

(۳) عام مفسرین نے اصحابِ کہف کی جگہ شہر ''افسوس'' کو قرار دیا ہے، جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر تھا، جس کے کھنڈر اب بھی موجودہ ترکی کے شہر ''ازمیر'' (سمرنا) سے ۲۰، ۲۵/میل بجانبِ جنوب پائے جاتے ہیں۔ علامہ تھانوی کا رجحان بھی یہی ہے۔

(۴) مملکتِ اُردن میں عمان کے قریب اصحابِ کہف کی جگہ ہے۔

(۵) درحقیقت تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہوتے ہیں، جہاں سے چلے تھے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے، اور نہ اس کی تعیین کسی یقینی ذریعہ سے کی جاتی ہے۔

فائدہ: ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ اصحابِ کہف اعوانِ مہدی (حضرت مہدی علیہ السلام کے مددگاروں میں سے) ہیں۔ لیکن علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس سند کو ضعیف قرار دیا۔ اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس کو مرفوع کہا ہے۔

لیکن علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ سند ثابت ہو بھی جائے، تو پھر قول ابن عباس کو محمول کیا جائے گا کہ اس بات پر کہ وہ لوگ مرے نہیں، بلکہ حضرت مہدی کے آنے تک نوم کی حالت میں رہیں گے، اور آپ کی آمد کے بعد اُنہیں آپ کی اعانت کے لیے بیدار کیا کردیا جائے گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ '' **أنھم یحجون مع عیسی ابن مریم** ''، لیکن علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں فرمایا: '' **سند واہٍ** ''۔

سوال: ہجرت کسے کہتے ہیں؟

جواب: **لغةً** ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلے جانا۔ اور اصطلاح میں دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کا نام ہجرت ہے۔ اور اگر یہ اعلائے کلمة اللہ، اور عبادتِ

خداوندی کے لیے ہو،تو شرعی ہجرت ہے۔

علامہ جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' **الهجرة : هي ترك الوطن الذي بين الكفار ، والانتقال إلى دار الإسلام** '' . ہجرت کہتے ہیں دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کو۔

سوال: اکثر علمائے متقدمین اور بعض متأخرین نے ہجرت کی تعریف'' **الخروج من دار الكفر إلى دار الإسلام** ''. (دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف نکلنا) اِن الفاظ میں کی ہے،معاصر علمائے کرام کی کیارائے ہے؟

جواب: بعض معاصر علماء اور معاجم نے حالات کے پیشِ نظر اس میں کچھ ردوبدل کیا ہے،مثلاً محمد متولی شعراوی نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے:'' **الهجرة هي الانتقال من دار الظلم إلى دار العدل ضررا بالدين** ''۔(اپنے دین کے تحفظ کی خاطر دارالظلم سے دارالعدل کی طرف منتقل ہونا۔

مجمع اللغة العربية نامی مصری ادارے نے،**معجم ألفاظ القران** کے حوالے سے، ہجرت کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے:'' **الهجرة انتقال المؤمن من بلد الفتنة والخوف على دينه إلى حيث يأمن على دينه**''۔ یعنی ہجرت کہتے ہیں؛ مؤمن کا کسی ایسے ملک سے نقلِ مکانی اور ترکِ وطن کرنا،جہاں اسے اپنے دین کے بارے میں خدشہ اور خطرہ ہو،اور ایسے ملک میں سکونت اختیار کرنا،جہاں اس کو اپنے دین کا تحفظ فراہم ہو۔

سوال: دارالظلم اور دارالعدل کسے کہتے ہیں؟

جواب: دارالظلم ؛اس ملک کو کہتے ہیں جہاں ظلم اور سرکشی کا دور دورہ ہو،دین پر عمل کرنے پر پابندی ہو،مسلمانوں پر سختی ہو،ستایا جارہا ہو،اگر چہ وہ اسلامی ممالک ہی کیوں نہ ہوں، بعض حضرات نے اسے دارالبغی بھی کہا ہے۔جیسا کہ ڈکتور وہبہ زُحیلی تحریر فرماتے ہیں: ''**دار الظلم فهي الدار التي ينتشر فيها الجور والطغيان والعدوان ، ولو كانت بلاد**

إسلام وهناك من يطلق عليها دار البغي .

دارالعدل ؛ ایسی مملکت کو کہتے ہیں جس میں تمام رعایا؛ یعنی ملک میں بسنے والے تمام مذاہب کے افراد کے ساتھ انصاف و مساوات کا سلوک کیا جاتا ہو،اگر چہ وہ غیر اسلامی ملک ہوں۔'' **دار العدل فهي الدار التي يعامل فيها جميع رعايا بالمساواة ولو كانت دار كفر** '' .

سوال: فی الحال اَراکان (برما)، ملک شام، یمن، وغیرہ کے علاقوں سے جو لوگ ہجرت کر کے دیگر مسلم یا غیر مسلم ممالک میں پناہ گزیں ہو رہے ہیں، کیا وہ اسی سنتِ ہجرت پر عمل کر رہے ہیں؟

جواب: مقاصدِ خمسہ؛ حفاظتِ دین، حفاظتِ نفس، حفاظتِ نسل، حفاظتِ عقل اور حفاظتِ مال کی رعایت شریعت میں فرض ہے، بعض علماء نے حفاظتِ نفس کو حفاظتِ دین پر مقدم کیا ہے، اس لیے کہ جب تک نفس کی حفاظت نہ ہو، دین کی حفاظت کیسے ہوسکتی ہے، اس لیے فی الحال جن جن مقامات سے مسلمان ہجرت کر کے یورپی یا اسلامی ممالک میں پناہ گزیں ہو رہے ہیں، حفاظتِ دِین اُن کے پیشِ نظر ہے، تو اُنہیں بھی اِن شاء اللہ مسنون ہجرت پر عمل کا ثواب ملے گا۔

سوال: موجودہ دور میں ہجرت کے سلسلے میں اصولی بات کیا ہے؟

جواب: ہجرت کا حکم احوال کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے، کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے: ''**الحكم يختلف باختلاف أحوال النَّاس** '' .

اس سلسلے میں مسلمانوں کے لیے جو اُصولی بات یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ اسلام اور ایمان کی حفاظت تمام امور پر مقدم ہے، اس لیے اگر ہجرت سے اسلام اور ایمان میں خلل یا نقصان، یا ضیاع کی صورت پیدا ہوتی ہو، تو ہجرت حرام ہوگی۔ اور اگر یہ صورتِ حال نہ ہو، تو وہ کبھی مباح، کبھی مکروہ، کبھی مستحب، اور کبھی واجب ہوگی، اسی لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا

کہ: ''مسلمان کے لیے سب سے افضل قیام وہ ہے، جہاں رہ کر وہ دین کے تمام مُقتضیات کو پورا کرسکتا ہو، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل تابع دار ہوسکتا ہو۔''

سوال: ہندوستان کون سا دار ہے؛ دار الکفر یا دار الاسلام یا کچھ اور؟

جواب: ہندوستان دار العہد و دار الامن ہے۔ یہی ہمارے اکابرین دیوبند کی رائے ہے۔

سوال: قرآنِ کریم میں جب اصحابِ کہف کا قصہ بیان کرہی دیا گیا تو پھر مکمل تفصیل کہ کون تھے؟ کس زمانے میں تھے؟ کیوں بیان نہ کی گئی تاکہ لوگوں کا اختلاف ہی نہ ہوتا؟

جواب: چوں کہ قرآنِ مجید کو بحث وسروکار صرف بصیرتوں وعبرتوں اور اخلاقی اسباق ونتائج سے رہتی ہے، اس لیے وہ تاریخی وجغرافیائی تفصیلات کو اکثر نظر انداز کردیتا ہے، اور اس باب میں احادیثِ صحیح بھی تفصیل سے خاموش ہیں۔ مفسرین قدیم وجدید کی اکثریت نے اسے مسیحی دور کی حکایت قرار دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قصہ کو مجمل رکھا ہے، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تفصیل پر اعتنا کرنا ضروری نہیں سمجھا، تو اس کی تعیین جزم ووُثوق سے کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر احکامِ دین میں سے کسی کا دار ومدار اس کی تفصیل وتعیین پر ہے بھی نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

اصحابِ کہف کے احوال......قدرتِ خداوندی اور لطف وعنایت کا مظہر

کراماتِ اولیاء برحق

آیت : ۱۷، ۱۸:

﴿وترى الشمس إذا طلعت تزاور عن كهفهم ذات اليمين واذا غربت تقرضهم ذات الشمال وهم في فجوة منه ذلک من اٰيٰت اللّٰه من يهد اللّٰه فهو المهتد ومن يضلل فلن تجد له وليًّا مرشدًا O وتحسبهم ايقاظًا وهم رُقود ونقلّبهم ذات اليمين وذات الشمال وكلبهم باسط ذراعيه بالوصيد لو اطلعت عليهم لوليت منهم فرارا ولملئت منهم رعباO﴾ .

ربط : **أم حسبت** میں تمہید قصۂ اصحابِ کہف، **إذ أوى الفتية** میں اجمال قصۂ اصحابِ کہف، اور **نحن نقص عليک نبأهم** سے تفصیل قصۂ اصحابِ کہف کو شروع کیا، اور اب یہ بتارہے ہیں کہ جب اصحابِ کہف آپسی صلاح ومشورہ کے بعد پہاڑی غار میں جابیٹھے، اور تھکے ماندے سوگئے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر خاص عنایت فرمائی، اِن آیتوں میں اُن پر آنے والے تین عجیب وغریب احوال کا بیان ہے، جو اِن حضرات کی کرامت سے بطورِ خرقِ عادت ظاہر ہوئے تھے۔ وہ تین احوال یہ ہیں:

(۱) پہلا حال: **﴿وترى الشمس إذا طلعت الخ﴾**. دھوپ اُن کے جسموں پر نہیں پڑتی تھی۔

(۲) دوسرا حال: **﴿وتحسبهم ايقاظًا وهم رُقود ونقلبهم الخ﴾**. یعنی اُن کے سونے کی حالت عجیب تھی کہ اجسام پر نیند کے آثار وغیرہ نہیں تھے، تاکہ کوئی اُن کو سوتا سمجھ کر اُن پر حملہ نہ کردے۔

(۳) تیسرا حال: **﴿لو اطلعت عليهم لوليت منهم فرارا﴾**. بغرضِ حفاظت اُن پر یہ کیفیت طاری کی گئی تھی کہ دیکھنے والوں پر اُن کی ہیبت طاری ہوجائے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

تزاورُ : اصل میں تتزاور تھا،ایک تا حذف کی گئی۔ از باب تفاعل ،صیغہ واحد مؤنث غائب،جب اس کا صلہ عن آئے تو معنی ہوتے ہیں:انحراف کرنا،رُخ بچانا،سینہ موڑنا،بچ کرنکل جانا،کترا جانا۔

تقرضهم : قال مجاهد : تقرضهم بمعنى تتركهم . وعن ابن عباس : تقرضهم بمعنى تدعهم . وعن مقاتل : تقرضهم بمعنى تتجاوزهم . أصل القرض القطع .

نقلّبهم : قيل : إنهم يقلبون في كل سنة مرة في يوم عاشوراء . وقيل : يقلبون عامًا مرتين . وقيل : كل تسع سنين .

ذاتَ اليمين : میں ذات مُقحم یعنی زائد ہے،زینتِ کلام کے لیے لایا گیا ہے۔

فجوة : اسم ہے: وسیع میدان (علامہ راغب اصفہانی)۔غار کے اندر کشادہ زمین (غریب القرآن مرزا أبوالفضل)۔دو پہاڑوں کے درمیان شگاف اور وسیع زمین۔(قاموس)

المهتد : اصل میں المهتدي تھا،آخر سے ي حذف کردی گئی ہے،اور کسرۂ دال اس کی علامت ہے۔ از باب افتعال،اسم فاعل،صیغہ واحد مذکر۔

أيقاظًا : جمع يَقِظٌ کی۔يقِظٌ از باب سمع، بروزن فَعِلٌ صفتِ مشبہ ہے۔جاگنے والا۔

رُقودٌ : جمع راقد کی۔راقدٌ از باب نصر اسم فاعل۔سونے والا۔

كلب : کتا،بھونکنے والا جانور۔اس کی مؤنث كلبة اور جمع كلاب وأكلب آتی ہے۔اسی سے اكلَب بفتح اللام بھی مشتق ہے،جس کے معنی شدتِ حرص کے ہیں،کہا جاتا ہے: " هو أحرص من كلب " وہ کتے سے زیادہ حریص ہے۔اور " رجل كلب " کے معنی سخت حریص آدمی کے ہیں۔اور کہا جاتا ہے: " دهر كلب " سخت زمانہ۔اور " أرض كلبة " اس زمین کو کہا جاتا ہے جو سیراب نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جائے۔

الوصيد : دہلیز،چوکھٹ۔جمع: وُصُدٌ ہے۔

لو اطّلعت : لو حرفِ شرط برائے امتناع ہے۔ اطّلعت از باب افتعال فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر حاضر۔مصدر اطّلاع ہے۔

لوّليت : شروع میں لام تاکید لو شرطیہ کے جواب میں ہے۔ولّیت از باب تفعیل۔

لمُلِئتَ : لام تاکید لو شرطیہ کے جواب میں ہے۔مُلِئتَ از باب فتح،مصدر ملأ: بھرنا۔

☆......اعراب......☆

تقرضهم محلِ نصب میں ہے، تری کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

يهد الله جملہ تعلیلیہ ہے۔ لا محل لها من الإعراب .

هو المهتدي محل جزم میں جوابِ شرط فا کے ساتھ مقترن ہے۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿في فجوة منه﴾ أي ؛ في فجوة من الكهف .

☆......بلاغت......☆

﴿ذات اليمين﴾ اور ﴿ذات الشمال﴾ میں طباق ہے۔

﴿أيقاظا﴾ اور ﴿رقود﴾ میں طباق ہے۔

﴿وتحسبهم أيقاظا وهم رقود﴾ میں تشبیہ ہے۔بطور اداتِ شبہ افعالِ شک ویقین میں سے فعل حسب ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......جب انسان اللہ پر مکمل یقین واعتماد کرتا ہے،تو اللہ تعالیٰ ہر طرح کے شرور وفتن، اور حاسدین کے حسد سے اُس کی حفاظت فرماتے ہیں۔لہٰذا ہمیں اپنے ایمان کو مستحکم کرنا چاہیے،بصیرت،قوت کے ساتھ ہمارا ایمان اللہ پر اور اس کی صفات پر مستحکم ہونا چاہیے،اگر ہم طالبِ علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ،اور اگر ہم عوامی مسلمان ہیں،تو بھی پوری صداقت

کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہیے۔

☆......اُس سرچشمۂ ہدایت سے ہمارا تعلق ہونا چاہیے جہاں سے ہدایت کا فیضان ہوتا ہے۔یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ کتاب وسنت کے مطالعہ، اسوۂ رسول، صحابہ اور مجاہدینِ اسلام کے حالات سے طاقت حاصل کرتے رہا کریں، جس طرح بیٹری چارج کی جاتی ہے، سیل ختم ہونے پر بدلے جاتے ہیں، ایسے ہی اپنے ایمان کی چارجنگ کرتے رہیں؛ اس لیے کہ زمانہ اتنا ظالم وجابر واقع ہوا ہے، اس کے تقاضے اتنے قاہر ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ میں ایمان کی طاقت نہ ہو، اور وہ نمونے آپ کے سامنے نہ ہوں، جو سیرت کے اندر ہم کو ملتے ہیں، تو ہم زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

☆......" **وکلبھم باسط ذراعیہ** " سے معلوم ہوا کہ صالحین کی مجانست اگر چہ نہ ہو، مجالست ومجاورت بھی غنیمت ہے، کہ حق تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے ساتھ ان کے کتے کا بھی ذکر فرمادیا۔

☆......﴿**وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید**﴾ - اگر کسی کے اوپر کتا حملہ کرے، تو گیارہ (۱۱) مرتبہ یہ آیت پڑھ لے، اِن شاء اللہ اس کے شر سے محفوظ رہے گا۔

اگر راستہ میں کوئی شیر یا کتا حملہ کردے، اور شور مچائے، تو فوراً اس آیتِ کریمہ کو پڑھ لے، اِن شاء اللہ چپ ہوجائے گا۔

☆......سوالات......☆

سوال: کرامات کے سلسلے میں علمائے اہل سنت والجماعت کا موقف کیا ہے؟

جواب: کرامات حق ہیں، اور اہلِ سنت والجماعت کے اصول میں سے ہیں، اصحابِ کہف کے واقعہ سے کراماتِ اولیاء کے برحق ہونے پر استدلال کیا جاسکتا ہے، جو ظاہر ہے۔اس میں کئی کرامتوں کا ذکر ہے، مثلاً: تین سو نو برس تک بغیر کھائے پیئے سوتے رہنا، وسیع غار میں ہر وقت سایے میں رہنا، کسی وقت دھوپ کا نہ آنا، آفتاب کا طلوع وغروب کے

وقت اُن سے کترا جانا، بھوک وپیاس کی تکلیف سے محفوظ رہنا وغیرہ، یہ سب اللہ کی رحمتیں، عنایتیں ہیں، جو خداداد کرامات اولیاء کے صحیح اور درست ہونے پر آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ متواترہ شاہد ہیں۔

سوال: کرامت کی چند مثالیں قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں!

جواب: ☆......کرامتِ قصۂ اصحابِ کہف۔

☆......کرامتِ مریم علیہا السلام بصورت وجودِ رزق در محراب۔

☆......کرامتِ قصۂ اصحابِ غار؛ تین لوگوں پر غار کے منہ کا بند ہوجانا۔الخ

☆......کرامتِ قصۂ جریج؛ جو بنی اسرائیل میں ایک عابد وزاہد بزرگ تھے، اور ان پر زنا کی تہمت لگائی گئی تھی، جس کی برأت شیر خوار بچہ کی زبانی ہوئی تھی۔

☆......اُسید بن حُضیر اور عبّاد بن بِشر رضی اللہ عنہما دربارِ نبوی سے رخصت لے کر نکلے، رات بالکل تاریک تھی، اُن کے ہاتھ میں جو عصا تھا وہ قندیل کی طرح روشن ومنور ہوگیا تھا۔

☆......حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مستجاب الدعا ہونا، خاص طور پر ظالم کے خلاف آپ کی دعا قبول ہوجاتی تھی۔

☆......جب مشرکین مکہ نے حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قید کر رکھا تھا، تو اُن کے پاس بے موسم انگور پائے گئے، جو غیب سے آئے تھے۔

اس کے علاوہ وقتِ حاضر میں اور ماضی قریب میں بھی، امارتِ افغانستان کے مجاہدین مؤمنین کی کرامات کے متعلق متواتر خبریں ثقہ راویوں کے ذریعے موصول شدہ ہیں۔
اور باقاعدہ اس پر ایک کتاب بنام "یہ تیرے پُراسرار بندے" بھی منظرِ عام پر آئی تھی۔

سوال: معجزہ، کرامت اور استدراج میں کیا فرق ہے؟

جواب: ہر ایسا خرقِ عادت فعل جس کا صدور نبی سے ہو، وہ "معجزہ" کہلاتا ہے۔
اور ہر ایسا خرقِ عادت فعل جس کا صدور ولی سے ہو، وہ "کرامت" کہلاتا ہے۔

اور اگر وہ خرقِ عادت فعل کسی فاسق وفاجر یا کافر سے ظاہر ہو، تو وہ ''استدراج'' ہے۔

نیز معجزہ دعویٔ نبوت کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے، اور نبی کے ساتھ مختص ہوتا ہے، جب کہ کرامت ولی کے ساتھ مختص ہے، اور اس میں دعویٔ نبوت ضروری نہیں، اور استدراج صرف فاسق وفاجر یا کافر ہی کے ساتھ خاص ہے۔

سوال: کن حضرات کے اجسام قبر میں محفوظ رہتے ہیں؟

جواب: انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے اجسام قبر میں محفوظ رہتے ہیں، اور بعض لوگوں نے ان حضرات کے ساتھ اور بھی حضرات کو شمار کیا ہے، جن کے اجسام قبر میں محفوظ رہتے ہیں، اور مٹی ان کو نہیں کھاتی، مثلاً ثواب کی خاطر اذان دینے والا، شہید، جس نے کبھی گناہ نہ کیا اور حاملِ قرآن؛ یعنی حفاظِ قرآنِ کریم اور اولیاء کرام وغیرہ۔

سوال: کلبِ اصحابِ کہف کا نام اور تحقیق بتائیں کہ کیا وہ کتا ہی تھا؟

جواب: کلبِ اصحابِ کہف کا نام بقول ابن عباس ''قطمیر''، اور بقول حضرت علی ''ریان'' تھا۔ اور اکثر اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اصحابِ کہف کا کتا، واقعی کتا ہی تھا۔

فائدہ : ☆......بحیثیت حیوانی کلب/کتا؛ گیدڑ، بھیڑیئے اور لومڑی کے خاندان کا جانور ہے، اس کی مشہور ۶۲ رقسمیں ہیں۔ ۱۴ر سے ۲۰ رسال اس کی اوسط عمر ہوتی ہے۔

احکام الحیوان میں ہے: ''کتا بستیوں میں رہنے والا مشہور ومعروف جانور ہے، کتے کی اصلاً دو قسمیں ہیں: اصلی، سلوقی۔ سلوقی ملکِ یمن کے شہر سلوق کی طرف منسوب ہے۔

☆......ہر قسم کا کتا حرام ہے، مگر شکار اور پاسبانی کے لیے اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔

☆......ایک اور پانی کا کتا (کلب الماء) ہوتا ہے، اس کے ہاتھ پیروں کی نسبت لمبے ہوتے ہیں۔ اس کا کھانا بھی عندالاحناف ناجائز ہے، بعض حضرات شوافع اس کی حلت کے قائل ہیں۔

☆......اگر کتے کا دانت کسی بچے کے گلے میں ڈال دیا جائے، تو اس کے دانت آسانی سے نکل جاتے ہیں، نیز اگر کتے کا اگلا دانت اس شخص کے گلے میں لٹکا دیا جائے، جس کو

کتے نے کاٹ لیا ہو، تو ان شاء اللہ اس کے درد میں سکون ہوگا، اگر کوئی شخص اس دانت کو اپنے پاس رکھے، تو اس پر کتے نہ بھونکیں گے۔

کتے سے متعلق ممنوع اُمور: ۱- کتے سے بالکل اس طرح کھیلا جائے، جیسے بلیوں، مرغیوں، کبوتروں سے کھیلتے ہیں، یہ ناجائز ہے، جس کا گھر میں ہونا اس قدر محرومی کا باعث ہے، اس کو گود میں لے کر کھیلنا، تو بہت بڑی محرومی ہے۔

۲- کتے کے خشک جسم کے مس کرنے سے نجاست کا حکم شریعت نے نہیں لگایا، لیکن بلا ضرورتِ معتبرہ عندالشرع مسّ کرنا ممنوع ہے۔

۳- الكلب إذا خرج من الماء وانتفض فأصاب ثوب انسان أفسده .

اس سے معلوم ہوا کہ کتے کا گیلا جسم جب کہ وہ پانی میں غوطہ لگا کر نکلے، جس چیز کو لگے گا وہ چیز ناپاک ہوجائے گی۔ وهو اختيار أكثر من المشائخ . مسّ کی ممانعت مستقل ہے۔

۴- کتے کا لعابِ دہن بالاتفاق نجس ہے، جو حکم پاخانہ پیشاب کا ہے وہی لعاب کا ہے۔

۵- جسم گیلا ہونے کی صورت میں مسّ کروانے والے کا جسم یا کپڑا جس کو بھی اس کی تری لگی ہو، وہ ناپاک ہے، اس سے نماز درست نہیں، جسم اور کپڑا پاک کرنے کے بعد نماز درست ہے۔ كما مر في الجواب الثالث . ناپاک ہاتھ یا ناپاک کپڑا قرآن مجید کو لگانا بھی جائز نہیں۔

۶- خشکی کی حالت میں اشیاء ناپاک نہ ہوں گی، تری کی حالت میں ناپاک ہوجائیں گی لعابِ دہن لگنے سے ناپاک ہوجانا قطعی ہے۔ برکات ملائکہ سے محرومی ہر حال میں ہے۔

کتے جیسی نجس اور ذلیل چیز کو کرسی وغیرہ پر بٹھا کر اعزاز کرنا، ناجائز ہے، نیز یہ اہلِ اسلام کا طریقہ نہیں بلکہ انگریزوں یا دوسرے کفار کا طریقہ ہے، ان کے ساتھ تشبُّہ ناجائز ہے۔

سوال: کیا شوقیہ کتا پالنا درست ہے، جیسا کہ آج کل مغربی تہذیب کے دل دادہ حضرات اپنے گھروں میں شوقیہ کتے پالتے ہیں، اور بچوں کی طرح اُن کی حفاظت ونگہداشت کرتے ہیں؟

جواب: حدیث شریف میں ہے: عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه ، عن النبي ﷺ قال :" لا تدخل الملائكة بيتًا فيه صورة ولا كلب " .

وفي بذل المجهود : والمرا منه ما يحرم اقتنائه ، وأما ما لا يحرم من كلب الصيد والزرع والماشية فلا يمنع دخول الملائكة ، وقال : الأظهر أنه عام في كل كلب وانهم يمنعون من الجميع لإطلاق الحديث . اهـ .

اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ شکار یا حفاظتی اغراض کے محض شوقیہ کتا پالنا ممنوع ہے، اور ایسے گھر میں ملائکۂ رحمت داخل نہیں ہوتے۔

سوال: شکاری کتا پالنا اور اس کی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟

جواب: اگر کتا شکاری ہو، یا کھیتی وغیرہ کی حفاظت کے لیے رکھا جائے، تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اور اِس مقصد کے لیے اُس کی خرید وفروخت بھی جائز ہے، اور اگر کتا ان مقاصد کے لیے نہ ہو، تو چوں کہ کتا ایک نجس جانور ہے، اس لیے اس کو گھر میں رکھنا، اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا، اس کو اپنے ساتھ گھمانا پھرانا، جیسا کہ مغرب زدہ طبقے میں رائج ہے، شرعاً ممنوع ہے، اور اس مقصد کے لیے کتے کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہے، اِس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

سوال: ڈوگ بریڈنگ(Dog Breeding) کا طریقۂ کار اور اُس کے بزنس کا شرعی حکم بتائیں!؟

جواب: آج کل بہت سے لوگ مویشیوں کی افزائشِ نسل یا پولٹری فارم کی طرح ڈوگ بریڈنگ(Dog Breeding) یعنی کتوں کی افزائشِ نسل کا بزنس کر رہے ہیں، اور یہ بزنس بہت منافع بخش ہے، جس میں واچ ڈوگ(Wath Dog) یعنی گھر، کھیت اور جائداد وغیرہ کی حفاظت کرنے والا کتا، شوڈوگ(Show Dog) یعنی وہ کتا جو صرف تفریح کے لیے پالا اور بیچا جاتا ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ کتے کی

بیع (خرید وفروخت) فی نفسہٖ جائز ہے، اور اس سے حاصل شدہ آمدنی بھی حلال ہے، البتہ اس بزنس کو مستقل پیشہ بنالینا مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ......جس چیز کا صحیح اِدراک نہیں اُسے اللہ کے حوالہ کیا جائے......اکل وشرب وغیرہ میں حلال وحرام کا پاس ولحاظ کل کے جلاوطن آج کے ہیرو!

آیت : ۱۹، ۲۰ :

﴿وكذلك بعثنٰهم ليتساء لوا بينهم قال قائل منهم كم لبثتم قالوا لبثنا يوما او بعض يوم قالوا ربكم اعلم بما لبثتم فابعثوا احدكم بورقكم هذه الى المدينة فلينظر ايها ازكى طعاما فليأتكم برزق منه وليتلطّف ولا يشعرن بكم احدا O انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم في ملتهم ولن تفلحوا اذًا ابداO﴾ .

ربط : اس جگہ دو واقعوں کی باہم تشبیہ بیان کرن مقصود ہے، ایک واقعہ اصحابِ کہف کی نومِ طویل اور زمانۂ دراز تک سوتے رہنے کا ہے، جس کا تذکرہ گزشتہ آیات میں ہوا، اور دوسرا واقعہ زمانۂ دراز کی نیند کے بعد صحیح سالم اور باوجود غذا نہ پہنچنے کے قوی اور تن درست اُٹھنے اور بیدار ہونے کا ہے، یہ دونوں واقعات اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت ہونے میں متماثل ہیں، اسی لیے لفظ " کذلک " سے اشارہ کر دیا کہ جس طرح اُن کی نیند عام انسانوں کی عادی نیند کی طرح نہیں تھی، اسی طرح اُن کی بیداری بھی عام عادتِ طبعی سے ممتاز تھی۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

ليتساء لوا : از باب تفاعل، فعل مضارع، صیغہ جمع مذکر غائب، آپس میں پوچھ پاچھ

کرنا۔ لیتساء لوا میں لامِ عاقبت یا لامِ صیرورت ہے؛ یعنی انجام کار ان لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہوجائے کہ سینکڑوں برس سوتے رہنے کے باوجود صحت مند ہونے کی حالت میں بیدار ہونا قدرتِ کاملہ کی نشانی ہے۔ لامِ تعلیل نہیں ہے، اس لیے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنا یہ اُن کو بیدار کرنے کی علت نہیں ہے۔

کم لبثتم : کی تمیز محذوف ہے، أي : کم مدةً۔

بورقکم : الورِق : اسم جنس ہے، چاندی کا سکہ، یا مطلق چاندی۔

وَرِق : اکثر قرا کے نزدیک رائے مکسورہ کے ساتھ ہے، اور ابوعمرو، حمزہ اور ابوبکر کی قرأت میں وَرْق رائے ساکنہ کے ساتھ ہے۔

أیها : کی ضمیر کا مرجع " الأطعمة " ہے جو باہمی گفتگو کے وقت معہود ذہنی ہے۔

ازکی : اسم تفضیل از باب نصر، مصدر زکاة ہے۔ زیادہ پاکیزہ۔

فائدہ: ازکی بمعنی اطیب ولذیذ، یعنی طعامِ لذیذ ولطیف کھاوے، مصلحت یہ تھی کہ مدتِ دراز سے کھانا نہ کھایا تھا، تو طعامِ غیر لطیف وغیر لذیذ مضر ہوسکتا تھا، اسی طرح بعض مصالحِ دینیہ کی وجہ سے بھی طعامِ لطیف ولذیذ اور لباسِ لطیف کو استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ شیخ عبدالقادر گیلانی رحمہ اللہ کیا کرتے تھے۔

ایک قول کے موافق أزکی طعامًا سے چاول مراد ہیں، کیوں کہ یہ پک کر زیادہ ہوجاتے ہیں، ایک سیر سے پانچ سیر ہوجاتے ہیں؛ یعنی برکت مراد ہے۔

طعامًا : جمع أطعمة، معنی: کھانا۔ بربنائے تمیز منصوب ہے۔

ولیتلطَّف : خوش تدبیری وحسن تدبیر سے کام لینا۔ از باب تفعیل فعل امر، صیغہ واحد مذکر غائب، مصدر تلطُّفٌ ہے۔ شروع میں واوٴ حرفِ عطف ہے، اس کے بعد لامِ ساکن؛ لامِ امر ہے، جو شروع میں واوِ عاطفہ کے آنے کی وجہ سے ساکن ہوگیا۔

فائدہ : حروف کی تعداد کے اعتبار سے کلمہ ﴿ولیتلطَّف﴾ کے حرف "تا"

تک قرآنِ پاک کا نصفِ اول پورا ہوتا ہے۔ اور درمیانی "لام" سے نصفِ ثانی شروع ہوتا ہے، اسی وجہ سے مصاحف میں عام طور پر اس کلمہ کو قدرے جلی لکھا جاتا ہے۔

فائدہ : تلطُّف یعنی بائع (فروخت کرنے والے) کے ساتھ حسنِ اخلاق ونرمی سے پیش آئے۔ اس میں لطف وحسنِ معاملہ کا درس ملتا ہے۔

ولا یشعرن : خبر نہ ہونے دے۔ از باب افعال فعل نہی بانون تاکید ثقیلہ، صیغہ واحد مذکر غائب۔ مصدر إشعار ہے؛ خبر دینا، جتلانا، بتلا دینا۔

إن یظهروا : از باب فتح فعل مضارع معروف، صیغہ جمع مذکر غائب۔ مطلع ہونا، خبر پانا۔ اِن شرطیہ کی وجہ سے حالتِ جزم میں نونِ جمع ساقط ہوگیا ہے۔

أبدًا : کا ترجمہ کلامِ مثبت میں "ہمیشہ" ہوتا ہے، جیسے " ماکثین فیه أبدا" (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔ اور کلامِ منفی میں "کبھی بھی"، "قطعًا"، "ہرگز" ہوتا ہے، جیسے: " واللّٰه لا أکلمک أبدًا " (بخدا میں آپ سے کبھی بھی نہ بولوں گا، یا ہرگز نہ بولوں گا)۔

☆......اعراب......☆

فلینظر ایها ازکی طعاما فلیأتکم برزق منه ولیتلطَّف .

فا عاطفہ، أیها اسم موصول مبنی علی الضم محل نصب میں مفعول بہ، ها ضمیر محل جر میں مضاف الیہ، أزکی خبر مرفوع مبتدا محذوف هو کی، علامتِ رفع ضمۂ مقدرہ، طعاما تمیز منصوب، فا عاطفہ، لیأتکم مضارع مجزوم هو ضمیر فاعل، علامتِ جزم حرفِ علت، کم ضمیر مفعول بہ، برزق جار مجرور متعلق یأتکم، منه متعلق رزق موصوف کی صفت سے، و عاطفہ، لیتلطف ینظر کی طرح ہے۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿بورقکم هذه﴾ ورق مؤنث سماعی، اس لیے اس کا اسم اشارہ مؤنث ہے۔

﴿أیها ازکی﴾ میں " ها " کی مراد میں تین احتمال ہیں:

(۱) " أيها " المأكل : بھوک دور کرنے، پیٹ بھرنے یا تغذیہ کے لیے جو چیزیں بھی استعمال کی جائیں۔ " أكل " میں طعام، اناج، پھل یا گوشت کی تخصیص نہیں ہوتی۔ اگر تخصیص نہ کی جائے، تو اکل سے عموماً گوشت روٹی مراد ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ اچھی یا سستی قابلِ خورد ونوش اور حلال چیزیں جس کسی کے یہاں ملے لے آئے۔

(۲) " أيها " أي ؛ الأطعمة : کون سا کھانا۔ طعام سے مراد عموماً اناج کی قسم کی غذا ہوتی ہے۔ یعنی سب سے اچھا یا زیادہ سستا اناج؛ غذا (روٹی گیہوں کی خمیری یا فطیری) جس کسی کے پاس ہو۔

(۳) " أيها " أي ؛ المدينة ، مضاف محذوف۔ تقدیر یہ ہے: أي أهل المدينة . یعنی اپنے میں سے کسی کو شہر بھیجیں، اہلِ شہر میں سے کسی شہری کے یہاں اچھا اور سستا کھانا ملے گا۔

☆......﴿برزق منه﴾ میں منه کی ضمیر میں تین احتمال ہیں:

(۱) " منه " أي ؛ من الطعام – من الأكل . کچھ روٹی اور خوردنی شے میں میں سی کچھ۔

(۲) " منه " أي ؛ من الورق . ان سکوں کے بدل یعنی یہ رقم دے کر۔

(۳) " منه " أي ؛ من أحدٍ من أهل المدينة . اچھا کھانا فروخت کرنے والوں میں سے کسی ایک کے یہاں سے۔

☆......بلاغت......☆

فابعثوا أحدكم : أي اتركوا ما ليس بضروري ، فأتوا ما هو ضروري .
یعنی کتنی مدت سوئے وغیرہ یہ سب باتیں چھوڑو، اور پہلے ضروری چیز کھانے کی فکر کرو۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......أزكى طعامًا سے معلوم ہوا کہ ذبیحہ مسلمان سے خریدے، کافر سے نہیں۔ (آیت میں اہلِ کتاب سے خریدنے کی طرف اشارہ ہے، کہ مشرک اور اہلِ کتاب دونوں گوشت فروخت کرتے تھے)۔

☆......مسلمانوں کو ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال وحرام کا خیال رکھنا چاہیے، اور جس شہر میں یا جس بازار میں یا جس ہوٹل میں زیادہ تر حرام کھانے ہوں، وہاں تحقیق کے بغیر کھانا جائز نہیں، اسی طرح جو اقوام پاکی وناپاکی کی تمیز نہیں رکھتیں، بلکہ بعض جانوروں کے پیشاب کو تبرک سمجھتی ہیں، اُن کے کھانوں سے احتراز اَولیٰ ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کے مشہور یوگ گُرو "بابا رام دیو" کی "پتّنجلی" کمپنی کی مصنوعات کی خرید وفروخت سے احتراز اَولیٰ ہے، کہ ان میں گاؤمُتر (پیشاب) کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح عروس البلاد شہر بمبئی کی نوخیز کمپنی "گاؤ پیتھی" جو جانوروں کے پیشاب، پاخانہ وغیرہ ناپاک چیزوں کی مصنوعات تیار کر رہی ہے۔

☆......اسلام دشمن عناصر کے درمیان رہتے ہوئے مسلمانوں کو نہایت درجہ احتیاط برتنا چاہیے، اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی جاسوسی کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ اگر کوئی کسی وجہ سے دشمن کے نرغے میں پھنس بھی جائے، تو دیگر ساتھیوں کا اَتا پتا ہرگز نہ بتائے۔

☆......دین کی خاطر اگر قتل بھی کر دیا جائے، تو عین خدمتِ دین ہے، لیکن اگر جبر واِکراہ سے گھر واپسی کرائی جائے، یعنی مرتد بنا دیا جائے، تو نہ دنیا میں کامیابی ہے نہ آخرت میں، اس لیے کہ دنیا تو چند روزہ ہے، کامیابی کا کوئی اعتبار نہیں، اور آخرت میں اس لیے نہیں کہ وہاں کی کامیابی کے لیے اِیمان شرط ہے۔

☆......مسلمان! دنیا کی فانی زندگی بنانے کی فکر نہ کریں، آخرت کی دائمی زندگی کی فکر کریں، کہ اس کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔

☆......فسادات کے زمانے میں خاص طور پر (آج کل سوشل میڈیا کا زمانۂ فساد ہے، اکثر وبیشتر خبریں غلط اور افواہیں ہوتی ہیں)، کوئی غلط بات، یا غلط خبر نقل یا ارسال کرنے سے حد درجہ احتیاط کریں، ورنہ دشمنوں کو نہتے مسلمانوں پر ظلم کا ایک بہانہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔

☆......" فابعثوا احدكم بورقكم "، میں اشارہ ہے کہ طالبانِ حق کی شان کے لائق

یہ ہے کہ مخلوق سے سوال کرنا ترک کردیں، اور ہمتِ عالی رکھیں، جیسا اصحابِ کہف نے داموں سے کھانا خریدنا تجویز کیا، یہ نہیں کیا کہ کسی سے مانگ لاویں۔

☆......بوقتِ فرار اصحابِ کہف کا چاندی یا چاندی کے سکے اپنے ہمراہ لے جانا، اس امر کی دلیل ہے کہ سفر میں دو چیزوں کا خیال رکھا جائے؛

(۱) شدّ الهميان (جیب خرچ ساتھ لینا)۔

(۲) والتوكل على الرحمن (رحمٰن؛ یعنی خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا)۔

بعض لوگ محض اتفاقات پر بھروسہ کرتے ہوئے، زادِ راہ لیے بغیر سفر میں نکل پڑتے ہیں، اوران کی نظر دوسروں کی جیبوں پر ہوتی ہے۔ یہ توکل علی اللہ کے خلاف ہے۔ ایک عالم کے متعلق منقول ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کی زیارت کے بڑے شائق تھے، اور کہا کرتے تھے: " ما لهذا السفر إلا شيئان : شد الهميان ، والتوكل على الرحمن "(اس سفر میں دو چیزیں ضروری ہیں: جیب میں دام ہوں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو)۔ اللہ پر توکل کرنے والوں کا طریقہ یہی ہونا چاہیے۔

☆......اگر کوئی شخص اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ ہجرت کرے، ریا ونمود مقصود نہ ہو، اور محض اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دین وایمان کو بچانے کے لیے، جلاوطنی اور عزلت اختیار کرے، تو اللہ تعالیٰ اس "کل کے جلاوطن کو آج کا ہیرو" بنا دیتا ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: آیتِ کریمہ: ﴿الا من اكره وقلبه مطمئنٌّ بالايمان﴾ میں جبر واِکراہ کی حالت میں جب زبان سے کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے، تو پھر اصحابِ کہف کو مؤاخذہ اور عدمِ فلاح کا خوف چہ معنی دارد؟

جواب: جبر واِکراہ کی حالت میں اگرچہ زبان سے کلمۂ کفر کہہ لینا جائز ہے، لیکن بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا میں جان بچانے کے لیے بادلِ نخواستہ زبان سے کفریہ کلمہ کہہ لیتا ہے، مگر جب

دن رات کافروں کے ڈر سے کفر کے اقوال واعمال کرنے پڑتے ہیں، تو رفتہ رفتہ دل سے کفر کی کراہت ونفرت کم ہوتی جاتی ہے، بالآخر دِل پر کفر جم جاتا ہے، کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ:" الإنسان ابن البيئة "-انسان ماحول کا بیٹا ہوتا ہے۔ یعنی اُس کا اثر جلد قبول کرلیتا ہے۔

سوال: ﴿فابعثوا احدكم بورقكم﴾ میں أحدكم کی جگہ واحدكم کیوں نہیں کہا، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس لیے کہ انہوں نے کسی ایک کو متعین کر کے نہیں کہا، بلکہ ان میں سے کسی ایک کو بھیجنے کا کہا۔ اگر "واحدكم" کہتے تو اشارہ ہوتا کہ اپنے رئیس اور بڑے کو بھیجو۔ اس لیے کہ اہلِ عرب کسی قوم میں سے کسی فرد کو دیکھ کر کہتے ہیں:"رأيت واحد القوم"(میں نے قوم کا ایک فرد دیکھا)۔ قوم کے رئیس یا کسی بڑے معظم آدمی کو دیکھ کر کہتے ہیں:"رأيت واحد القوم".

سوال: ﴿فابعثوا احدكم بورقكم الخ﴾ سے کون سا مسئلہ فقہیہ مستفاد ہوتا ہے؟

جواب: مسئلہ وکالت في المعاملات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، نیز زمانۂ جاہلیت وزمانۂ اسلام میں بھی وکالت معروف ومشروع تھی، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن ام سلمہ رضی اللہ عنہ کو نکاح کا، عروہ بارقی اور حکیم ابن حزام رضی اللہ عنہما کو شرائے اضحیہ کا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عقیل رضی اللہ عنہ کو معاملہ کا وکیل بنایا تھا۔

سوال: آیتِ مذکورہ سے "مسئلہ نہد" بھی متخرج ہے؟ مثال دے کر سمجھائیں!

جواب: "مشترکہ کھانا خریدنے کا جواز اور تناوُل میں کمی زیادتی" کا مسئلہ متخرج ہوتا ہے، مثلاً: بعض دوست واحباب مل کر مشترکہ طور پر پیسے جمع کر کے ہوٹل میں کھانا تیار کروا کے کھاتے ہیں، اس میں سب کی رقم برابر ہوتی ہے، دسترخوان پر جب مختلف اجناس کا کھانا تیار ہو کر آتا ہے، تو ہر چیز میں ہر ایک برابر شریک ہوتا ہے، لیکن جب کھانا کھایا جاتا ہے، تو اس میں کمی زیادتی ہونا لازمی امر ہے، اس لیے کہ ہر ایک شخص کے کھانے کی مقدار مختلف ہوتی ہے، تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ربوا اور سود کی شکل ہے، کہ بعض احباب زیادہ

اور بعض کم کھاتے ہیں، اُن کی یہ بات درست نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ یہ تفاضُل (کمی بیشی) باہمی رضامندی سے ہوتا ہے، جو جائز ہے، چنانچہ سب احباب نے مل بیٹھ کر کھانا کھایا، تو ہر شخص جتنا کھا رہا ہے وہ اس کا حصہ سمجھا جائے گا، بشرطیکہ تمام شرکاء راضی ہوں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اِس قسم کے اشتِراک کو "نُہُد"[☆] قرار دیا ہے، اور عہدِ رسالت میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تسامُح وتعامُل کے قبیل سے ہے، عہدِ نبوت سے لے کر آج تک اس پر تعامُل ہوتا چلا آ رہا ہے، لہٰذا یہ صورت جائز ہے۔

[☆] "النهد": نفقہ جو شرکاء سفر برابر نکالیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

عرصۂ دراز کے بعد بیدار ہونے کی حکمت......اختلافِ رائے کو کس طرح رفع کیا جائے؟......قصۂ اصحابِ کہف سے عبرت

عمارت برائے عمارت اور عمارت برائے عبادت میں فرق

یادگاروں کے قائم کرنے کا مغربی طریقہ

آیت : ۲۱ : ﴿وكذلك اعثرنا عليهم ليعلموا ان وعد الله حق وان الساعة لا ريب فيها اذ يتنازعون بينهم امرهم فقالوا ابنوا عليهم بنيانا ربهم اعلم بهم قال الذين غلبوا علٰى امرهم لنتخذن عليهم مسجدا○﴾ .

ربط : اس آیت میں اصحابِ کہف کے راز کا اہلِ شہر پر منکشف ہوجانا، اور اس کی حکمت، عقیدۂ آخرت وقیامت، کہ سب مُردے دوبارہ زندہ ہوں گے، اس پر ایمان ویقین حاصل ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔

مختصر واقعہ یہ کہ طویل مدت بعد جب اصحابِ کہف بیدار ہوئے، اس وقت اُن کے شہر میں دقیانوسی کافر سلطنت کے بجائے بیدوسیس، یا بیدرُوس کی مسلم سلطنت تھی، جس میں لوگوں کے درمیان بعث بعد الموت کے بارے میں شدید اختلاف تھا، دین دار بادشاہ اس گروہِ منکرینِ قیامت سے پریشان تھا، اللہ کے سامنے الحاح وزاری کیا کہ کوئی صورت ایسی پیدا فرمادے کہ ان کا عقیدہ درست ہوجائے، اور یہ راہِ راست پر آجائیں، تو اللہ پاک نے اصحابِ کہف کو بیدار کردیا، اور اس طرح اہل شہر کے سامنے قدرتِ الٰہیہ کا واقعہ عجیبہ واشگاف ہوکر آ گیا، تو سب کو یقین ہوگیا کہ بعث بعد الموت بھی یقینی وبرحق ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

أعثرنا : بغیر طلب کے مطلع کرنا، خبر دینا۔ از باب افعال، فعل ماضی معروف، صیغہ جمع متکلم۔

يتنازعون : فعل مضارع جمع مذکر غائب، مصدر تنازع از باب تفاعل، آپس میں

اختلاف کرنا، جھگڑنا۔

غلبوا : فعل ماضی جمع مذکر غائب از باب ضرب، غالب آنا، مصدر **غلبةٌ**۔ اگر **غلبة** کے مصدر کے بعد صلہ علی آتا ہے، تو قابو پانے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اور اگر صلہ لام آتا ہے، تو غالب آنے کا مفہوم ہوتا ہے۔

مسجدًا : اسم ظرف از باب نصر، سجدہ کرنے کی جگہ۔

مضارع مضموم العین ہونے کے باوجود اسم ظرف خلافِ قیاس **مسجِد** بکسر الجیم مستعمل ہے۔ اصل **مسجَد** بفتح الجیم ہے۔

☆......اعراب......☆

ابنوا عليهم بنيانا . ابنوا فعل امر مبنی علی حذف النون، وضمیر فاعل، **عليهم** جار مجرور متعلق ابنوا فعل امر کے، بنیانا مفعول بہ منصوب۔

لنتخذن عليهم مسجدا . ل لامِ قسم، نتخذن مضارع مبنی علی الفتح محل رفع میں، نون برائے تاکید، **نحن** ضمیر فاعل، **عليهم** جار مجرور متعلق بمحذوف مفعول بہ ثانی، **مسجدا** مفعول بہ اول۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿**أعثرنا عليهم**﴾ **أي ؛ أعثرنا على أصحاب الكهف .**

☆......﴿**ليعلموا**﴾ میں دو احتمال ہیں:

(۱) " **ليعلموا** " **أي ؛ ليعلموا أهل المدينة ، ليعلموا الناس .** یعنی اہلِ شہر اور عامۃ الناس جو لوگ اس وقت وہاں موجود تھے وہ جان لیں کہ وعدۂ خداوندی برحق ہے۔

☆......﴿**يتنازعون**﴾ **أي ؛ المتنازعون .**

☆......﴿**بينهم**﴾ **أي ؛ بين المتنازِعين .**

☆......﴿**أمرهم**﴾ ﴿**عليهم**﴾ ﴿**ربهم**﴾ ﴿**بهم**﴾ **أي ؛ أصحاب الكهف .**

۴۰

☆......﴿**على امرهم**﴾ **أي ؛ على أمر أهل المدينة ، أمرِ الناس .**

☆......﴿**لنتخذن عليهم**﴾ **أي ؛ على أصحاب الكهف .**

(۲) " **ليعلموا** " **أي ؛ أصحاب الكهف .** یعنی اصحابِ کہف خود ان کے حال پر مطلع ہو جائیں کہ ہمارے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بعث بعد الموت کی نشانی ہے۔

﴿**يتنازعون بينهم امرهم**﴾ **أي ؛ يتنازعون أهل المدينة بين الناس أمرهم إياهم .** ان تینوں ضمیروں کا مرجع اہلِ شہر ہیں، مطلب یہ کہ: اہلِ شہر آپس میں اپنی رائے کے بارے میں جھگڑ رہے تھے نہ کہ اصحابِ کہف کے بارے میں۔

اس صورت میں اُمرہم (امر منصوب) سے یہ مراد ہوگی کہ ایک گروہ غار کو پاٹ کر اس پر کوئی یادگار قائم کرنے پر مائل تھا، اور دوسرا اس کو سجدہ گاہ بنانے پر مصر تھا۔

ہوسکتا ہے کہ " **بينهم ، أمرهم** " میں امر سے مراد یعنی دوبارہ زندہ ہونا ہو، مطلب یہ کہ آیا موت کے بعد زندہ ہونا یقینی ہے یا نہیں۔

اس صورت میں وجہ نزاع بعث بعد الموت کا مسئلہ تھا نہ کہ اصحابِ کہف کی تعداد کیا تھی یا یہ کہ ان کا پتہ لگ جانے کے بعد ان کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے گا۔

☆......بلاغت......☆

﴿**يتنازعون بينهم امرهم**﴾ میں استعارہ مکنیہ ہے۔

استعاره مكنيه: وہ استعارہ ہے جس میں مستعار منہ (مشبہ بہ) کے لفظ کو حذف کر دیا ہو، اور مشبہ بہ کے لوازمات میں سے کسی لازم کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہو۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......دینی واسلامی مفاد کو ذاتی مفادات پر مقدم رکھا جائے۔

☆......مداہنت واسلام بیزاری سے پرہیز کریں۔ مداہنت فی الدین والے معاملات میں کافروں کی آراء قبول نہ کی جائیں۔

☆......**الإسلام يعلو و لا يعلى عليه** . اسلام ہر زمانہ میں سربلند وغالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔

☆......قصۂ اصحابِ کہف یعنی اُن کا نومِ طویل سے بیدار ہونا یہ اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق، بعث بعد الموت اور قیامِ قیامت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اثباتِ بعث وقیامت کے اساسی اصول تین ہیں، جو اس میں بیان کیے گئے:

(۱) اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ تمام کلی وجزئی معلومات کو جانتا ہے۔

(۳) ہر وہ چیز جس کا حصول بعض اوقات میں ممکن ہو، تو تمام اوقات میں بدرجۂ اولیٰ ممکن الحصول ہوگا۔

☆......مفسر قرآن حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ اور دیگر فقہائے مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر کسی زمانہ میں مسجد کے بنانے سے بجائے مصالح کے مفاسد کا ظہور ہونے لگے، تو مسجد بنانا، جائز نہ رہے گا۔

☆......﴿**جاء الحق وزهق الباطل**﴾ حق ہمیشہ سربلند ہوتا ہے، اور باطل ختم ہو کر رہتا ہے۔ اگر مسلمان ظلم وستم اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی خاطر برداشت کرلیں، تو ایک دن ضرور تقدیس وتعظیم کا ہالہ ان کے گردم قائم ہوجائے گا، حکومت (حضرت مہدی) کی آغوش بھی ان کے لیے وا ہوگی، اور دنیا والے انہیں سرآنکھوں پر بٹھائیں گے، اور دیدہ ودل ان کے لیے فرشِ راہ کریں گے۔

☆......﴿**ابنوا عليهم بنيانا... لنتخذن عليهم مسجدا**﴾ عمارت برائے عمارت، اور عمارت برائے عبادت میں فرق، اور یادگاروں کے قائم کرنے کا مغربی طریقہ:

جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آکر بیابان اور ٹاپو کی زندگی انہوں نے اختیار کی تھی، اسی شہر کے رہنے والے ان کے لیے یادگار قائم کرنے (میموریل عمارت تعمیر کرنے)

کی کوششوں میں مست ہیں، ایک طبقہ ''عمارت برائے عمارت'' والے اُصول پر مصر ہے، یہی مذاق عام طور پر آج کل یورپ وامریکہ کے باشندوں پر غالب ہے۔ لاکھوں نہیں بل کہ بلا مبالغہ میموریل کی بعض عمارتوں میں کروڑ ہا کروڑ روپے لگادیئے جاتے ہیں، لیکن اس عمارت میں اسی شہر کے غریب کو سر چھپانے کا بھی موقع نہیں مل سکتا، جو موسمِ سرما کی سرد وتاریک راتوں کو کسی فٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اور اسی کے مقابلے میں دوسرا طبقہ ''عمارت برائے عبادت'' والی تجویز پیش کررہا تھا۔ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ثانی الذکر طبقہ کہف والوں کے امر پر غالب تھا، شاید اس کا یہ مطلب ہو کہ کہف والوں کے دین کو صحیح معنوں میں قبول کرکے ان کے معاملے پر غالب آگیا تھا، اور اول الذکر عمارت برائے عمارت نظریہ والے محض قوم کے ہیرو ہونے کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ایک میموریل تعمیر کروانا چاہتے تھے۔ قرآنِ کریم نے ''عمارت برائے عمارت'' کے نظریہ کی بنیاد پر شدید ضرب لگائی گئی۔

☆......سوالات......☆

سوال: آیتِ کریمہ ﴿**لنتخذن عليهم مسجدا**﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ پرستی جائز ہے، قبروں پر مساجد بھی بنائی جاسکتی ہیں؟ جب کہ حدیث پاک قبور پر مساجد بنانے والوں پر لعنت کی گئی ہے '' **لعن الله اليهود اتخذوا قبور انبياء هم مساجدَ**''.

جواب: اس واقعہ سے اتنا معلوم ہوا کہ اولیاء وصلحاء کی قبور کے پاس نماز کے لیے مسجد بنادینا کوئی گناہ نہیں، اور جس حدیث میں قبورِ انبیاء کو مسجد بنانے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنادینا ہے، جو بالاتفاق شرک وحرام ہے۔

نیز حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **عليهم** بمعنی **عندهم** ہے۔ اور مسجد اصحابِ کہف کی نسبت اُس کہف وغار کی طرف ایسے ہی ہے جیسے مسجد نبوی کی نسبت مرقد مبارک کی طرف، مثلاً یوں کہا جاوے: روضہ شریفہ کی مسجد، پس اس میں قبر پرستوں کے لیے کوئی حجت نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

صحیح تعدادِ اصحابِ کہف......اختلافی بحثوں میں گفتگو کے آداب

جس چیز کا علم نہ ہو اس کو اللہ کی طرف سپرد کردینا چاہیے

آیت : ۲۲ :

﴿سیقولون ثلثة رابعهم كلبهم ويقولون خمسة سادسهم كلبهم رجمًا بالغيب ويقولون سبعة وثامنهم كلبهم قل ربي اعلم بعدتهم ما يعلمهم الا قليل فلا تمار فيهم الا مراء ظاهرا ولا تستفت فيهم منهم احدًا O﴾ .

ربط : اصحابِ کہف کے معاملے میں سرسری بحث کی جائے، کافروں کے اعتراض کے جواب میں زیادہ مشغول ہونا، اور اپنے دعوی کے اثبات میں زیادہ کاوش کرنا مناسب نہیں کہ اس بحث کا کوئی خاص فائدہ ہی نہیں ہے۔ محض اٹکل اور ظن وگمان سے بغیر کسی سندِ عقلی یا شرعی کے کام لینا اور چیز ہے، اور دلیلِ شرعی سے حسبِ قواعد استخراجِ نتائج کرنا بالکل اور چیز۔ اول الذکر لغو وممنوع، اور ثانی الذکر جائز ہی نہیں، محمود ومستحسن، بلکہ بعض اوقات ضروری اور واجب ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

رجمًا : مصدر از باب نصر: سنگ سار کرنا، قتل کرنا، بے سوچے سمجھے منہ سے بات نکالنا، لعنت کرنا، برا بھلا کہنا۔ اصل میں رَجْمٌ کا معنی رِجامٌ یعنی پتھروں سے مارنے کے ہیں۔ بقیہ تمام معانی مستعار ہیں۔ یہاں تیسرا معنی (برا بھلا کہنا) مراد ہے۔

رجمًا بالغيب : أي التكلم بغير علم . اٹکل پچو۔ محاورۂ عرب میں اس سے مراد وہی ہوتی ہے جو اُردو میں ''اٹکل کے تکّے چلانے'' سے ہوتی ہے۔

عدتهم : عدةٌ مضاف هم ضمیر مضاف الیہ۔ گنتی، شمار۔ عِدٌّ کی طرح عِدَّةٌ بھی مصدر ہے، اور اس کے معنی جماعت کے بھی آتے ہیں۔ خواہ چھوٹی جماعت ہو یا بڑی۔

۴۲

لا تمار : از باب مفاعلت فعل نہی واحد مذکر حاضر۔ مصدر مُماراةٌ ومِراءٌ ہے؛ کسی ایسی بات میں جھگڑا کرنا جس میں تردّد وشبہ ہو۔

لا تستفت : از باب استفعال فعل نہی صیغہ واحد مذکر حاضر۔ مصدر استفعال، حکم دریافت کرنا، سوال کرنا۔

☆......اعراب......☆

ما يعلمهم الا قليل . ما نافیہ، یعلم مضارع مرفوع، هم ضمیر مفعول بہ، إلا اُداتِ حصر، قلیل یعلمهم کا فاعل مؤخر۔ یعلمهم إلا قليل جملہ استینافیہ بیانیہ ہے۔

رابعهم ، سادسهم ، ثامنهم : بروزن فاعلٌ برائے عدد رتبی۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿سیقولون﴾ أي ؛ سيقولون المتنازعون في عدد أصحاب الكهف .

☆......﴿فلا تمار فيهم﴾ ﴿لا تستفت فيهم﴾ أي ؛ في أصحاب الكهف .

☆......﴿منهم﴾ أي ؛ من أهل الكتاب وغيرهم . یعنی اصحابِ کہف کے بارے میں اہلِ کتاب یا کسی اور سے کچھ مت دریافت کرو۔

☆......بلاغت......☆

☆﴿رابعهم﴾: میں اضافتِ تشریفی ہے، كما في قوله عليه السلام : الله ثالثهما .

☆......﴿سیقولون ثلثة رابعهم كلبهم ويقولون خمسة سادسهم كلبهم رجمًا بالغيب ويقولون سبعة وثامنهم كلبهم﴾......قرآن مجید کی بعض آیات میں ساتویں اور آٹھویں جگہ کے درمیان واوِ عطف استعمال ہوا ہے، علماءِ تفسیر نے اس کا نام ''واو الثمانیۃ'' رکھا ہے، اُن میں سے ایک آیتِ مذکورہ بالا بھی ہے؛ جس میں ساتویں اور آٹھویں کے درمیان واوَ ہے، اس واوَ میں ادبی، اخلاقی اور ذوقی معنی ہیں، ایک طرف ابرار، اطہار، نیکوکار اصحابِ کہف کا تذکرہ ہے، دوسری طرف ان کے کتے کا تذکرہ ہے۔ ایک طرف

اشرف المخلوقات ہیں، دوسری طرف حیوان ہے، اس سے پہلے واؤ کا تذکرہ اس لیے نہ کیا کہ ان کا اندازہ غلط تھا کہ اصحابِ کہف کی تعداد چھ تھی، لہٰذا اس تعداد کو رجما بالغیب کے الفاظ سے باطل کردیا، سات کے بعد واؤ لایا گیا، پھر کتے کا تذکرہ کیا۔

﴿رجما بالغیب﴾ میں استعارہ مکنیہ ہے۔ (اس کی تعریف ماقبل میں گزر چکی)

☆......پیغام واحکام......☆

☆......قرآنِ کریم میں اللہ پاک نے واقعات وقصص کی جو تفصیلات بیان فرمادی ہیں، ان کے علاوہ دیگر باتیں اگر زیر بحث آئیں، تو ان میں بس سرسری گفتگو کی جائے۔

☆......نصِ قطعی کے بغیر کوئی بات قطعیت کے ساتھ بیان نہ کرے۔

☆......اپنے دعوی کے اثبات میں کاوِش کرنا، اور دوسرے کی تردید میں زور صرف کرنا بے کار ہے، وبے فائدہ ہے۔

☆...... یہود ونصاریٰ کی معلومات پر اکتفا مت کیجیے، ان کی معلومات مستند نہیں ہوتیں، نہ ان کی کتابیں محفوظ ہیں۔ اسی طرح اثریات کے ماہرین کی باتوں پر بھی کان نہ دھریئے، وہ ہوا پر محل تعمیر کرتے ہیں۔

☆......اختلافی معاملات میں طویل بحثوں سے اجتناب کیا جائے۔ یہ درحقیقت علمائے امت کے لیے اہم ورہنما اصول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے، تو جس قدر ضروری بات ہے اُس کو واضح کرکے بیان کردیا جائے، اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں اُلجھیں، تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کرکے بحث ختم کردی جائے، کہ مزید بحث وتکرار میں اضاعتِ وقت بھی ہے، اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔ (معارف)

☆......مخاطب سے بغرض تجہیل ورُسوائی کوئی سوال کرنا یا جواب مل جانے کے بعد مزید اُس کی تحقیق وتفتیش میں پڑنا بھی ممنوع ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: آیتِ کریمہ میں صیغہ یقولون تین مرتبہ آیا، لیکن سین صرف پہلے صیغہ میں مستعمل ہے ایسا کیوں؟

جواب: آخر کے دوفعلوں کو بمقتضائے عطف پہلے کے حکم میں مانا گیا ہے، اختصار کے لیے پہلے فعل کے سین پر اکتفا کیا گیا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "زید قد یخرج ویرکب".

سوال: ﴿سیقولون﴾ میں "هم" ضمیر کا مرجع کون؟ یعنی کہنے والے کون لوگ ہیں؟

جواب: اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) وہ لوگ مراد ہیں جن کا باہم اختلاف اصحابِ کہف کے زمانے میں اُن کے نام ونسب وغیرہ کے متعلق ہوا تھا۔

(۲) سیقولون کی ضمیر نصاریٰ نجران کی طرف عائد ہے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی تعداد کے بارے میں مناظرہ کیا تھا۔

سوال: نصاریٰ نجران کے کتنے فرقے تھے، جو اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں باہم مختلف تھے؟ تفصیل بتائیں!

جواب: تین فرقے تھے:

(۱) ملکانیہ: جس نے تین کا عدد بتلایا۔

(۲) یعقوبیہ: جس نے پانچ کا عدد اختیار کیا۔

(۳) نسطوریہ؛ جس نے سات کا عدد بیان کیا تھا۔

اور بعض مفسرین کے قول کے مطابق تیسرا قول مسلمانوں کا تھا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اور قرآن کے اشارے سے تیسرے قول کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے۔

سوال: اصحابِ کہف کی صحیح تعداد کیا ہے؟ بصیرت پر مبنی قول بیان فرمائیں!

جواب: سات اصحابِ کہف تھے، اور آٹھواں اُن کا کتا تھا۔ قرآن پاک میں پہلے دو

قولوں: ﴿ثلثة رابعهم كلبهم﴾ اور ﴿ويقولون خمسة سادسهم كلبهم﴾ کو ﴿رجمًا بالغيب﴾ اٹکل پچو قرار دے کر اُن کی تردید کردی گئی۔ اور تیسرے قول ﴿ويقولون سبعة وثامنهم كلبهم﴾ کی تردید نہیں کی، نیز اسلوبِ بیان بھی بدلا ہوا ہے۔ پہلے دونوں جملوں کے درمیان واوِعطف نہیں لایا گیا، جب کہ تیسرے جملہ میں ﴿وثامنهم﴾ عطف کے ساتھ لایا گیا ہے، گویا اس قول کا قائل بصیرت کے ساتھ گفتگو کررہا ہے۔ واللہ اعلم!

سوال: ﴿وثامنهم كلبهم﴾ میں " و " کے اضافہ کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: (۱) یہ واوِثمانیہ ہے (قرآن مجید کی بعض آیات میں ساتویں اور آٹھویں جگہ کے درمیان واوِعطف استعمال ہوا ہے، علماءِ تفسیر نے اس کا نام "واوالثمانیۃ" رکھا ہے)۔ بقول زجاج: نکرہ کی صفت میں اس واو کا آنا نہ آنا برابر ہے، قرآنِ کریم میں دونوں طرح آیا ہے۔

(۲) بقول زمخشری: یہ وہ واوَ ہے، جو نکرہ کی صفت واقع ہونے والے جملے پر داخل ہوتا ہے۔ اور معرفہ سے حال واقع ہونے والی صفت پر آتا ہے۔ اور صفت کے موصوف کے ساتھ اتصال وتاکید کا فائدہ دیتا ہے، جیسے: ﴿وما اهلكنا من قرية إلا ولها كتاب معلوم﴾ . آیتِ مذکورہ میں یہ واوَ بتاتا ہے کہ آخری قول ثباتِ علم اور طمانینتِ نفس کے ساتھ کہا گیا ہے، محض اٹکل نہیں ہانکا ہے، جیسا کہ دوسروں نے گمان واٹکل سے کام لیا ہے۔

(۳) بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ: واوَ قطع عدد کے لیے واقع ہوا ہے، یعنی اس عدد کے بعد اور کوئی عدد مذکور نہیں، جو پہلے بیان کردہ عدد کی نفی کرتا ہو۔

(۴) بقول امام ثعلبی: یہ واو، واوِحکم اور واوِتحقیق ہے، گویا اصحابِ کہف کی تعداد کے متعلق لوگوں کے اختلاف کو بیان کیا، اور آخری قول میں واوِتحقیق لائے، تو آخری عدد کا ثبوت متحقق ہوگیا۔ (گویا "وثامنهم كلبهم" حقیقۃً یا تقدیرًا اللہ کا کلام ہوسکتا ہے۔

سوال: ﴿وثامنهم كلبهم﴾ کے بعد ﴿قل ربي اعلم بعدتهم﴾ اور ﴿ما يعلمهم

الاقليل﴾ کس بات پر دلالت کرتے ہیں؟

جواب: بقائے ابہام اور التباس کے ختم نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

سوال: یہود کی طرف سے تین سوالات کیے گئے، دو کو صیغہ "یسئلون" سے تعبیر کیا، جیسے: ﴿يسئلونک عن الروح﴾ اور ﴿يسئلونک عن ذي القرنين﴾، اور تیسرے سوال قصۂ اصحابِ کہف میں "یسئلونک "نہیں لائے، ایسا کیوں؟

جواب: معاملۂ روح کی ماہیت وحقیقت مخفی ہونے کی بنا پر، اور معاملہ ذی القرنین بعد زمان کی بنا پر، قابلِ سوال تھے، اس لیے "یسئلونک "کہا، اور قصۂ اصحابِ کہف میں نہ خفائے ماہیت ہے، نہ بعد زمان، گویا یہ قصہ سوال کے زیادہ قابل نہ تھا، اسی لیے ﴿أم حسبت﴾ سے قصہ کی تمہید شروع ہوئی۔

سوال: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول تعدادِ اصحابِ کہف کے بارے میں کیا ہے؟

جواب: قال عبد الله ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما : " أنا من ذلك القليل ، كانوا سبعة ، إن الله عدّهم حتى انتهى إلى السبعة " .

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میں ان قلیل لوگوں میں سے ہوں، جنہوں نے سیاقِ قرآنی نے معلوم کرلیا کہ اصحابِ کہف سات ہی تھے، کیوں کہ حق تعالیٰ نے پہلے دو قول کو "رجمًا بالغیب" فرمایا، تیسرے قول کے ساتھ نہیں فرمایا۔

سوال: ﴿فلا تمار فيهم﴾ میں " هم "ضمیر کا مرجع متعین کریں!

جواب: ﴿فلا تمار فيهم﴾ أي فلا تجادل أهل الكتاب في عدتهم إلا جدال متيقن عالم بحقيقة الخبر .

☆☆☆☆☆☆☆

مقرباں رابیش بود حیرانی

(جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے)

دعویٰ کو مشیتِ الٰہی پر معلق کرنے کا بعنوان عام حکم

آیت : ۲۳ ، ۲٤ ، ۲۵ ، ۲٦ :

﴿ولا تقولن لشايءٍ اني فاعل ذلک غدًا O الا ان يشاء اللّٰه واذکر ربک اذا نسيت وقل عسٰى ان يهدين ربي لاقرب من هذا رشدًاO ولبثوا في کهفهم ثلث مائة سنين وازدادوا تسعًا O قل اللّٰه اعلم بما لبثوا له غيب السمٰوٰت والارض ابصر به واسمع ما لهم من دونه من ولي ولا يشرک في حکمه احدًا O﴾ .

ربط : اصحابِ کہف کا قصہ تاریخی کتابوں میں نوادرات میں لکھا تھا، ہر کسی کو کہاں خبر ہوسکتی تھی، مشرکین نے یہود کے سکھانے پر حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اور مقصود آپ کی آزمائش تھی، تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ کیا کہ کل بتادوں گا، اس بھروسہ پر کہ جبریل آئیں گے، تو دریافت کرلوں گا، حضرت جبرئیل علیہ السلام پندرہ دن تک نہ آئے، حضرت نہایت غمگین ہوئے، مشرکین نے ہنسنا شروع کیا، پھر حضرت جبرئیل یہ قصہ لے کر آئے اور نصیحت کی کہ آئندہ کی بات کے متعلق بغیر ''اِن شاءاللہ'' کے وعدہ نہ کرنا چاہیے، اگر ایک وقت بھول جائے، تو پھر اپنے رب کو یاد کرکے کہہ لے اور فرمایا کہ امید رکھ کہ تیرا درجہ اللہ اس سے زیادہ کرے، یعنی کبھی نہ بھولے (موضح القرآن) یا اصحابِ کہف کے واقعہ سے زیادہ عجیب طور پر آپ کی حفاظت فرمائے، اور کامیاب کرے، جیسا کہ غارِ ثور کے قصہ میں ہوا۔ یا واقعۂ کہف سے زیادہ عجیب واقعات وشواہد آپ کی زبان سے بیان کرائے۔

☆......شانِ وُرود ، آیت : ۲۳ ، ۲٤......☆

''لباب النقول فی أسباب النزول'' میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پہلی دو آیتوں کے متعلق یہ منقول ہے کہ جب اہلِ مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصۂ اصحابِ کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا، تو آپ نے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ بغیر اِن شاءاللہ کہے ہوئے کرلیا تھا، مقربینِ بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہوا کرتی ہے، اس لیے پندرہ روز تک وحی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا غم ہوا، اور مشرکینِ مکہ کو ہنسنے اور مذاق اُڑانے کا موقع ملا، پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوال کا جواب نازل ہوا، تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہدایت دینے کے لیے نازل ہوئیں، کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو، تو ''اِن شاءاللہ'' کہہ کر اس کا اقرار کرلیا کریں، کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے اِرادے اور مشیت پر موقوف ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

لا تقولن : فعل نہی بانون ثقیلہ واحد مذکر حاضر، مصدر قول از باب نصر۔

غدًا : اسم بحالت نصب۔ آنے والا کل۔ آئندہ زمانہ جو جلد آنے والا ہے۔ اصل میں غدوٌ تھا۔ واؤ بلا عوض حذف کردیا گیا۔ لیکن شعر میں غدوٌ بھی آیا ہے، ابرہہ کے کعبہ پر حملہ کرنے کے وقت دادا عبدالمطلب نے جو اشعار پڑھے تھے، ان میں یہ بھی شعر ہے:

ومحالهم غدوًا محالک .

نسیت : فعل ماضی واحد مذکر حاضر۔ مصدر نسیان از باب سمع۔ کسی چیز کے فراموش ہونے کے بعد اس کا ترک ہوجانا۔

أن یهدین : أن ناصبہ۔ یهدي : مضارع منصوب واحد مذکر غائب۔ نون وقایہ یائے متکلم محذوف مفعول۔ مصدر هدایة از باب ضرب۔

أقرب : اسم تفضیل واحد مذکر۔ مصدر قرب از باب کرم۔ نزدیک ہونا۔

ازدادوا : فعل ماضی جمع مذکر غائب۔مصدر ازدیادٌ از باب افتعال۔ بڑھنا،زیادہ ہونا۔

أبصر به وأسمع : دونوں فعل تعجب ہیں۔ أسمع کے بعد به محذوف ہے۔

☆......اعراب......☆

ولبثوا في كهفهم ثلٰث مائة سنين وازدادوا تسعًا .

و استینافیہ، لبثوا فعل بافاعل، في كهفهم جار مجرور متعلق لبثوا کا، هِم ضمیر مضاف الیہ، ثلٰث ظرفِ زمان منصوب متعلق لبثوا کے، مائة مضاف الیہ مجرور، سنين ثلاث مائة سے بدل، یاعطفِ بیان منصوب، علامتِ نصب یا ملحق بجمع مذکر سالم، و عاطفہ، ازدادوا فعل بافاعل، تسعاً تمیز منصوب۔

ابصر به واسمع . أبصر فعل ماضی برائے انشائے تعجب، بنی علی الفتح، با حرفِ جر زائدہ، ہا ضمیر، و عاطفہ، أسمع مثل أبصر کے۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿له غيب السمٰوٰت﴾ اور ﴿أبصر به﴾ میں ضمیر اللہ کی جانب لوٹ رہی ہے۔

☆......﴿لهم﴾ میں پانچ احتمال ہیں:

(۱) ” لهم “ : یعنی أهل السماوات والارض . یعنی زمین وآسمان میں رہنے والوں کا اس کے سوا کوئی خبر گیر نہیں۔

(۲) ” لهم “ : یعنی أصحاب الكهف . یعنی اصحابِ کہف کا اللہ کے سوا کوئی اور خبر گیر نہیں۔

(۳) ” لهم “ أي ؛ معاصروا النبي من الكافرين والمشركين الذين سألوه عن فتية ذهبوا قد كانت لهم قصة عجيبة . یعنی کفار ومشرکین کا اللہ کے سوا کوئی خبر گیر نہیں۔

(۴) ” لهم “ أي ؛ مختلفون في مدة بعث أصحاب الكهف . یعنی جو لوگ اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں اختلاف کررہے ہیں، ان کا ولی تو اللہ ہی ہے۔

(۵) ” لهم “ أي ؛ مؤمنوا أهل السماوات والأرض . یعنی لن يتخذ من

المؤمنين أحدًا من دون الله وليًّا . یعنی آسمان وزمین میں جو بھی مومن ہیں، وہ کبھی بھی اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی نہیں بنائیں گے۔

نوٹ : مصنف ضمائر القرآن کے مطابق احتمالِ اول اقرب الی الصواب ہے۔

☆......بلاغت......☆

ولا تقولن لشايءٍ : میں ” شَيء “ نکرہ ہے۔ مفہوم عموم واستغراق کے لیے۔ گویا یہ بتادیا کہ اپنے چھوٹے بڑے ہر ارادہ کو ارادۂ الٰہی پر معلق اور اس سے وابستہ رکھیے۔

غدًا : غد سے مراد مطلق زمانہ مستقبل ہے، نہ کہ متعین ومخصوص کل ہی کا دن۔

أبصر به واسمع : کلمۂ حیرت وتعجب ہے۔ بمعنی مبالغہ۔ یعنی : ما أبصره وأسمعه بهم وشأنهم . (ما أبصر الله لكل موجود . وأسمعه لكل مسموع) .

☆......پیغام واحکام......☆

☆......﴿ولا تقولن لشايءٍ﴾ کی تعلیم سے ایک طرف تو ردّ نکل آیا معتزلہ کا، جو بندہ کو بعض افعال کا خالق وموجد قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف جبریہ کا جو بندہ کو جماد ومجبورِ محض مانتے ہیں۔ صحیح مسلک اہلِ سنت کا یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال پر قادر تو ہے، لیکن مشیتِ الٰہی کے بعد اور اس کے ماتحت۔

یعنی بندہ کاسبِ افعال ہے، نہ کہ خالقِ افعال۔

☆...... ﴿إلا أن يشاء الله﴾ إلا حرفِ استثنا ہے۔ تقدیرِ کلام یوں ہے: ”إلا أن تقول إن شاء الله “۔ فقہائے کرام نے تصریح کردی ہے کہ یہاں قول کے لیے زبانی تلفُّظ شرط نہیں، اس لیے کہ مسئلہ اعتقادیات سے متعلق ہے اور اعتقادیات میں محض تصدیقِ قلبی کافی ہے۔

☆...... اِن شاءاللہ کہنا مستحب ہے۔ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے، تو جب یاد آئے اسی وقت کہہ لے۔ نیز محض تبرک اور اقرارِ عبدیت کے لیے یہ کلمہ کہنا مقصود ہوتا ہے،

کوئی تعلیق اور شرط لگانا مقصود نہیں ہوتا۔

☆......آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کا جواب آئندہ کل دینے کا وعدہ فرمایا تھا، اُس کے ساتھ آپ نے ’’اِن شاء اللہ‘‘ نہیں کہا، غالباً آپ بھول گئے، لیکن چوں کہ آپ کا مقام بہت بلند ہے، اور مقربین کی معمولی لغزشوں پر بھی گرفت ہو جاتی ہے، عارفوں کا مشہور مقولہ ہے: مقرباں را بیش بود حیرانی‘‘ اور کسی کا مصرعہ ہے: ’’جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے‘‘۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرا سی لغزش پر عتاب ہو گیا، اور پندرہ دن تک وحی نہیں آئی، اور آپ ان لوگوں کے سوال کا جواب نہیں دے سکے۔

☆......﴿قل عسٰى ان يهدين ربي لاقرب من هذا رشدًا﴾ میں ایک پیشن گوئی بھی کردی گئی کہ عن قریب اصحابِ کہف جیسا معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آنے والا ہے، بلکہ اس سے بھی عجیب! آپ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ہجرت فرمائیں گے، راستہ میں کئی دن تک غارِ ثور میں پوشیدہ رہیں گے، دشمن غار کے منہ تک پہنچ جائیں گے، مگر آپ کو نہ پا سکیں گے، آپ بخیریت مدینہ پہنچ جائیں گے، اور وہاں آپ پر فتح وکامرانی کی راہیں کھلیں گی۔

☆......ظالموں سے فرار کر جانا، جائز ہے، بلکہ اولیاء اور انبیاء کے معمولات میں سے ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿ولا تقولن لشيء﴾ میں ’’لشيء‘‘ کہا، ’’عن شيء‘‘ کیوں نہیں؟

جواب: لشيء میں لام بیانِ علت کے لیے ہے، بمعنی ’’عن‘‘ یا بمعنی ’’ بسبب أمرٍ مّا‘‘۔ (لام کبھی تبلیغ کے لیے آتا ہے، کبھی تعلیل کے لیے، آیتِ مذکورہ میں فعل لا تقولنّ کے بعد لام برائے علت وتعلیل ہے)۔

سوال: ﴿وازدادوا تسعًا﴾ کی مراد واضح کریں!

جواب: یعنی شمسی حساب سے پورے تین سو سال کھوہ (غار) میں سوتے رہے، اور قمری حساب سے نو سال زیادہ ہوئے (مہینوں اور دنوں کی کسور محسوب نہیں کی گئیں) یا تین سو

۴۷

سال کے بعد ممکن ہے قدرے نیند سے چونکے ہوں، پھر سو گئے، اور نو سال تک سوتے رہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ تین سو نو سال جاگنے کے بعد سے عہدِ نبوی تک کی مدت بیان فرمائی، یعنی لوگوں سے مل ملا کر پھر سو رہے، جس کو آپ کے زمانہ تک اتنا عرصہ گزرا۔ واللہ اعلم!

سوال: تفسیر عثمانی میں آیتِ مذکورہ کی تفسیر کے تحت مفسر قرآن، شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے کیا لطیفہ رقم کیا ہے؟

جواب: شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں صوبہ ’’زیشوان‘‘ (پاکستان) میں ایک شخص دو سو باون سال (۲۵۲) کی عمر رکھتا ہے، چوبیسویں شادی ابھی حال میں کی ہے۔

سوال: ﴿قل الله اعلم بما لبثوا الخ﴾ کی مراد واضح فرمائیں!

جواب: جتنی مدت سو کر وہ جاگے تھے، تاریخ والے کئی طرح بتاتے تھے، سب سے ٹھیک مدت وہی ہے، جو اللہ بتائے، آسمان وزمین کے تمام پوشیدہ راز اُسی کے علم میں ہیں، کوئی چیز اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں۔ جس طرح اُس کا علم محیط ہے، اس کی قدرت واختیار بھی سب پر حاوی ہے، جیسے غیوبِ سماوات وارض کے علم میں اس کا کوئی شریک نہیں، اختیارات قدرت میں بھی کوئی سہیم وشریک نہیں ہو سکتا۔

سوال: قرآن کریم نے بیانِ مدتِ نوم میں پہلے تین سو سال بیان کیے، اس کے بعد فرمایا کہ ان تین سو پر نو اور زیادہ ہو گئے، پہلے ہی تین سو نو کیوں نہیں فرما دیا؟

جواب: (۱) حضراتِ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود ونصاریٰ میں چوں کہ شمسی سال کا رواج تھا، اس کے حساب سے تین سو (۳۰۰) سال ہی ہوتے ہیں، اور اسلام میں رَواج قمری سال کا ہے، جس میں ہر سو (۱۰۰) سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لیے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے (مکمل ۳۰۹ر سال)، گویا اِن دونوں سالوں کا

امتیاز بتانے کے لیے عنوانِ تعبیر یہ اختیار کیا گیا۔

فائدہ: (۱) شمسی اور قمری سال میں ۱۱ر دن کا فرق ہوتا ہے۔ قمری سال میں ۳۵۴ر اور شمسی سال میں ۳۶۵ر دن ہوتے ہیں، سو سال میں شمسی سال کے گیارہ سو (۱۱۰۰) دن بڑھ گئے، اور تین سو سال میں تینتیس سو (۳۳۰۰) دنوں کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ۹ر سال اور کچھ مہینے بنتے ہیں۔

(۲) عدد کی اہمیت واضح کرنا مقصود ہے، کہ قاری توجہ سے ان کی مدتِ قیام پر غور کرے، وہ عدد سے سرسری نہ گزر جائے، اس کی نظیر سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۴ر ہے: ﴿فلبث فیھم ألف سنة إلا خمسین عامًا﴾ یعنی نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ایک ہزار برس (دعوت کا کام کرنے کے لیے) ٹھہرے، مگر پچاس سال کم، اس میں ساڑھے نو سو سال کے بجائے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے وہ مدتِ قیام کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

سوال: اصحابِ کہف کے معاملے میں خود ان کے زمانے میں، پھر عہد نبوی کے اندر یہود ونصاریٰ میں دو باتیں زیر اختلاف تھیں، ایک اصحابِ کہف کی تعداد، دوسرے مدتِ نوم، تو قرآن میں ان دونوں باتوں میں سے مدتِ نوم کو صراحۃً اور تعدادِ اصحابِ کہف کو اشارۃً بیان کیا، ایسا کیوں؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اپنے اس اسلوب سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ تعداد کی بحث تو بالکل ہی فضول ہے، اس سے کسی دنیوی دینی مسئلہ کا تعلق نہیں، البتہ مدتِ دراز تک خلافِ عادتِ انسانی سوتے رہنا، اور بغیر غذا کے صحیح وتن درست رہنا، پھر اتنے عرصہ کے بعد صحت مند اور قوی اُٹھ کر بیٹھ جانا حشر ونشر کی ایک نظیر ہے، اس سے مسئلہ قیامت وآخرت پر استدلال ہو سکتا ہے، اس لیے اس کو بصراحت بیان کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قصۂ اصحابِ کہف کا پیغام

کفار کے نرغے میں پھنسی مظلوم ومجبور مسلمان اقلیت کے نام

جب مکہ کے مسلمان ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے، اُن کی تعداد بہت تھوڑی تھی، ملک میں انہیں کم زور سمجھا جاتا تھا، خدا کا نام لینے اور اس کی عبادت کرنے پر پابندی تھی، ان کا معاشرتی ومعاشی مُقاطعہ وبائیکاٹ کر دیا گیا تھا، احادیث کے مجموعے، سیرت کی کتابیں؛ ظلم وسنگ دلی اور سفاکی وبے رحمی کے ان واقعات سے پُر ہیں، جو اہلِ ایمان مثلاً: حضرت بلال، عمار بن یاسر، حضرت خباب، حضرت مصعب، اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم اور ان کے دیگر احباب ورفقاء کو پیش آرہے تھے، ان واقعات کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں، اور وجدان وطبعِ سلیم میں ظلم کی نفرت وکراہیت پیدا ہونے لگتی ہے، قرآنِ مجید اور سیرتِ نبوی میں اس گھٹی گھٹی فضا اور سہمے ہوئے ماحول کی پوری تصویر ہے، جس میں مکہ کے مسلمان زندگی گزار رہے تھے، اس بوجھل وکُہر آلود فضا میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی، اور معاشرہ میں کوئی ایسا روزن باقی نہ تھا، جس سے روشنی کی کوئی شعاع یا تازہ ہوا کا کوئی جھونکا اندر آسکتا، مسلمان دراصل چکی کے دو پاٹ کے درمیان آگئے تھے، یا دوسرے الفاظ میں ایک بے رحم وخونخوار درندہ کے پنجوں یا جبڑوں میں موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے تھے، قرآنِ مجید نے اپنے بلیغ طریقہ پر اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے: ﴿حتی اذا ضاقت علیھم الارض بما رحُبت وضاقت علیھم انفسھم وظنوا ان لا ملجأ من اللہ الا الیه﴾ (جب کہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی، اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے، اور انہوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انہیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی، مگر خود اسی کے دامن میں) (سورۃ التوبۃ: ۱۱۸) عین اس وقت آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، اور قرآن مجید اہلِ ایمان کے لیے ایک ایسا قصہ بیان کرتا ہے، جس

میں تنگی کے بعد کشائش، سختی کے بعد آسانی، ذلت کے بعد عزت، اور سات آسمانوں سے خارقِ عادت طریقہ پر نصرتِ الٰہی کے نزول کا ایسا عجیب واقعہ پیش کیا گیا ہے، جو ہر قیاس اور تجربہ کو جھوٹا ثابت کرتا ہے، اور عقل ودانش کے تمام ظاہری پیمانوں کو چیلنج کرتا ہے، اور یہ بات روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک صاحبِ ایمان اقلیت بلکہ مٹھی بھر نوجوانوں کو جو ہر طاقت سے عاری اور ہر ہتھیار سے محروم وتہی دست تھے، کفر وفسوق کے ایک جم غفیر اور ظلم واستبداد کے اس انسانی سمندر سے کس طرح نجات عطا فرماتا ہے، جس کے ہاتھ میں قوت واقتدار کی زمام تھی، اور جو دولت وطاقت کے تمام تر وسائل وذخائر پر پوری طرح قابض تھا، وہ کس طرح زندہ سے مردہ کو، اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرتا ہے، ظلمت کے پردوں سے نور ظاہر فرماتا ہے، اور ان قاتلوں کو جن کے منہ کو خون لگ گیا تھا، اور جو دوسروں کا کلیجہ چبانے پر آمادہ اور اپنے خون کی پیاس اور انتقام کی آگ بجھانے پر مصر تھے، نگہبان وپاسبان، والدین کی طرح شفیق، اور انسانیت کے رحم دل مربی واتالیق بنادیتا ہے، اور ایمان دار بیٹے کو کافر باپ کا وارث بناتا ہے۔......اس سخت ونازک گھڑی میں جب مایوسی وبے دلی پوری فضا پر محیط تھی، کلیجے منہ کو آرہے تھے، اور آنکھیں پتھرانے لگی تھیں، قرآن مجید نے مکہ کے اہلِ ایمان کو ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا، نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا وہ قصہ یاد دلایا، جو فرد اور جماعت اور ایک نبی اور اُن کی قوم کے متعلق ہے، دوسری طرف اصحابِ کہف کا یہ قصہ بیان کیا جس میں ایک ظالم وجابر بادشاہ کے سامنے ایمان کے امتحان کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ قصے اپنے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے، نیز اپنی شخصیتوں اور کرداروں کے اعتبار سے ضرور مختلف ہیں، لیکن اپنے مقصد میں متحد ومتفق اور اپنے اختتام اور نتیجے میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ اور قریب ہیں، ایک مرکزی نقطہ ان سب میں پایا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا ارادۂ قاہرہ، جو ایک مومن کو کافر پر، متقی کو فاجر پر، مظلوم کو ظالم پر، کم زور کو طاقت ور پر، اور غریب کو امیر پر، اس طرح

غالب اور فتح یاب کرتا ہے کہ انسانی عقلیں اس کی توجیہ اور تشریح سے قاصر رہتی ہیں، ایک کافر بھی اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوتا ہے، اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

موجودہ دورِ آزمائش: موجودہ دور میں بھی (بالخصوص برما، کشمیر، فلسطین، چیچنیا، بوسنیا، شام ویمن وغیرہ کے) مسلمانوں پر حالات آرہے ہیں، اور آتے رہیں گے یہاں تک ہر کچے وپکے گھر میں ایمان داخل ہوجاوے، یعنی سب لوگ اسلام قبول کرلیں۔ لیکن جیسے اصحابِ کہف اور اہلِ مکہ نے صبر واستقامت کا دامن تھامے رکھا، اور بالآخر نجات کی صورت پردۂ غیب سے ظاہر ہوئی، انہیں ہجرت وجہاد کی اجازت ملی، اور وہ محفوظ قلعہ ومضبوط غار (مدینہ منورہ) میں پناہ گیر ہوئے۔ ایسے ہی مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ جہاں اور جس جگہ بھی رہیں، صبر واستقامت کے پیکر بن کر رہیں، خدا کے دین کی کھل کی دعوت دیں، باطل کا علانیہ مقابلہ کریں، انسانیت کو ظلم واستبداد کے شکنجے سے آزاد کرائے، اور اللہ کا نام اور کلمہ ہر چیز پر غالب اور بلند کرے **﴿حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله للّٰه﴾** (یہاں تک کہ ظلم وفساد باقی نہ رہے، اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لیے ہوجائے)۔ (سورۂ انفال: ۳۹)

تاریخ اپنے کو بار بار دہراتی ہے: اللہ تعالیٰ نے اس دین کے لیے ابدیت اور اشاعتِ عام اور اس امت کے لیے بقائے دوام کا فیصلہ فرمایا ہے، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان تمام مرحلوں سے گزرے، جن سے گزشتہ قومیں تاریخ کے مختلف زمانوں میں گزری تھیں، اور اس کی دعوت کو ان تمام قدرتی اور طبعی چیزوں کا سامنا کرنا پڑے، جو انسانی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں، اس کو کبھی قوت حاصل رہی کبھی کم زوری، کبھی کثرت کبھی قلت، کبھی موافقت کبھی مخالفت، کبھی فتح اور کبھی ہزیمت، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ جماعتیں جو دعوتِ حق کی علَم بردار ہیں، اور عقائد صحیحہ پر قائم ہیں، سخت ترین مظالم کی شکار ہوتی ہیں، ان

کو ایذا رسانی اور جلا وطنی کی طرح طرح کی قسموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کبھی یہ غیر مسلم حکومتوں میں ہوتا ہے، اور کبھی ان حکومتوں کے زیر سایہ جن کو اسلامی حکومتیں کہا جاتا ہے، اور جس کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو کلمہ گو کہلاتے ہیں، جو بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرتے ہیں، میلاد اور شبِ معراج کے شان دار جلسے کراتے ہیں، بہت شان وشوکت کے ساتھ عید مناتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ اسلام کی دعوت اور عقائد صحیحہ کو اپنے وجود وسالمیت اور اپنے استحکام وبقا کے لیے اکثر جاہلی تحریکوں، مشرکانہ خرافات اور ملحدانہ خیالات سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں، اس وقت اصحابِ کہف کا قصہ سرزمینِ اسلام میں پھر دہرایا جا رہا ہے، کم زور وصاحبِ ایمان اقلیت اور منافق وطاقت ور اکثریت کے درمیان کشمکش پھر برپا ہوئی ہے، لہٰذا مسلم نوجوانوں کو چاہیے کہ اصحابِ کہف کے قصہ سے دوبارہ روشنی، بصیرت اور نشاط حاصل کریں۔

فتنۂ قادیانیت اور مسلم نوجوانوں کا اغوا:

ایمان ومادیت کی کشمکش کی ایک تازہ مثال؛ کہ فی الوقت ایک قادیانی فتنہ ''شکیل بن حنیف'' مرتد اور دیگر مرتدین کی جانب سے زور پکڑ رہا ہے، جس کے بارے میں اطلاعات موصول ہوئیں کہ اب تک دس ہزار (۱۰۰۰۰) سے زائد مسلم نوجوان اس فتنے میں پھنس چکے ہیں، ان میں اکثریت عصری اداروں میں پڑھنے والے اسٹوڈنٹ اور مفلوک الحال نوجوانوں کی ہے، جو مادیت یعنی مال ودولت کے حصول کے لیے اپنے دین وایمان کی بلی فتنۂ قادیانیت کے نام چڑھا کر، دنیوی ظاہری اسباب، فوری ونقد نفع کی خاطر اپنے دین وایمان کا سودا کر دیا، اور ایمان وہدایت کے بدلے ضلالت وگم راہی کو خرید لیا۔ اَعاذنا اللہ منہ!......ان مرتدین نوجوانوں اور دیگر مسلم نوجوانوں کو اصحابِ کہف کے قصہ سے سبق لینا چاہیے کہ ان ایمان دار اور سچے نوجوانوں نے مادیت پر ایمان کو ترجیح دی، فوری نفع اور نقد

فائدہ پر آخرت کے وعدہ کو مقدم رکھا، انہوں نے ایمان کے ساتھ غربت وافلاس کی زندگی کو پسند کیا، لیکن کفر کے ساتھ دولت وامارت کی زندگی گوارا نہ کیا، انہوں نے وطن، اہل وعیال اور دوست واحباب سے دور رہنے کو پسند کیا، زندگی کی ہر لذت اور اقتدار کی ہر عزت سے محروم رہنا برداشت کیا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی شرک سے اپنی پیشانی کو داغ دار نہ کیا، نفس کے بندے اور خواہشات کے پرستار نہیں بنے، معصیت وسرکشی اور ظلم وزور دستی کے ساتھ تعاون نہ کیا، نفس کے تقاضوں سے زیادہ روح کے تقاضوں، اور عقل کے مطالبوں سے زیادہ ایمان کے مطالبوں پر توجہ دیں، اور جسم وجان کے ساتھ اس میں مشغول ہو گئے، اور آخر کار یہ ثابت ہوا کہ وہی زیادہ دُور اندیش، دقیقہ رس اور حقیقت شناس تھے، اور یہ کہ انجام کار اہلِ تقویٰ کے ہاتھ ہے۔

انہوں نے اسباب سے خالقِ اسباب کی طرف راہِ فرار اختیار کی، اور اس راہ کی ہر تکلیف پر اپنے کو آمادہ کر لیا، یہاں تک کہ اسباب اُن کے تابع ہو گئے، اور حکومتِ وقت (جس کے مظالم سے بچنے کے لیے انہوں نے روپوشی اختیار کی) بھی اُن کی ہم نوا ہو گئی، اصحابِ کہف کا قصہ ایمان وجواں مردی، استقامت وثابت قدمی، اور جہاد وقربانی کا وہ قصہ ہے، جو انسانیت اور حق وعقیدہ کی تاریخ میں بار بار پیش آتا رہا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسباب ارادۂ الٰہی کے تابع ہیں، اور وہ ایمان وعمل صالح کی توثیق تصدیق کرتے ہیں، اس لیے مومن کا راستہ اور طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے اس ارادہ کو اپنی طرف متوجہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید کا مستحق بنے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بعض المستفاد من قصة أصحاب الكهف

قصۂ مبارکہ سے چند فوائد مستفاد ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

☆......اثباتِ نبوت ورسالت۔

☆......اثباتِ بعث بعد الموت۔

☆......نوجوانانِ امت کے لیے اُسوۂ حسنہ اور راہِ استقامت کا سبق۔

☆......مؤمن صرف اپنے ایمان پر بھروسہ نہ کرلے، بلکہ اللہ پاک سے استقامت وثابت کی قدمی کی توفیق مانگے۔

☆......راہِ ہدایت پر چلنے والوں کے لیے اللہ پاک آسانیاں پیدا فرماتے ہیں۔

☆......سہو، نسیان، اور بھول چوک انسان کا خاصہ ہے۔

☆......نوجوان راہِ حق کو جلد قبول کرتے ہیں، ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

☆......قرآنی قصے دنیوی قصوں کی طرح من گھڑت افسانے نہیں ہیں، مکمل برحق ہیں۔

☆......حق بات کہنے میں جرأت وہمت سے کام لے، مال ودولت کی جھنکار دیکھ کر پیچھے نہ ہٹے۔

☆......حفاظتِ دین، حفاظتِ نفس، حفاظتِ نسل، حفاظتِ عقل اور حفاظتِ مال کے خاطر ہجرت مشروع ہے، جب ان چیزوں کے ضیاع کا خطرہ ہو، تو وہاں سے ہجرت کرجائے، اللہ پاک حفاظت کریں گے، اور آسانی کا معاملہ فرمائیں گے۔ جیسا کہ اللہ نے غارِ ثور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حفاظت فرمائی۔ مہاجرین حبشہ کی نصرت فرمائی۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حفاظت ونصرت فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدین کی طرف ہجرت کے موقع پر حفاظت ونصرت فرمائی وغیرہ۔

☆......ہدایت دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ پاک کی ہے، اس حقیقت کو لوگوں

کے سامنے بیان کرتے رہا کرے۔

☆......اللہ پاک اپنے اولیاء کے ساتھ لطف ومہربانی کا معاملہ فرماتے ہیں، اُن کا دفاع کرتے ہیں، اُن کے تمام اُمور کی تدبیر فرماتے ہیں، اور اُن کو خیر وصلاح کی توفیق عطا کرتے ہیں۔

☆......تدبیرِ اُمور پر قدرتِ خداوندی کا اظہار وبیان کیا جائے، جیسا کہ اصحابِ کہف کے ساتھ بہت سے خارقِ عادات اُمور پیش آئے، وہ سب قدرتِ باری تعالیٰ ہی کے سبب تھا۔ انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

☆......مستقبل میں کسی بھی کارِ خیر کی انجام دہی کے لیے اللہ کا ذکر کرنا، یعنی ''اِن شاء اللہ'' کہنا چاہیے۔

☆......جہاں حلال وحرام دونوں طرح کے کھانے ملتے ہیں، وہاں دیکھ بھال کر ہی کھانا خریدنا اور کھانا چاہیے۔ مشکوک کھانوں سے احتیاط لازم ہے۔

☆......بعث بعد الموت برحق ہے۔

☆......قبروں کو سجدہ گاہ بنانا حرام وممنوع ہے۔

☆......اسباب ووسائل کا اختیار کرنا بندے کے لیے ضروری ہے، محض توکل کافی نہیں۔

☆......بغیر علم وتحقیق کے جدال ومناظرہ منع ہے۔

☆......لاعلم چیزوں (جن کا کسی انسان کو صحیح علم نہ ہو) کی کھوج میں پڑے رہنا، غیر مناسب وممنوع ہے۔

☆......لاعلمی کی صورت میں لا ادری کو ڈھال بنایا جاسکتا ہے، یعنی کسی چیز کے سوال کیا جائے، اور اس کی تحقیق نہ ہو، تو مستفتی سے کہہ دے کہ لا ادری؛ میں نہیں جانتا۔

☆......مفتی ماجن سے استفتاء نہ کیا جائے، یعنی جس شخص میں فتویٰ دینے کی صلاحیت نہ ہو، متقی وپرہیزگار نہ ہو، اس سے استفتاء نہ کیا جائے، اور اس کو بھی فتویٰ دینے سے احتیاط کرنا چاہیے۔

☆......سلامتِ عمل وعقیدہ پر دلیل کا مطالبہ درست ہے۔

☆......اللہ پر جھوٹ گھڑنے سے احتراز ضروری ہے، کہ یہ اشد ظلم ہے۔

☆......بقول شیخ سعدی رحمہ اللہ: ان آیات سے بعض فوائد مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً:

تحصیلِ علم پر ترغیب وتشویق۔ علمی مذاکرہ ومباحثہ کا جواز۔ کسی مسئلہ میں شبہ ہو تو دوسرے مستند عالم سے رجوع کرے۔ ایک مفتی دوسرے مفتی سے اپنے جواب کی تصحیح وتصویب کرائے۔ بیع وشراء میں وکالت کا جواز۔ بیع وشراء میں عقدِ شرکت کا جواز۔ حلال، پاکیزہ اور نفیس چیزوں کا استعمال۔ عمدہ ولذیذ کھانوں کی رغبت اور جواز بشرطیکہ اسراف وفضول خرچی اور ضیاعِ فلوس سے بچا جائے۔ مواقعِ فتن (فتنوں کی جگہوں) سے احتراز۔ خصوصاً اہلِ حق مسلمانوں کی جاسوسی اور اُن کے بارے میں خبر ونشر۔ دین میں شدتِ رغبت رکھنا۔ دین وایمان بچانے کی خاطر اپنے وطن کو ترک کر دینا۔

مذمتِ میلان اِلی الاغنیاء

روشن خیال مصلحین کے ایک ذوقِ فاسد کی اصلاح

آیت : ۲۷ ، ۲۸ :

﴿واتل ما اوحي اليک من کتٰب ربک لا مبدل لکلمٰته ولن تجد من دونه مُلتحدًا O واصبر نفسک مع الذين يدعون ربهم بالغدٰوة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عينک عنهم تريد زينة الحيوٰة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هوٰيه وکان امرهٗ فرطاO﴾ .

ربط : گزشتہ آیات میں فرمایا تھا کہ بے کار چیزوں میں زیادہ اُلجھنے اور کاوش کرنے کی ضرورت نہیں، اب فرمایا کہ آپ اپنے فرضِ منصبی کی انجام دہی میں مشغول رہیے، یعنی جو جامع ومانع اور کافی وشافی کتاب تیرے رب نے مرحمت فرمائی، اسے پڑھ کر سناتے رہیے، خدانے جو باتیں اس میں سنائیں، اور جو وعدے کیے کوئی طاقت نہیں جو انہیں بدل یا ٹال سکے، یا غلط ثابت کر سکے، اگر ان باتوں کو بدلنے کے درپے ہوگا، یا اس کتاب کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا، وہ خوب سمجھ لے کہ خدا کے مجرم کے لیے کہیں پناہ نہیں۔ ساتھ ہی مؤمنین کے اخلاصِ کامل کا بیان بھی کیا گیا ہے۔

☆......شانِ وُرود آیت/۲۸ : ﴿واصبر نفسک﴾......☆

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ (قبولِ اسلام سے پہلے) (یا بعد از اسلام) مؤلفۃ القلوب میں سے عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس اور اُن کے قرابت دار، بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ مجلس میں صدر نشیں ہوں، اور ان خرقہ وجبہ پوش (خستہ حال اور فقیرانہ ہیئت والے) لوگوں کو ہم سے دور رکھیں (ان سے ان کی مراد سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور نادار مسلمان

تھے،ان پر اُونی جبے پڑے ہوتے تھے،ان جبوں کے سوا اُن کے بدن پر اور کچھ نہ ہوتا تھا)، تو ہم آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے باتیں کرتے ،اور آپ کی تعلیمات سے استفادہ کرتے، اس پر سورۂ کہف کی آیات (۲۷، ۲۸، ۲۹) نازل ہوئیں،اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے،اور ان کو تلاش کرنے لگے،آپ نے مسجد کے عقبی حصہ میں ان کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے پایا،تو فرمایا:" **الحمد لله الذي لم يُمتني حتى أمرني أن أصبر نفسي مع رجال من أمتي ، معكم المحيا ، ومعكم الممات**" (اللہ کا شکر ہے، جس نے وفات سے پہلے مجھے اس بات کا حکم دیا کہ میں اپنی امت کے چند آدمیوں کے ساتھ اپنی ذات کو روکے رکھوں،تمہارے ساتھ ہی زندگی اور تمہارے ساتھ ہی موت ہے)۔

فائدہ: حضرت ابوسعید خدری وابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے،ایک صاحب سورۂ حجر یا سورۂ کہف کی تلاوت میں مشغول تھے،آپ کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے،تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسی ہی مجلسوں میں مجھے بیٹھنے کا حکم ہوا ہے۔

☆......شانِ وُرود آیت/۲۸ : ﴿ولا تطع من اغفلنا قلبه﴾......☆

ابن مردویہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ امیہ بن خلف جمحی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ غریب فقیر شکستہ حال مسلمانوں کو آپ اپنے قریب نہ رکھیں،بل کہ مکہ اور قریش کے سرداروں کو ساتھ لگائیں،یہ لوگ آپ کا دین قبول کر لیں گے، تو دین کو ترقی ہوگی۔تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

واتل : واو حرفِ عطف۔ **اتل** فعل امر واحد مذکر حاضر۔مصدر **تلاوة** از باب نصر، پڑھنا،تلاوت کرنا۔

أوحي : ماضی مجہول واحد مذکر غائب۔مصدر **إيحاءٌ** از باب افعال۔

من كتاب : **مِن** بیانیہ **ما** موصولہ کا بیان ہے۔

لا مبدل : **لا** لائے نفی جنس۔ **مبدل** : اسم فاعل اس کا اسم،از باب تفعیل۔

ملتحدًا : اسم ظرف مکان۔ بروزن اسم مفعول۔ پناہ کی جگہ۔مصدر **التحاد** از باب افتعال۔یا مصدر میمی از باب افتعال: پناہ۔

واصبر : از باب ضرب روکنا۔استقلال سے رہنا۔صبر کے اصلی معنی ہیں: نفس کو عقل وشرع کے مطابق رکھنا۔

لا تعد : فعل نہی واحد مؤنث غائب۔مصدر **عدوٌ** از باب نصر۔پھرنا،دوڑنا۔کسی چیز سے تجاوُز کرنا۔اصل میں **لا تعدو** تھا،آخر سے واو حرفِ علت بر بنائے فعل نہی گر گیا۔

عيناك : فاعل ہے **لا تعد** کا۔اور جملہ **تريد** الخ حال ہے **عيناك** کے کاف سے۔

فُرطًا : وصف یا مصدر بحالتِ نصب۔حد سے تجاوُز کرنا۔امام راغب نے یوں ترجمہ کیا: حد سے بڑھا ہوا۔(مجاوزًا للحد) . عرب کا قول ہے: **فرس فرط إذا كان متقدما للخيل . قال الليث : الفرط الأمر الذي يفرط فيه ، قال الشاعر :**

لقد كلفتني شططا ☆ وأمرًا خائبًا فرطًا .

☆......اعراب......☆

وكان امرهٗ فرطا . و عاطفہ،کان فعل ماضی ناقص،أمره کان کا اسم مرفوع،ہا مضاف الیہ، فرطا کان کی خبر منصوب۔

☆......بلاغت......☆

﴿الغدٰوة﴾ اور ﴿العشي﴾ کے مابین صنعتِ طباق ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

دعوت وتبلیغ کے خاص آداب واحکام ان آیات سے معلوم ہوتے ہیں۔

☆......ہجر کے دو طریقے ہیں:

(۱) ہجرِ مشروع؛ یعنی منکرات ومنہیات سے دوری اختیار کرنا، اور گناہوں سے اجتناب۔ یا شرعی وجہ کی بنا پر کسی سے نفرت اور قطع تعلُّق کرنا بطورِ معاقبت، جیسا کہ حاکم کا اپنی رعایا کو زجر وتنبیہ کرنا، شوہر کا اپنی بیوی اور اہل وعیال کو زجر کرنا، باپ کا اپنی اولاد کو تنبیہ کرنا، عالم ومقتدیٰ کا اپنے تلامیذ ومتبعین کو زجر کرنا وغیرہ۔

(۲) ہجرِ ممنوع؛ کسی سے اپنی ذات کے لیے قطع تعلق ونفرت کرنا، جو شریعت میں مباح ومشروع نہیں، ہاں! اگر کسی شرعی عذر کی بنا پر ہو، تو بھی صرف تین دن تک قطع تعلق کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں۔" لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث ".

اسی طرح ہجرِ ممنوع میں طاعت کو ترک کردینا، یا اہلِ طاعت سے نفرت، اور دُوری اختیار کرنا بھی شامل ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿واذا قيل لهم تعالوا الى ما انزل الله والى الرسول رأيت المنافقين يصدُّون عنك صُدودًا﴾ (سورة النساء : ٦١)
﴿واصبر نفسک مع الذين يدعون ربهم بالغدوٰة والعشي﴾ .(الكهف : ٢٨)

☆ ......رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوش وانہماکِ تبلیغ میں قدرۃً اس بات کی زیادہ فکر رہا کرتی تھی کہ رؤسائے قریش میں سے کوئی ایمان لے آئے، تو امت کے جمال وکمال میں نمایاں اضافہ ہوجائے۔ تو آیتِ مذکورہ میں اس جانب اشارہ ہے کہ امت کا جمال وکمال اس ظاہری دنیوی ساز وسامان اور مادّی مال وجاہ سے نہیں، بلکہ وہ اخلاص واطاعتِ کاملہ سے ہے۔ خواہ اُن کے وجود کا تحقُّق فقراء وغرباء وعوام الناس ہی میں ہو۔

☆ ...... ﴿تريد زينة الحيوٰة الدنيا﴾۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ اغنیاء کی طرف ایسا میل وتواضع جس کی بنیاد اُن کا غنا ہو، آیت اس کی مذمت میں ہے۔ یہ آیت آج کے بہت سے مصلحین کے لیے قابلِ غور ہے۔ آج ہر "اصلاح" پر زور (خواہ عقائد سے متعلق ہو یا اعمال سے) سب سے زیادہ اسی پہلو سے دیا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کی مالی ومعاشی حیثیت چمک جائے گی، یا اس سے مسلمان سیاسی اقتدار حاصل کرلیں

گے، وقس علی ہذا۔ غرض مقصود ومطلوب ہر "اصلاح" سے کسی نہ کسی پہلو اور اعتبار سے یہی دنیا اور اس کی سربلندیاں ہی رکھی جاتی ہیں، تعلیمِ قرآنی اس ذوقِ فاسد سے کس درجہ اِبا کرتی ہے!

☆ ......اتباعِ قرآن واجب ہے۔ (اس میں احادیث، اور ذخیرۂ فقہ اسلامی جو اصولِ اربعہ سے مستخرج ومستنبط ہیں، سب شامل ہیں)۔

☆ ......اسلام دینِ مساوات ہے؛ شریف اور وضیع، غنی وفقیر، رئیس ونوکر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ امورِ اجتماعیہ میں بھی تمام طبقات برابر ہیں، مثلاً مجلس، معاملہ، حقوق اور واجبات میں سب یکساں ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز ☆ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

☆ ......اصحابِ کہف، اہلِ ایمان اور اہلِ معرفت کا ہر زمانہ میں یہ شیوہ اور دستور رہا کہ وہ ایمان وعملِ صالح اور خدا سے روحانی تعلق اور نسبت کو ہمیشہ مادی اسباب اور ظاہری شکلوں پر ترجیح دیتے رہے، مادیت اور اس کے علم برداروں کے خلاف انہوں نے ہمیشہ علمِ بغاوت بلند رکھا، اور دنیا اور زینتِ دنیا کو کبھی نظر بھر کر نہ دیکھا، اور یہی سورۂ کہف کا پیغام اور قرآن مجید کی دعوت ہے۔

☆ ...... مادی تہذیب (جس کی نمایاں اور موجودہ شکل کو ہم دجالی تہذیب کہہ سکتے ہیں) اس روح اور اس رجحان یا دعوت کی قدم قدم پر مخالف ہے، بلکہ بالکل متوازی رخ پر چلتی ہے، وہ مادیت اور اس کے علم برداروں کی عظمت وتقدیس اور ان کی عقیدت واطاعت پر قائم ہے، اس کا سارا ادب وفلسفہ (نثر ونظم، صحافت، ناول، ڈرامہ اور تاریخ کی تمام قسموں اور شعبوں کے ساتھ) سرمایہ داروں اور مادی طاقت اور سیاسی واقتصادی اقتدار رکھنے والوں کی جا وبے جا تعریف اور خوشامد سے بھرا ہوا ہے، اور اس نے ان کو خدا کی طرح برتر وبالاتر اور لاثانی ولافانی بنانے کی کوشش کی ہے، اور ان کی نقل وتقلید، اطاعت وفرماں برداری، اور غلامی وکفش برداری کی ترغیب دی ہے۔

☆.....آج مسلم معاشرے میں مغربیت زدگی (ماڈرن ازم/Modern Ism)؛ یعنی حیوانی حریت، عریانیت وآزادانہ اختلاط، مادیت کا ہیضہ، فکری بے چینی، نفسیاتی اکتاہٹ؛ شدت سے فروغ پارہی ہے، انتہا پسندی اور ناعاقبت اندیشی دجالی تہذیب کی خصوصیت ہے، مسلمانوں کو اس تہذیب سے کوسوں دور بھاگنا چاہیے۔

☆.....سوالات.....☆

سوال: اس سورت میں ﴿لا مبدل لكلمٰته﴾ فرمایا، جب کہ دوسری جگہ ہے: ﴿واذا بدلنا اٰية مكان اٰية﴾ تبدیلِ آیت بالآیت تبدیلِ کلمات کو مستلزم ہے، تو بظاہر دونوں آیتوں میں تعارُض ہے؟

جواب: پہلی آیت کا مطلب ہے؛ قرآنِ کریم میں کوئی بشر تغیُّر وتبدُّل نہیں کرسکتا۔ یہ قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کے اس مطالبے کے جواب میں فرمایا گیا: ﴿ائت بقراٰن غير هذا او بدّله﴾۔ اور دوسری آیت کا مطلب ہے؛ نسخ اور تبدیلی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی، لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی منافات وتعارُض نہیں ہے۔

سوال: "أنزلوا الناس منازلهم" کے تحت، یہاں ایک سوال یہ ہوسکتا ہے کہ اُن کا مشورہ قابلِ عمل تھا کہ ان کے لیے ایک مجلس علیحدہ کردی جاتی، تاکہ ان کو اسلام کی دعوت پہونچانے اور ان لوگوں کو قبول کرنے میں سہولت ہوجاتی؟

جواب: اس طرح کی تقسیم میں سرکش مال داروں کا ایک خاص اعزاز تھا، جس سے غریب مسلمانوں کی دل شکنی یا حوصلہ شکنی ہوسکتی تھی، نیز علمِ الٰہی میں اُن کے مؤمن ہونے کی قطعاً کوئی امید نہ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا، اور اصولِ دعوت وتبلیغ یہی قرار دے دیا کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم!

☆☆☆☆☆☆☆☆

عام اعلانِ حق وحجتِ تامہ

حق نہ ماننے والوں کا ٹھکانہ.....دنیا کی چہل پہل ہیچ اور فانی ہے

آیت : ۲۹ : ﴿وقل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر انا اعتدنا للظّٰلمين نارا احاط بهم سرادقها وان يستغيثوا يغاثوا بماء كالمهل يشوي الوجوه بئس الشراب وساء ت مرتفقاO﴾ .

ربط : گزشتہ آیات میں غریب اہلِ ایمان کی اہمیت بیان کی گئی تھی کہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں، جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے، تمہیں بات سننی ہو سنو، نہ سننی ہو نہ سنو، مگر یہ سودا دِماغ سے نکال دو کہ تمہاری خاطر ان مخلصین کو دھکا دے دیا جائے گا۔ اب اس آیت میں عام اعلانِ حق کیا جارہا ہے، کہ اللہ کی حجت تام ہوچکی ہے، اب لوگوں کی مرضی ہے، مانیں یا نہ مانیں، اللہ تعالیٰ کو کسی کے ماننے نہ ماننے کی پرواہ نہیں، جو کچھ نفع ونقصان ہوگا، انہیں کا ہوگا، ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں ہی اپنا انجام سن لیں۔ دنیا کی چہل پہل کا لطف اُس وقت ہے جب کہ وہ فلاحِ آخرت کا ذریعہ بنے۔

☆.....مفرداتِ لغویہ.....☆

فليؤمن : فا حرفِ عطف برائے جزا۔

ليؤمن : فعل امر واحد مذکر حاضر۔ مصدر إيمان از باب افعال۔

إنا اعتدنا الخ : اس میں لف ونشر مشوش ہے؛ ﴿إنا اعتدنا للظّٰلمين﴾ کا تعلق ﴿ومن شاء فليكفر﴾ سے، اور ﴿إن الذين اٰمنوا﴾ الخ کا تعلق ﴿فمن شاء فليؤمن﴾ سے ہے۔

أحاط : فعل ماضی واحد مذکر غائب۔ مصدر إحاطة : از باب افعال۔ کسی شے پر اس

طرح چھاجانا کہ فرارممکن نہ ہو۔

سرادقها : سرادق : مضاف۔ **ها** ضمیر مضاف الیہ۔جمع **سُرادقات**. ہر وہ چیز جو کسی شے کا احاطہ کیے ہوئے ہو،خواہ چہار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ،وہ سرادق ہے۔(یہ فارسی کلمہ''سرادر''یا''سراپردہ'' کامعرب ہے)۔

بعض مفسرین کے مطابق سرادق سے وہ دخان (دھواں) اور سایہ مراد ہے،جس کا تذکرہ آیت کریمہ ﴿**انطلقوا الى ظل ذي ثلاث شعب**﴾(المرسلات : ۳۰)میں کیا گیا ہے۔یعنی یہ دھواں انہیں جہنم میں داخل ہونے سے پہلے ڈھانپ لے گا۔

ان يستغيثوا : إن حرفِ شرط۔ **يستغيثوا** : مضارع مجزوم جمع مذکر غائب۔مصدر **استغاثة** از بابِ استفعال۔مادہ **غوث** ہے:فریاد کرنا۔

يستغيثوا : کی اصل **يستغوثوا** ہے۔واو کا کسرہ ماقبل کو دیا پھر واو کو **ي** سے بدل دیا۔

يغاثوا : مضارع مجزوم جمع مذکر غائب۔مصدر **إغاثة** از بابِ افعال،فریادرسی کرنا۔

كالمهل : ك حرفِ جر۔ **المهل** : اسم،تیل کی تلچھٹ۔

مهل : (۱)ہر معدنی چیز کے سیال مادہ کو کہتے ہیں؛ جیسے سونا، چاندی، تانبا، لوہا وغیرہ۔قال أبو عبيدة والأخفش : **كل شيء أذبته من ذهب أو نحاس أو فضة فهو المهل** .

(۲)لوہے کے پگھلے ہوئے پانی کو بھی تلچھٹ کہتے ہیں۔

(۳)اس کے علاوہ لہو، پیپ،مردہ سے بہنے والا زرد پانی وغیرہ کو بھی **مهل** کہتے ہیں۔

يشوي : مضارع واحد مذکر غائب۔مصدر **شيٌّ** از بابِ ضرب۔بھوننا۔

جملہ **يشوي الخ ماء** کی صفت بھی ہوسکتا ہے،اور **المهل** کا حال بھی۔

بئس الشراب : میں **الشراب** فاعل ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے، أي : **ذلک الماء المستغاث به** .

۵۶

ساء ت : ماضی واحد مؤنث غائب،فعل ذم۔مصدر **سوءٌ** از بابِ نصر۔**ساء ت** کا فاعل **هي** ضمیر ہے جو نار کی طرف لوٹتی ہے،اور **مُرتفقا** تمیز ہے۔

مُرتفقا : ظرفِ مکان۔مقامِ آرام،وہ جگہ جہاں آرام حاصل کیا جائے۔

تنبیہ : دوزخ آرام کی جگہ نہیں، بلکہ جنت آسائش وآرام کی جگہ ہے، دوزخ پر **مرتفق** کا اِطلاق محض تقابلِ لفظی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

ارتفاق : کے اصلی معنی ہیں کہنی کھڑی کرکے اس پر گال رکھ کر آرام کرنا۔جہنم کے لیے اس لفظ کا استعمال استِهزاءً یا مُشاکلةً کیا گیا ہے۔

☆......**اعراب**......☆

بئس الشراب وساء ت مرتفقا . **بئس** فعل ماضی جامد برائے انشاءِ ذم،**الشراب** فاعل مرفوع،مخصوص بالذم محذوف مقدر(الماء)،و عاطفہ،**ساء ت** فعل ماضی برائے انشاء ذم،**ت** برائے تانیث،**هی** ضمیر مستتر فاعل، **مرتفقا** تمیز منصوب۔

☆......**بلاغت**......☆

☆......﴿**فليؤمن**﴾ اور ﴿**فليكفر**﴾ کے مابین **صنعتِ طباق** ہے۔

﴿**بئس الشراب وساء ت مرتفقا**﴾ اور ﴿**نعم الثواب وحسنت مرتفقا**﴾ میں جہنم اور جنت کے درمیان **مقابلۂ بدیعه** ہے۔(المقابلة البديعة بين الجنة والنار)

بالغدوة والعشي : یعنی **على الدوام** . دو وقتوں میں حصر مقصود نہیں، بل کہ دوام واستقرار مقصود ہے۔

﴿**انا اعتدنا للظّٰلمين نارا احاط بهم سرادقها**﴾ میں استعارہ تصریحیہ ہے۔

استعارہ تصریحیه: وہ استعارہ ہے جس میں مستعار منہ (مشبہ بہ) کے لفظ کی صراحت کی گئی ہو،اور مستعار لہ (مشبہ) کو حذف کر دیا ہو۔

﴿يغاثوا بماء كالمهل﴾ میں تهكُّم (بمعنی غضبِ شدید) ہے۔عذاب کو إغاثة سے تعبیر کیا، جب کہ إغاثة عذاب سے بچانے کے لیے آتا ہے۔

﴿بماء كالمهل يشوي الوجوه﴾ تشبیہ مرسل مفصل ہے؛ کیوں کہ اداتِ شبہ اور وجہ تشبیہ مذکور ہے۔

تشبيه مرسل مفصل: وہ تشبیہ ہے جس میں اداتِ تشبیہ، اور وجہ شبہ مذکور ہو۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......اللہ پاک کو مؤمنین کے ایمان اور کافرین کے کفر سے مضرت ومنفعت کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، بل کہ مؤمنین کا ایمان خود اُن کی ذات کے لیے نفع بخش ہے، اور کافرین کا کفر خود اُن کی ذات کے لیے مضر ونقصان دہ ہے، جیسا کہ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿ان احسنتم احسنتم لانفسكم وان اسأتم فلها﴾ (اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے لیے)۔ (سورة الإسراء :۷)

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر﴾ کے تحت معتزلہ کیا کہتے ہیں؟

جواب: معتزلہ کے مطابق آیتِ کریمہ میں اس بات کی صراحت ہے کہ ایمان وکفر، طاعت ومعصیت بندہ کے اختیار میں ہیں، جو اس عقیدہ کا انکار کرے اُس نے گویا صراحتِ قرآن کی مخالفت کی۔

جب کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک حصولِ ایمان وحصولِ کفر مشیت پر موقوف ہے۔ وهذا يدل على أن الكل من الله تعالى . نیز فاعل سے کسی بھی فعل کا صدور بلا قصد وداعی قصد محال ہے۔ صدور الفعل عن الفاعل بدون القصد والداعي محال.

سوال: آیت کریمہ میں ﴿فليؤمن﴾ اور ﴿فليكفر﴾ دونوں امر کے صیغے طلب کے

لیے ہیں؟ اگر طلب کے لیے ہیں، تو اس سے تو اباحتِ کفر ثابت ہوتی ہے؟

جواب: (۱) بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ: ﴿فمن شاء﴾ میں شاء کا فاعل محذوف ہے، تقدیر عبارت یوں ہے: ” فمن شاء ربكم فليؤمن “ . ”ومن شاء ربكم فليكفر“ یعنی ایمان وکفر اللہ کی مشیت سے ہے۔

(۲) یہ صیغے بطورِ اظہارِ غنٰی ہیں، نہ کہ بطورِ اباحتِ کفر، اس صورت میں آیت کا مطلب ہے: تم اپنے ایمان سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نفع اور کفر سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

(۳) بقول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ: امر کے صیغے یہاں بمعنی طلب وبرائے تخییر نہیں، بلکہ برائے تہدید ووعید ہیں۔

سوال: ﴿يغاثوا بماء كالمهل﴾ کی مراد واحتمال واضح کیجیے!

جواب: یہ جملہ بطورِ استہزا وارد ہے، کہ جب جہنمی پینے کے لیے پانی مانگیں گے، تو اُن کو تل چھٹ دیا جائے گا، ارشاد ہے: ﴿تصلى نارًا حاميةO تسقى من عين آنيةO﴾ (الغاشية : ۴، ۵) (گریں گے دہکتی ہوئی آگ میں۔ پانی ملے گا ایک کھولتے ہوئے چشمے کا)۔ یا پھر جہنم کی تپش سے بچنے کے لیے فریاد کریں گے، اور پانی طلب کریں گے، تاکہ برائے تبرید اپنے بدن پر ڈالیں، تو اُن کو کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا، ارشاد ہے: ﴿أن أفيضوا علينا من الماء﴾ (الأعراف : ۵۰) (کہ بہاؤ ہم پر تھوڑا سا پانی)۔ اور ایک دوسری آیت میں فرمایا: ﴿سرابيلهم من قطران وتغشى وجوههم النار﴾. کُرتے ہیں اُن کے گندھک کے اور ڈھانک لیتی ہے اُن کے منہ کو آگ۔ (سورة إبراهيم : ۵۰)

سوال: بئس . شرّ . ساء . قبح میں کیا فرق ہے؟

جواب: بئس: کلمۂ ذم ہے، اور اس کی ضد نِعْمَ ہے۔

شرًّ: ہر وہ چیز جس سے انسان کراہت کرے۔

ساء: ظاہری ومعنوی بدصورتی کے لیے آتا ہے، اور اس کی ضد حَسُنَ ہے۔

قبح: بدحالی یا بدصورت ہونا۔ قول، فعل اور شکل کی برائی کے لیے آتا ہے۔ عموماً ظاہری طور پر استعمال ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

محسنین کا اجر ضائع نہیں ہوتا......اصلی اور دائمی دولت مند کون؟

حق ماننے والوں کا ٹھکانہ

آیت : ۳۰، ۳۱ :

﴿ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت انا لا نضیع اجر من احسن عملاO اولئک لھم جنّٰت عدن تجري من تحتھا الانھٰر یُحلَّون فیھا من اساور من ذھب ویلبسون ثیابًا خضرًا من سندس واستبرق متکئین فیھا علی الارائک نعم الثواب وحسنت مرتفقًاO﴾ .

ربط : ماقبل آیات میں حق نہ ماننے والوں کا ٹھکانہ وانجامِ بد بیان ہوا، اب حق قبول کرنے والوں کا حسنِ انجام اور دائمی ٹھکانہ بیان کیا جارہا ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

جملہ إنا لا نضیع الخ :خبر ہے إن الذین اٰمنوا کی، اور جملہ لا نضیع خبر ہے دوسرے إن کی۔

أجرَ : مفعول بہ ہے، اور مابعد کی طرف مضاف ہے، من أحسن الخ موصول صلہ مل کر مضاف الیہ ہیں۔

من تحتھا : مجاز بالحذف ہے، أي : من تحت مساکنھم .

یحلون : مضارع مجہول جمع مذکر غائب، مصدر تحلیۃ از باب تفعیل، زیور پہنانا۔ یحلون دراصل یحلیون تھا،تعلیل ہوکر یحلون ہوا۔

من أساور : میں مِن ابتدائیہ ہے یا مفعول بہ پر مِن زائدہ ہے، اور مِن ذھب میں مِن بیانیہ ہے، اور جار مجرور محذوف سے متعلق ہوکر أساور کی صفت ہیں۔

أساور : جمع ہے، مفرد سِوارٌ ہے۔ کنگن، پہنچی، دستینہ، کلائی کا ایک زیور۔

سندس : باریک ریشم، اکثر علمائے لغت کے نزدیک یہ کلمہ معرب ہے، اس کی اصل فارسی ہے۔ اور شیذلہ جو فقہائے شافعیہ میں سے مفسر بھی ہیں، مشکلات القرآن میں ان کی تصنیف بھی ہے، وہ اس لفظ کو ہندی بتاتے ہیں، اور روح المعانی میں ہے کہ بھروچ کے لوگوں نے یہ کپڑا اسکندر ثانی کی خدمت میں پیش کیا تھا، اس نے دریافت کیا کہ یہ کیا کپڑا ہے؟ وفد نے جو سنسکرت میں گفتگو کررہا تھا، جواب دیا کہ اس کا نام سُندون ہے۔ رومیوں نے اس کو سُندوس کردیا، پھر عربوں نے اس کو سُندس کردیا۔ اگر یہ قصہ صحیح ہے، تو سنسکرت کے ماہرین اس لفظ کی اصل بتاسکتے ہیں۔

متکئین : اسم فاعل جمع مذکر منصوب، مصدر اتکاء از باب افتعال، ٹیک لگانا، سہارا لگانا۔ یلبسون کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

أرائک : أریکۃ کی جمع ہے، مزین تخت جس پر پردہ لٹکا ہوا ہو۔

☆......اعراب......☆

یُحلَّون فیھا من اساور من ذھب . یحلون مضارع مبنی مجہول مرفوع، وضمیر نائب فاعل، في حرف جر، ھا ضمیر محل جر میں یحلون کا متعلق، من أساور جار مجرور متعلق یحلون کے، علامتِ جر فتحہ غیر منصرف (أساور جمع منتہی الجموع غیر منصرف ہے)، من ذھب جار مجرور متعلق أساور کی صفت۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......کلمۂ طیبہ جنت کی چابی ہے اور نیک اعمال اس کے دندانے ہیں، اور چابی اسی وقت کام کرتی ہے جب اس کے دندانے درست ہوں۔

☆......جنت کی تمام نعمتوں کی ایک خاص کیفیت ہے، جس کو ہم دنیا میں نہیں سمجھ سکتے، کیوں کہ ہماری محسوسات میں اس جگہ کی کوئی پوری مثال موجود نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیثِ قدسی ہے: ''اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اپنے نیکوکار بندوں کے لیے آخرت

میں ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی انسان کے قلب پر اُس کا خیال گزرا، قرآن پاک میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿**فلا تعلم نفس ما اخفي لهم من قرة اعين**﴾ . (السجدة : ١٧)

☆...... ہر اِنذاری وتخویفی کے ذکر کے بعد ہی تبشیر اور تسلی کا بیان یہ معمولاتِ قرآنی میں سے ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿**يحلون فيها الخ**﴾ میں اہل جنت مردوں کو بھی سونے کے کنگن پہنانے کا ذکر ہے، اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ زیور پہننا تو مردوں کے لیے نہ زیبا ہے، نہ کوئی جمال اور زینت، جنت میں اگر کنگن پہنائے گئے، تو وہ ان کو خوب صورت نہیں بلکہ بدہیئت کر دیں گے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے لیے کنگن پہنانے کا کیسے وعدہ فرمایا؟

جواب: (۱) زینت وجمال عرف ورَواج کے تابع ہے، ایک ملک اور خطے میں جو چیز زینت وجمال سمجھی جاتی ہے، دوسرے ملکوں اور خطوں میں بسا اوقات وہ قابلِ نفرت قرار دی جاتی ہے، اور ایسا ہی اس کے برعکس بھی ہے، اسی طرح ایک زمانہ میں ایک خاص چیز زینت ہوتی ہے، دوسرے زمانے میں وہ عیب ہوجاتا ہے، جنت میں مردوں کے لیے بھی زیور اور ریشمی کپڑے زینت وجمال قرار دیئے جائیں گے، تو وہاں اس سے کسی کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا، یہ صرف دنیا کا قانون ہے۔

(۲) آخرت کی زینت کو دنیا کی زینت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) جنت دار العمل نہیں بلکہ دار الجزا ہے، نہی شرعی اُٹھ جانے کے بعد بہت سے دوسرے ممنوعات کی طرح زیور پوشی بھی رجالِ جنت کے لیے جائز ہوجائے گی۔

(۴) روم اور فارس کے بادشاہوں کی عادت تھی کہ وہ دوسروں سے خود کو ممتاز کرنے کے لیے کنگن اور تاج پہنا کرتے تھے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ جنت کے لیے اس کا وعدہ فرمایا کہ: یہ بھی آخرت کے بادشاہ ہیں۔

سوال: ﴿**خضرا من سندس**﴾ سے معلوم ہوا کہ جنت میں صرف سبز رنگ کے کپڑے ہی زیب تن کیے جائیں گے؟

جواب: سبز رنگ کے لباس کا تذکرہ بطورِ مثال بیان ہوا ہے، حصر مقصود نہیں، چنانچہ ﴿**وفيها ما تشتهيه الانفس**﴾ (الزخرف : ٧١) میں مطلق وعدہ موجود ہے کہ اہل جنت جو کچھ چاہیں گے پالیں گے۔

سوال: ایک ہی آیت کے اندر ﴿**يُحلَّون**﴾ صیغۂ مجہول، اور ﴿**يَلبَسُون**﴾ صیغۂ معروف، ایسا کیوں؟

جواب: امام رازی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ﴿**يَلبَسُون**﴾ صیغۂ معروف سے اشارہ اہلِ جنت کے اجرِ واجب کی طرف ہے، اور ﴿**يُحلَّون**﴾ صیغۂ مجہول سے اجرِ زائد یعنی اللہ کے فضلِ محض کی طرف اشارہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

قسمِ ثانی (آیت۳۲/تا۴۹)

(۲) فتنۂ مال ودولت

قصہ ذلتِ مال وفضیلتِ اعمال

آیت : ۳۲ ، ۳۳ ، ۳٤ :

﴿واضرب لهم مثلا رجلين جعلنا لاحدهما جنتين من اعناب وحففنٰهما بنخل وجعلنا بينهما زرعًا O كلتا الجنتين اٰتت اكلها ولم تظلم منه شيئًا وفجّرنا خلٰلهما نهرًاO وكان له ثمر فقال لصاحبه وهو يحاورهٗ انا اكثر منك مالا واعزُّ نفرًاO﴾ .

ربط : اب تک فتنۂ دین وایمان کا بیان چل رہا تھا، اب یہاں سے فتنۂ مال ودولت کو بیان کیا جارہا ہے؛ یعنی دو آدمیوں کی مثالی سرگزشت اور مکالمہ، جن میں ایک کے قبضہ میں قدرتی پیداواروں کے حصول کے بڑے اہم ذرائع ووَسائل تھے، اور دوسرے کا دامن ان ذرائع ووَسائل سے خالی تھا۔ اور اِن دوشخصوں (کافر ومومن) کا حال بتا کر، دنیا کی بے ثباتی وبے حقیقتی اور آخرت کی مقصودیت ظاہر کی جارہی ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

واضرب : فعل امر از باب ضرب؛ اس کے متعدد معانی آتے ہیں، اُن میں سے تین مشہور یہ ہیں:

(۱) مارنا، جیسے ﴿فقلنا اضرب بعصاک الحجر﴾ . (سورة البقرة : ٦٠)

﴿أن اضرب بعصاک الحجر﴾ . (سورة الأعراف : ١٦٠)

﴿أن اضرب بعصاک البحر﴾ . (سورة الشعراء : ٦٣)

٦٠

(۲) سطحِ زمین پر چلنا، جیسے ﴿یا ایها الذین اٰمنوا اذا ضربتم في سبیل اللّٰه﴾ . (سورة النساء : ۹۴)

﴿وإذا ضربتم في الارض﴾ . (سورة النساء : ١٠١)

﴿إن انتم ضربتم في الارض فأصابتكم مصيبة الموت﴾ . (سورة المائدة : ١٠٦)

(۳) مثال بیان کرنا، جیسے: ﴿واضرب لهم مثلا رجلين﴾ . (سورة الكهف : ۳۲)

﴿واضرب لهم مثل الحياة الدنيا﴾ . (سورة الكهف : ۴۵)

﴿واضرب لهم مثلا أصحاب القرية﴾ . (سورة يس : ١٣)

آیت میں آخری معنی (مثال بیان کرنا) مراد ہے۔

ضرب کا استعمال جب مَثَلٌ کے ساتھ ہو، تو وہ متعدی بدومفعول ہوتا ہے، یہاں ایک مفعول مثلا ہے اور دوسرا رجلین ہے۔ نیز رجلین کو مثلا سے بدل بھی بنا سکتے ہیں۔

حففنٰهما : حففنا : ماضی جمع متکلم از باب نصر، مصدر حفٌّ؛ ہر طرف سے گھیرے میں لے لینا۔ هما ضمیر مفعول۔

كلتا الجنتين : مرکب اضافی مبتدا، جملہ اٰتت خبر ہے۔

كلتا : باعتبارِ لفظ تثنیہ اور باعتبارِ معنی مفرد ہے، چنانچہ اٰتت خبر مفرد آئی ہے، اور خلٰلهما میں تثنیہ کی ضمیر آئی ہے۔ (كلتا : تاکید تثنیہ مؤنث کے لیے آتا ہے، اس کا استعمال تثنیہ مذکر کلا کی طرح ہے)۔

جب یہ اسم ظاہر کی طرف مضاف ہو، تو احوالِ ثلاثہ میں اُن کا الف بحالہ باقی رہتا ہے۔

أكلها : الأكُلُ والأُكْلُ : پھل، خوراک، کشادہ رزق۔

ثَمَرٌ و ثَمَرَةٌ : اسمِ جنس جیسے؛ خشب وخشبة، شجر وشجرة .

يحاور : مضارع واحد مذکر غائب، از باب مفاعلة، مصدر مُحاوَرة: باہم گفتگو کرنا۔

بقول صاحب کمالین شرح جلالین: یہ لفظ حار یحور سے ماخوذ ہے۔مگر قرینۂ مقام کی وجہ سے شیخی کرنا،فخر جتانا مراد ہے۔اس لیے علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اسی رکوع میں اول جگہ یحاورہ کا ترجمہ یفاخرہ سے کیا ہے،لیکن دوسری جگہ بدستور یخاطبہ کا ترجمہ کیا ہے۔اور عام اہل تفسیر نے دونوں جگہ گفتگو کرنے ہی کا ترجمہ کیا ہے۔

أعزُّ : اسم تفضیل واحد مذکر۔زیادہ عزت والا۔زیادہ زور والا۔مصدر عِزٌّ از باب ضرب؛ عزت والا ہونا۔أعزُّ کا مفضل منہ محذوف ہے، أي : منك اور مالا اور نفرًا تمیز ہیں۔

نفرًا : تین سے دس تک مردوں کی جماعت۔ ج : أنفار. نفر الرجل :مرد کا قبیلہ۔

☆......اعراب......☆

کلتا الجنتین اتت اکلها . کلتا مبتدا مرفوع،علامتِ رفع ضمۂ مقدرہ علی الالف، الجنتین مضاف الیہ مجرور،علامتِ جری، آتت فعل ماضی،تائے تانیث، هي ضمیر مستتر اس کا فاعل،أکلها مفعول بہ منصوب۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿ولم تظلم منه﴾ أي ؛ من الأُكُل . یعنی دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے،کسی کے بارے میں ذرا کمی نہ رہتی تھی۔

☆......﴿وكان له ثمر﴾ '' له '' أي ؛ لصاحب الجنتين والزرع .

☆......﴿وهو﴾ أي ؛ صاحب الجنتين والزرع . یعنی باغوں والے مزارع نے اپنے دوست سے کہا۔

☆......بلاغت ......☆

﴿واضرب لهم مثلا رجلين جعلنا لاحدهما جنتين﴾. تشبیہ تمثیلی ہے؛اس لیے کہ وجہ شبہ متعدد چیزوں سے کشید کی ہوئی ہیئت ہے۔

تشبيه تمثيل : وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ متعدد چیزوں سے کشید کی ہوئی ہیئت ہو۔

نیز اس آیت میں تتمیم ، احتراس اور کنایہ بھی ہے۔

تتمیم : کلام میں (رُکنین سے زائد) کوئی ایسی قید لانا جو بلاغت کے کسی نکتے (مثلاً مبالغہ وغیرہ) کا فائدہ دے،اور معنئ کلام میں حُسن پیدا کردے۔

احتراس وتکمیل : خلافِ مقصود کا وہم پیدا کرنے والے کلام میں ایسی قید کا اضافہ کرنا جو اس وہم کو دُور کردے۔

کنایہ : وہ لفظ ہے جس کو بول کر اس کے معنئ موضوع لہ کے لازم کو مراد لیا گیا ہو،معنئ موضوع لہ کو مراد لینے کے جواز کے ساتھ۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......مکہ مکرمہ کے متکبر سردار غریب مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھے،اُن کا مطالبہ تھا کہ ان شکستہ حالوں کو ہٹا دیا جائے،تو ہم آکر سنیں،ان میں یہ غرور و پندار اور تفوّق کیوں تھا؟ دنیا کی چند کوڑیوں کے خاطر۔اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں خوش حال بنایا تھا اس لیے وہ آپے سے باہر ہوگئے تھے،اور اپنے ہی بھائیوں کو کوڑی کے آدمی سمجھنے لگے تھے۔اب ان فریب خوردہ سرداروں کو ایک ملحد و بے دین اور ایک موحد و دین دار شخص کی مثال سنائی جاتی ہے۔مال دار مسلمانوں کے لیے اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کہ دنیا کی دولت فانی و چندروزہ ہے،اس لیے مفلوک الحال،مفلس اور نادار لوگوں کا خیال کریں،اُن کی ضروریات پر توجہ دیں۔محض غریبی و فقیری کی بنا پر انہیں کم تر و کم زور نہ سمجھیں۔

☆......اللہ کے نزدیک مال و دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے،ورنہ کافروں کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ ملتا،جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: '' **فو الذي نفسي بيده للدنيا أهون على الله من هذه على صاحبها ، ولو كانت الدنيا تزن عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرًا منها قطرةً أبدًا** ''.

اور سنن ترمذی میں ہے: '' **لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما**

سقی کافرا من شربة ماء " .

یعنی اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی دنیا کی قدر واہمیت ہوتی، تو کسی کافر کو پانی کا ایک قطرہ یا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتے۔

☆......سوالات......☆

سوال: اس آیت کا کوئی شانِ نزول بھی ہے؟

جواب: جی ہاں! اس سلسلے میں دو قول ہیں: (۱) امام بغوی نے لکھا ہے کہ مکہ میں قبیلہ بنی مخزوم کے دو بھائی رہتے تھے، ایک مومن تھا، دوسرا کافر، مومن کا نام ابوسلمہ عبداللہ بن عبد الاسود بن عبد یالیل تھا (جو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے سابق شوہر ہیں) اور کافر کا نام اسود بن عبد یالیل تھا، انہی دونوں کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا۔

(۲) بعض اہل علم کا قول ہے کہ عیینہ بن حصین فزاری اور اس کے ساتھیوں کے احوال اور حضرت سلمان کے حال کو بطورِ تمثیل بنی اسرائیل کے دو بھائیوں کے احوال سے تشبیہ دی گئی ہے، جن میں سے ایک کا نام برقول ابن عباس رضی اللہ عنہ "یہودا" اور برقول مجاہد رحمہ اللہ "تملیخا" تھا، اور دوسرے کا نام "قطروس" اور برقول وہب "قطفر" تھا، اول مسلمان تھا اور دوسرا کافر۔

ان دونوں کو اُن کے والد کی میراث سے آٹھ ہزار دینار ملے تھے، جو انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیے، کافر نے اپنے حصہ کے مال سے پراپرٹی (جائداد) خریدی، اور مومن نے خیراتی کاموں میں خرچ کر دیا۔ الخ۔ بقول مقاتل: انہی دونوں بھائیوں کا تذکرہ سورۂ صافات میں بھی مذکور ہے: ﴿قال قائل منهم اني كان لي قرين﴾ . (الآية/ ۵۱)

سوال: ﴿جعلنا لاحدهما جنتين من اعناب و حففنٰهما﴾ کا مطلب بتائیں!

جواب: اُن دونوں میں سے بدعقیدہ وبددین شخص کو اللہ پاک نے انگور کے دو قیمتی باغ، اُن باغوں کے ارد گرد خرموں کی باڑ لگی ہوئی، اور باغوں کے درمیان کی جگہ بے کار اور خالی نہیں، بلکہ سرسبز وشاداب کھیتی سے لدی ہوئی تھی، یعنی عرب کے نقطۂ نظر سے آسودگی مرفہ حالی کا کامل ومکمل مرقع! اور باغ بھی ایسے تھے کہ بغیر کسی نقصان وکمی کے پوری پوری فصل دیتے

تھے، پڑوس میں دریا، کھیتی کی سرسبزی اور باغ کی شادابی کے سامان وافر مقدار میں تھے، اور عام دولت مندی اس پر مستزاد تھی، گویا مادی فراغت وخوش نصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔

سوال: لفظ ﴿ثمر﴾ کس معنی میں ہے؟

جواب: (۱) ثمر کے مشہور وحقیقی معنی تو "پھل" کے آتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ایک مجازی معنی "دولت" (خاص کر سونا چاندی) کے بھی ہیں، اور آیت میں یہی معنی مراد ہے۔

(۲) لفظ ثمر درخت کے پھل اور انواعِ مال وزر سب کو کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس صرف باغات اور کھیت ہی نہیں، بلکہ سونا چاندی اور تمام اسبابِ عیش موجود تھے، جیسا کہ خود اس کے الفاظ ﴿انا اکثر منک مالا﴾ سے واضح ہوتا ہے۔

سوال: ﴿نفرًا﴾ کے کیا معنی ہیں؟

جواب: ﴿نفرًا﴾ یعنی جتھے اور مجمع کے لحاظ سے میں تجھ پر فائق ہوں، گرامی قدر جماعت والا ہوں۔ یعني : أنصارًا أو حشمًا وقيل : أولادًا ذكورًا .

☆☆☆☆☆☆☆

توحید، قیامت اور حشر ونشر کا انکار......کافروں کو استدراج ومہلت

آیت : ۳۵ ، ۳۶ :

﴿ودخل جنته وهو ظالم لنفسه قال ما اظن ان تبيد هذه ابدًاO وما اظن الساعة قآئمة ولئن رددت الى ربي لاجدنَّ خيرًا منها مُنقلباO﴾ .

ربط : یعنی بدعقیدہ وبے دین شخص اپنے مسلمان دین دار ساتھی کے ساتھ اپنے باغ میں داخل ہوا، اور کبر وغرور کے نشہ میں کہنے لگا کہ میں قیامت اور حشر ونشر کا قائل ہی نہیں، یہ سب ڈھکوسلے ہیں، اور اگر تیرے قول کے مطابق قیامت قائم ہو بھی گئی، تو میری مقبولیت کی بنا پر میں وہاں بھی چین وسکون سے رہوں گا، مجھے دنیا میں اسبابِ راحت میسر ہیں، یہ میرے عند اللہ مقبول ہونے کی دلیل ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

ما أظن : ما نافیہ۔ أظنُّ فعل مضارع واحد متکلم۔ مصدر ظنٌّ از باب نصر؛ گمان کرنا، خیال کرنا۔

أن تبید : مضارع منصوب بأن۔ واحد مؤنث غائب۔ وہ تباہ ہوگی۔ وہ خراب ہوگی۔ مصدر بیدًا وبیادًا از باب ضرب؛ اصل معنی ہے؛ صحرائے بے آب وگیاہ میں کسی چیز کا متفرق اور پراگندہ ہونا، اسی اعتبار سے مکمل بربادی اور ہلاکت کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جملہ تبید بتاویل مصدر ہوکر أظنُّ کا مفعول ہے۔

رُددت : ماضی مجہول واحد متکلم، مصدر ردٌّ از باب نصر، لوٹانا، واپس کرنا، پھیرنا۔

مُنقلبًا : اسم ظرف، لوٹنے کی جگہ، یا مصدر میمی: لوٹنا۔ یہاں اول الذکر مراد ہے۔

☆......اعراب......☆

ما اظن ان تبید هذه ابدًا . ما نافیہ، أظن مضارع مرفوع، أنا ضمیر فاعل، أن حرفِ مصدریہ ناصبہ، تبید مضارع منصوب، ھا برائے تنبیہ، ذہ اسم اشارہ مبنی محل رفع میں اس کا

فاعل، أبدًا ظرفِ زمان منصوب تبید سے متعلق۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......کافروں کو اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا میں عیش وعشرت کے اسباب دے کر، ڈھیل دیتے ہیں، ﴿والذين كذبوا بايٰتنا سنستدرجهم من حيث لا يعلمون﴾ مسلمان اُن کی ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھ کر اُس کو حقیقی زندگی نہ سمجھ لیں، اصل اور حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے، جو بہتر اور دیرپا ہے، ﴿بل تؤثرون الحيوة الدنيا والاٰخرة خير وابقى﴾۔

☆......غنا ومال داری آ جانے کے بعد انسان کو بہت زیادہ خدا کا دھیان رہنا چاہیے، کہ عموماً آدمی عیش وعشرت میں پڑ کر خدا اور اس کی عبادت سے غافل ہو جاتا ہے۔

☆......مال داری کی حالت میں خدا اور اس کی عبادت سے غفلت کا نتیجہ انکارِ قیامت، بعث بعد الموت اور حشر ونشر کے انکار کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے کہ غنی ومال دار کی نظر مادّیت میں پڑ کر، مادّی بن جاتی ہے، ہر چیز میں وہ مادّیت کی نگاہ سے غور کرتا ہے۔ ﴿الهٰكم التكاثرOحتى زرتم المقابرO﴾ . (سورة التكاثر : ۱،۲)

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿ظالم لنفسه﴾ کا کیا مطلب؟

جواب: یعنی شرک میں مبتلا تھا ﴿إن الشرك لظلم عظيم﴾۔ کبر وغرور کا نشہ دماغ میں بھرا ہوا تھا، دوسروں کو حقیر جانتا تھا، اور خدا کی قدرت وجبروت پر نظر نہ تھی، نہ یہ سمجھتا تھا کہ آگے کیا انجام ہونے والا ہے، بس یہی باغ اس کی جنت تھی، جس کو وہ ابدی سمجھتا تھا۔

سوال: یہ دو شخص جن کی مثال بیان ہوئی واقعی موجود تھے؟ یا محض تفہیم کے لیے ان کی مثال فرض کر لی گئی؟

جواب: علماء کے اس سلسلے میں دونوں طرح کے قول ہیں، اور تمثیل کا فائدہ بہر حال حاصل ہے، کہ کافر غنی اور مومن فقیر کی مثال بیان کر کے اس کے ضمن میں دنیا کی بے ثباتی،

کفر وتکبر کی بدانجامی اور ایمان وتقویٰ کی مقبولیت پر متنبہ کرنا مقصود ہے۔

سوال: ﴿ودخل جنته﴾ میں جنة واحد لانے کی کیا وجہ ہے، جب کہ اس کے پاس جنّتین (دو باغ) تھے؟

جواب: (۱) باغ تو دو تھے، مگر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ صرف ایک ہی باغ میں داخل ہوا تھا، ویسے بھی بیک وقت دو باغ میں دخول محال ہے۔ واللہ اعلم!

(۲) دلالتِ حصر مقصود ہے۔ یعنی اپنی جس جنت (باغ) میں وہ داخل ہوا، وہی اس کی دنیاوی جنت تھی، اس کے علاوہ متعلقین سے کیے گئے وعدہ والی جنتِ اخروی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

نیز سابقہ ذکر کردہ جنتین سے کوئی معین جنت مراد نہیں، بلکہ جنسِ جنت مراد ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

۶۴

جلیس صالح کی جلیس سوء کو وعظ نصیحت
مٹی اور گندا پانی انسان کی حقیقت ہے
شرک فطرت کے خلاف ہے......تکبر، فخر وغرور کا علاج

آیت : ۳۷، ۳۸ :

﴿قال له صاحبه وهو يحاوره اكفرت بالذي خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سوّٰك رجلاO لكنا هو الله ربي ولا اشرك بربي احدًاO﴾.

ربط : مومن ساتھی اپنے کافر وملحد ساتھی کو سمجھا رہا ہے کہ خدا نے تیری اصل (آدم علیہ السلام) کو بے جان مٹی سے، پھر تجھ کو زمینی پیداوار کے خلاصہ اور ایک قطرہ ناچیز سے پیدا کر کے زندگی بخشی، جسمانی وروحانی قوتیں دے کر ہٹا کٹا مرد بنایا، پھر بھی تو اس کا انکار کرتا ہے، میں تو اسی کو اپنا پالنہار مانتا ہوں، اس کی خدائی میں کوئی حصہ دار نہیں، اس کے حکم واختیار کے سامنے بھلا کون دم مار سکتا ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

أكفرت : أ ہمزہ استفہام، متضمن ہے معنیٰ استبعاد کو، کفرتَ فعل ماضی واحد مذکر حاضر، مصدر کفرٌ از باب نصر؛ انکار کرنا، نہ ماننا۔

سوّاک : سوّٰی ماضی واحد مذکر غائب، ک ضمیر مفعول، مصدر تسوية از باب تفعیل، برابر کرنا۔

لكنا : دو لفظ ہیں۔ لكن حرفِ استدراک اور أنا ضمیر واحد متکلم خلافِ قیاس ہمزہ کو اس کی حرکت کے ساتھ حذف کر دیا، پھر نون کا نون میں ادغام کیا۔ أنا کے آخر کا الف حالتِ وقف میں تو پڑھا جاتا ہے، مگر حالتِ وصل میں نہیں پڑھا جاتا، اس لیے اس پر گول دائرہ بنایا گیا جو الف کے نہ پڑھے جانے کی نشانی ہے۔

لکنا میں جو لکن ہے وہ بے عمل ہے، اوراس میں جو أنا ہے وہ مبتدا اول ہے، ھو ضمیر شان مبتدا ثانی۔ اللّٰہ مبتدا ثالث، ربي خبر۔

لا أشرک : مضارع منفی بلا واحد متکلم، مصدر إشراک از باب افعال، شریک ٹھہرانا، شریک ماننا۔

☆......اعراب......☆

لکنا ھو اللّٰہ ربي . لکن حرفِ استدراک، أنا ضمیر منفصل مبتدا محل رفع میں، ھو ضمیر شان مبنی محلا مرفوع مبتدا ثانی، اللّٰہ لفظ جلالہ مبتدا ثالث مرفوع، ربي اللّٰہ مبتدا کی خبر مرفوع، علامتِ رفع ضمۂ مقدرہ۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......فقراء مومنین کے لیے اس میں تسکین وتسلی ہے کہ ناداری وفقیری کا غم نہ کریں، اور حصولِ دولتِ عُقبیٰ پر شکر کریں۔ ﴿لئن شکرتم لازیدنکم﴾

☆......اغنیاء مغرورین کے لیے اس میں تنبیہ اور وعید ہے کہ زائل وفنا ہونے والی دولت پر ناز وتکبر نہ کریں۔ ﴿ولئن کفرتم إن عذابي لشدید﴾ .

☆......اگر کوئی مؤمن فقیر، مال دار کافر وفاجر کے پاس جائے، تو اس کی مادیت سے مرعوب نہ ہو، بلکہ اُسے دین کی دعوت دے، نصیحت وخیر خواہی کا معاملہ کرے، ایمان باللّٰہ، اقرارِ وحدانیت، اور شکرِ نعمت کی تلقین کرے۔

☆......جب بھی انسان کے ذہن میں تکبر، فخر وغرور اور اپنی بڑائی کا خیال آئے، تو اپنی اصل پر غور کرے، کہ وہ کچھ بھی نہ تھا، پھر ایک گھٹیا ناپاک قطرہ سے اس کو عدم سے وجود میں لایا گیا، ﴿هل اتى على الانسان حينٌ من الدهر لم يكن شيئًا مذكورًا O انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنٰه سميعًا بصيرًا O﴾. (سورة الدهر: ۱، ۲)
یعنی انسان کی حقیقت وابتدا بھی مٹی ہے اور انتہا بھی مٹی ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

٦٥

خُلقتَ من الترابِ فصرتَ حيًّا ☆ وعُلِّمتَ الفصيحَ مِن الخطابِ
وعُدتَ إلى الترابِ فصرتَ فيه ☆ كأنک ما خرجتَ من الترابِ

☆......عبادت صرف اور صرف خالقِ کون ومکان کی ہونی چاہیے، اس لیے کہ خلق وہدایت، اِطعام وسقا، مرض وشفا، موت وحیات، سب کچھ خالقِ کون ومکان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

☆......اس آیت سے ملحدوں کے نظریۂ ارتقاء (جو ''ڈارون'' کا نظریہ ہے) کا ردّ بھی ہوتا ہے، ڈارون کا کہنا ہے کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ جب کہ انسان کی اصل مٹی ہے، بندر نہیں، نظریۂ ارتقا کے ثبوت کے لیے تاویلات کرنا، یہ سب واہیات، لغویات وفضولیات ہیں، مسلمانوں کو اس نظریہ سے بچنا چاہیے، اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں اس نظریہ کو پڑھایا جاتا ہے، اپنے بچوں کو اس نظریہ کی حقیقت سے مطلع کرنا ہمارا فریضہ ہے۔

☆......طغات، سرکشوں اور خدا کے نافرمانوں کے سامنے اپنے دین وایمان کا کھلم کھلا اعلان کرنا چاہیے، اور اُن کو دعوتِ حق پیش کر دینی چاہیے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿خلقک من تراب﴾ کی مراد واضح کیجیے!

جواب: ﴿خلقک من تراب﴾ أي ؛ خلق أباک من تراب .

سوال: تخلیقِ انسان کے مراحل کیا ہیں؟

جواب: ﴿ولقد خلقنا الاسنان من سلالة من طين O ثم جعلناه نطفة في قرار مكين O ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظامًا فكسونا العظام لحمًا ثم انشأناه خلقًا اٰخر فتبارک اللّٰه أحسن الخٰلقين O﴾ . (سورة المؤمنون : ۱۳ – ۱۴) یعنی سُلالۂ طین، نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام، لحمِ عظام، خلقِ آخر (نفخِ رُوح)۔

سوال: ﴿سوّاک رجلا﴾ کی مراد واضح کیجیے!

جواب: سوّاک یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے استوائے اجزا واعضاء، اعتدالِ قامت وخلق، صحیح الاعضاء، اکملِ صورت، احسنِ صورت اور احسنِ تقویم کے ساتھ حضرتِ انسان کو پیدا کیا۔

سوال: مؤمن بھائی نے دوسرے بھائی سے کہا: ﴿لكنا هو الله ربي ولا اشرك بربي احدا﴾ اس میں تعریض ہے کہ اس کا بھائی مبتلا فی الشرک تھا، جب کہ ﴿ما اظن الساعة قائمة﴾ سے شرک مترشح نہیں ہوتا، صرف کفر ثابت ہوتا ہے؟

جواب: الفاظ میں تو شرک نہیں، البتہ شرکِ اعتقادی ضرور تھا، وہ اس طرح کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے باغ کا پھلنا پھولنا، بڑھنا محض اس کی محنت وقوت کا ثمرہ ہے، کسی اور طاقت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس نے بعد میں اعتراف بھی کیا ﴿يليتني لم اشرك بربي احدا﴾۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جنت کا خزانہ.....نظرِ بد سے حفاظت کا نسخہ

نعمتوں کی حفاظت کا نسخہ.....کھیتی کی حفاظت کا نسخہ

آیت : **۳۹** ، **۴۰** ، **۴۱** : ﴿ولولا اذ دخلت جنتك قلت ما شاء الله لا قوة الا بالله اِن ترن اَنا اقل منك مالا وّولدًاO فعسٰى ربي ان يؤتين خيرًا من جنتك ويرسل عليها حُسبانا من السماء فتصبح صعيدًا زلقًاO أو يصبح ماؤها غورًا فلن تستطيع له طلبًاO﴾ .

ربط : یعنی مال تو اللہ کی نعمت ہے، اس پر اترانے اور کفر بکنے سے آفت آتی ہے، چاہیے تھا کہ باغ میں داخل ہوتے وقت ﴿ما اظن ان تبيد هذه ابدًا﴾ کی جگہ ﴿ما شاء الله لا قوة الا بالله﴾ کہتا، یعنی خدا جو چاہے عطا فرمائے، ہم میں جو کچھ زور وقوت ہے اُسی کی اِمداد واِعانت سے ہے، وہ چاہے تو ایک دم میں سلب کرلے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

لولا : حرفِ تحضیض؛ بغرضِ رغبت مستعمل ہے۔

إذ دخلت : قلتَ کا ظرفِ مقدم ہے۔

ما شاء الله : ما موصولہ، جملہ شاء اللہ صلہ، پھر موصول صلہ مل کر یا تو خبر ہے، اور مبتدا الأمر محذوف ہے۔ یا مبتدا ہیں، اور خبر کائن محذوف ہے، اور باللہ محذوف سے متعلق ہوکر لائے نفی جنس کی خبر ہے۔

إن ترن : إن حرفِ شرط، تَرَ مضارع واحد مذکر حاضر، إن کے آنے سے تَرَ کے آخر سے ي حرفِ علت گر گئی، ن وقایہ ي متکلم ضمیر محذوف مفعول، مصدر رؤية از باب فتح؛ دیکھنا۔

إن ترن أنا : میں أنا ضمیر فصل ہے دو مفعولوں کے درمیان یا مفعولِ اول کی تاکید ہے۔

أن يؤتين : أن ناصبہ، يؤتي مضارع منصوب واحد مذکر غائب۔ ن وقایہ ي متکلم ضمیر

محذوف،مصدر إيتاء از باب افعال عطا کرنا، دینا۔

حُسبَانًا : اس کے دو معنی ہیں:(۱) بھبوکا یعنی لُو کا بگولہ،گرم ہوا کا جھکّڑ۔(۲) عذاب، آفت-لفظ کے اصل معنی ہیں حساب کے مطابق سزا۔اور یہ باب نصر کا مصدر ہے،جس کے معنی ہیں: شمار کرنا۔

فتصبح صعيدًا زلقًا : تصبح فعل ناقص،ضمیر هي مستتر اس کا اسم،اور صعيدًا زلقًا مرکب توصیفی ہوکر خبر۔

زلقًا : الزلق : پھسلن کی جگہ،چکنی سپاٹ زمین،جس میں کچھ نہ ہو،پڑا یعنی ایسی صاف زمین جس پر پیر پھسلنے لگیں۔ زلِق : از باب سمع ونصر،مصدر زلقًا : پھسلنا۔

غورًا : الغور : پانی کا زمین کے اندر اُتر جانا،کسی بھی چیز کا اندر کی طرف چلا جانا،جیسے غارت عينُه: اس کی آنکھ اندر کو دھنس گئی۔

☆......اعراب......☆

ولولا اذ دخلت جنتك . و عاطفہ،لولا حرفِ تحضیض برائے توبیخ،إذ ظرفِ زمان ماضی مبنی محلاً منصوب،قلت کا متعلق،دخلت فعل بافاعل،جنتك مفعول بہ منصوب۔

☆......بلاغت......☆

﴿فتصبح﴾ : فا برائے مفاجات۔ دلت الفاء أن الآفة غير معتادة.یعنی آفت اچانک اور عادت سے ہٹ کر آئی تھی۔

﴿أو يصبح ماؤها غورًا﴾ غورًا میں مبالغہ ہے،بمعنی غائرًا ہے، برائے مبالغہ اسم فاعل پر مصدر کا اِطلاق کیا گیا۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......جب بھی کوئی اچھی چیز دیکھو تو ﴿ما شاء الله لا قوة الا بالله﴾ پڑھ لینا چاہیے۔یعنی حال، مال اور اولاد یہ سب انسان کے مرغوب ہوتے ہیں،تو ان کو دیکھ کر کلمہ

''ماشاءاللہ'' کہنا چاہیے۔

☆......اگر کوئی شخص اپنے مکان، دکان، یا گاڑی وغیرہ پر ﴿ما شاء الله لا قوة الا بالله﴾ لکھے، یا تختی پر لکھ کر لٹکا دے،تو اس کی حفاظت ہوگی۔

☆......﴿ما شاء الله لا قوة الا بالله﴾ یہ کلمہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔اور ایک جگہ ارشادِ نبوی ہے کہ: جب کوئی بندہ" لا حول ولا قوة الا بالله" کہتا ہے،تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:" أسلم عبدي واستسلم "۔(میرے بندہ نے مان لیا، اور میرے احکام کے آگے گردن جھکا دی)۔

☆......انسان کو خوشی و غمی ہر حال میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ انسان اللہ کے ساتھ جیسا ظن وگمان رکھتا ہے، وہ اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتا ہے، حدیث قدسی ہے:" أنا عند ظن عبدي بي "۔

اور مستدرک حاکم کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:" أنا عند ظن عبدي بي، فلظينّ ما شاء"۔

☆......مومنین کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ سے دنیا وآخرت کی بھلائی کے طالب رہیں،قسمت میں جو کچھ لکھا ہے اس پر رضامند رہیں، اللہ کے فضل پر یقین رکھیں، اور اللہ کی رحمت ونعمت پر خوشی کا اِظہار کریں؛﴿ربنا اٰتنا في الدنيا حسنة وفي الأخرة حسنة وقنا عذاب النار﴾ . (سورة البقرة : ۲۰۱)

☆......تحصیلِ رزق کے لیے توفیقِ الٰہی، مددِ الٰہی، اور تیسیرِ الٰہی ضروری ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿ما شاء الله لا قوة إلا بالله﴾ کے فوائد وفضیلت بتائیں!

جواب: ☆...... یہ بڑا بابرکت جملہ ہے، حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنا کوئی مال دیکھے اور وہ اس کو پسند آئے اور وہ ﴿ما شاء الله لا قوة إلا بالله﴾ کہے،تو اس مال کو کبھی

کوئی آفت نہ پہنچے گی؛ یعنی نظر بد نہ لگے گی۔

☆......دوسری روایت میں ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی کو مال وعیال میں کوئی نعمت عطا فرمائیں، اور وہ ﴿ما شاء اللّٰه لا قوة إلا باللّٰه﴾ کہے، تو تا حیات اللہ تعالیٰ اس نعمت سے ہر آفت دُور فرما دیتے ہیں۔

☆......امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جب بھی اپنے مکان میں داخل ہوتے، ماشاء اللہ کہہ کر داخل ہوتے، کسی نے وجہ دریافت کی، تو آپ نے یہ آیتِ کریمہ پڑھی، یعنی امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک گھر میں داخل ہونے والے کو بھی یہ ذکر کرنا چاہیے۔

☆......لاحول ولاقوۃ إلا باللہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

سوال: ﴿اِن ترن اَنا﴾ میں یائے متکلم کے بعد ''انا'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس مقام پر ''انا'' خبر کو مخبر عنہ میں محصور کرنے کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿اني أنا ربک﴾ . ﴿اني انا اللّٰه﴾ میں ہے۔

سوال: لفظ ﴿حُسبانا﴾ کی تفسیر کیا ہے؟

جواب: حُسباناً؛ اس لفظ کی تفسیر بقول قتادہ رحمہ اللہ؛ مطلق عذاب۔ بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما؛ آگ۔ اور بقول بعض مفسرین؛ پتھراؤ۔ نیز اس کے بعد ﴿احیط بثمره﴾ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے باغ اور تمام مال وزر اور سامانِ عیش پر کوئی بڑی آفت آپڑی، جس نے سب کو برباد کر دیا، قرآنِ کریم نے صراحۃً کسی خاص آفت کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہ ہے کہ کوئی آسمانی آگ آئی، جس نے سب کو جلا دیا، جیسا کہ لفظ ''حُسبان'' کی تفسیر حضرت ابن عباس سے بھی آگ منقول ہے۔ واللہ اعلم!

سوال: ﴿فعسٰی ربي ان یؤتین خیرًا من جنتک﴾ کی وضاحت کریں!

جواب: خیر یعنی جنت یا تو دنیا میں دے گا۔ یا آخرت میں دے گا۔ یا دنیا وآخرت دونوں جگہ دے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تکبر کی سزا......خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں!
اب پچھتائے کیا ہووت ہے جب چڑیا چگ گئیں کھیت!

آیت: ۴۲، ۴۳، ۴۴:

﴿واحیط بثمره فاصبح یقلب کفیه علی ما انفق فیها وهي خاویة علی عروشها ویقول یلیتني لم اشرک بربي احدًاO ولم تکن له فئة ینصرونه من دون اللّٰه وما کان منتصرًاO هنالک الولایة للّٰه الحق هو خیرٌ ثوابًا وخیرٌ عقبًاO﴾ .

ربط: گزشتہ آیت میں مردِ صالح نے اسے نصیحت کی تھی کہ تکبر وشرک نہ کر، ورنہ آفتِ سماوی نازل ہو سکتی ہے، چناں چہ ایسا ہی ہوا، اور رات کے وقت آفتِ سماوی آگ کی شکل میں آئی، سب کچھ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا، مال خرچ کیا تھا پونجی وسرمایہ بڑھانے کو وہ اصل سرمایہ بھی کھو بیٹھا۔ پھر پچھتانے لگا، لیکن اب پچھتائے کیا ہووت ہے جب چڑیا چگ گئیں کھیت، یہ افسوس وندامت بھی خدا سے ڈر کر نہیں، محض دنیوی ضرر پہنچنے کی بنا پر تھی۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

أحیط: ماضی مجہول واحد مذکر غائب، از بابِ افعال۔

خاویة: اسم فاعل واحد مؤنث، کھوکھلی، افتادہ، گری ہوئی۔ مصدر خواءٌ از بابِ ضرب، اندر سے کھوکھلا ہونا، گر پڑنا، گھر کا خالی ہونا۔

عروشها: عرش کی جمع ہے، ٹٹی، لکڑی یا لوہے کی جالی جس پر انگور کی بیل چڑھائی جائے۔ چھت۔ شامیانہ۔ خیمہ۔ سائبان۔، اس کا اکثر استعمال بانس کے سائبان یعنی چھپر کے لیے ہوتا ہے۔

فئة: گروہ، بقول امام راغب: وہ گروہ جو آپس میں مددگار ہو، اور ایک دوسرے کی طرف مدد کرنے کے لیے لوٹے۔

لم تكن له فئة : قراء حضرات کے نزدیک اس میں دو قرأتیں ہیں:

(١) بعض قراء **لم تکن** (بالتاء) مؤنث پڑھتے ہیں، اس صورت میں فعل فاعل میں مطابقت ہے، **لم تکن** اور **فئة** میں مطابقت ہے، کہ **فئة** مؤنث ہے، تو **لم تکن** بالتاء بھی مؤنث ہے۔

(٢) اور بعض قراء اسے **لم یکن** (بالیاء) مذکر پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ لم یکن فعل مذکر اور فئة فاعل مؤنث ہے، دونوں میں مطابقت نہیں ہوئی، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ **لم تکن** اور **فئة** میں فصل ہے، اس لیے مطابقت ضروری نہیں ہے۔

منتصرًا : اسم فاعل واحد مذکر، بدلہ لینے والا۔ غالب۔ مصدر انتصار از باب افتعال۔ مدد طلب کرنا۔ ظالم سے **انتصار** کے معنی ہیں: سزا دینا۔

الولاية : مصدر از باب حسب، **ولي يلي وِلاية و وَلاية الشيء وعلى الشيء** : والی ہونا، متصرف ہونا، کارساز ہونا۔

عُقبًا : عاقبت، ثواب، انجام، بدلہ، علامہ احمد فیومی نے **المصباح المنير** میں تصریح کی ہے کہ **عُقبٌ عاقبة** ہی کی تخفیف ہے، اور امام راغب نے **المفردات** میں تحریر فرمایا ہے کہ **عُقبٌ** اور **عُقبٰى** دونوں کا استعمال ثواب کے ساتھ مخصوص ہے۔ **عقبا** : تمیز ہے۔

☆......اعراب......☆

واحيط بثمره . و استینافیہ، أحیط فعل ماضی مجہول مبنی، ضمیر مستتر اس کا نائب فاعل، **بثمره** جار مجرور **أحيط** سے متعلق، ھا ضمیر مضاف الیہ۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿**أحيط بثمره**﴾ **مبنيًا للمفعول أصابه ما أهلكه وأفسده** . (عربی میں لفظ **أحيط** عموماً مجہول استعمال ہوتا ہے، فاعل بتانا ہی ہوتو کہتے ہیں: "**أحاطه الله**" اللہ نے اس کو تباہ و برباد کردیا)۔

☆......﴿**ما أنفق فيها**﴾ **أي ؛ في الجنة** . جس باغ پر خرچ کیا۔

☆......﴿**وهي خاوية**﴾ **أي ؛ الجنة** . وہ باغ۔

☆......﴿**عروشها**﴾ **أي ؛ عروش الجنة** . اپنی ٹٹیوں پر الٹا پڑ گیا۔

☆......بلاغت......☆

﴿**يقلب كفيه على ما انفق فيها**﴾ **كناية عن التحسُّر والندامة؛ لأن النادم يضرب بيمينه على شماله** . یہ جملہ حسرت وندامت سے کنایہ ہے، اس لیے کہ نادم وپشیمان شخص ندامت کے وقت اپنے سیدھے ہاتھ کو اُلٹے ہاتھ پر مارتا ہے۔

" **هذا يوصف به النادم** " یہ ایک محاورہ ہے، جس کے ذریعے نادم وپشیمان شخص کی حالت بیان کی جاتی ہے۔ (کنایہ کی تعریف ماقبل میں گزر چکی ہے)

☆......پیغام واحکام......☆

☆......جب انسان پر اُس کے معاصی کے سبب کوئی آفت نازل ہوجاتی ہے، تو پھر دنیا کی کوئی سپر پاور طاقت بھی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، جیسا کہ سُنامی، کٹرینا اور امریکہ وافریقہ میں آنے والے طوفان، جنہوں نے مادّیت کی آنکھیں کھول دیں کہ تمام اسبابِ دنیوی جمع تھے، لوگ شیطانی دھوکے میں پڑے تھے کہ اب ہم ہر طرح کی آفت سے مامون ہیں، لیکن قدرت نے اپنی قہاریت بتلادی۔

☆......ولایت، سلطنت اور قدرت بلاشرکتِ غیر، سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کی ذات برحق ہے، ثواب اور بدلہ وہی دیتا ہے، اور امیدیں وآرزوئیں بھی اسی سے رکھنی چاہیے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿**ويقول يليتني لم اشرک بربي احدًا**﴾ سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ شخص بعد میں ایمان لایا ہو؟ مفسرین کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: مفسرین فرماتے ہیں کہ افسوس وندامت بھی خدا سے ڈر کر نہیں، محض دنیوی

ضرر پہنچنے کی بنا پر تھی؛ یعنی وہ اپنے شرک پر باقی تھا، البتہ ''تفسیر موضوعی'' میں علامہ سعدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اللہ پاک کی رحمت، لطف وکرم اور فضل سے کوئی بعید نہیں کہ نقصان ہوجانے کے بعد اسے توبہ وانابت کی توفیق عطا فرمائی ہو، کیوں کہ اللہ جب کسی بندہ کے ساتھ خیر وبھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں، تو اسے دنیا میں سزا جلد ہی دے دیتے ہیں۔

سوال: ﴿ولم تكن له فئة ينصرونه من دون الله﴾ میں دون کا کیا معنی ہے؟

جواب: لفظ ''دون'' کلامِ عرب میں غیر (علاوہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اہلِ عرب کہتے ہیں: ''مال دون هذا'' اور ''من دون هذا'' یعنی غير هذا۔ جیسے آیت ﴿ولهم اعمال من دون ذلک﴾ (وہ اس کے علاوہ عمل کرتے ہیں)۔ اور لفظ ''دون'' قبل (آگے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے: '' المدينة دون مكة '' (مدینہ مکہ سے آگے ہے)۔ اور کہتے ہیں: '' لا أقوم من مجلسي دون أن تجيء '' (آپ کے آنے سے پہلے نہیں اُٹھوں گا)۔ '' لا افادقک دون أن تعطيني حقي '' (اپنا حق لینے سے پہلے میں آپ سے جدا نہیں ہوگا)۔

البتہ لفظِ دون قبل کے معنی میں قرآنِ کریم میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ صرف غیر کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

سوال: ﴿هنالک الولاية لله الحق﴾ میں یوم القیامۃ کی ولایت ونصرت کو اللہ کے ساتھ خاص کرنے کا کیا فائدہ؟ جب کہ ولایت ونصرت تو دنیا وآخرت دونوں جگہ اللہ ہی کو ہوتی ہے؟

جواب: دنیا میں اس کے دعوے دار بہت سارے ہیں، قیامت کے دن یہ سب دعوے دار بھی ختم ہوجائیں گے۔ اس وقت بادشاہت صرف اللہ ہی کے لیے ہوگی، کوئی مجازی بادشاہ نہیں ہوگا۔

سوال: ﴿هو خيرٌ ثوابًا وخيرٌ عقبًا﴾ ثواب دینے والا تو اللہ ہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ

کا ثواب سب سے اچھا ہونے کا کیا مطلب؟

جواب: یہ علیٰ سبیل الفرض والتقدیر ہے۔ یعنی بالفرض والمحال اگر اللہ کے علاوہ کوئی ثواب دے سکتا، تب بھی اللہ تعالیٰ کا جزا وثواب دنیا اس سے اچھا ہوتا ہے، اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز ہوجاتی، تب بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت نتیجہ اور انجام کے لحاظ سے اس سے کئی گنا بہتر ہوتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دنیاوی زندگی کی مثال......مال ودولت فانی، عملِ صالح باقی

نقصان سے بچنے کا وظیفہ......فتنہ کے زمانہ کی دعاء

آیت: ۴۵، ۴٦: ﴿واضرب لهم مثل الحيٰوة الدنيا كماء انزلنٰه من السماء فاختلط به نبات الارض فاصبح هشيمًا تذروه الرِّيٰح وكان الله على كل شيء مقتدرًا O المال والبنون زينة الحيوة الدنيا والبٰقيٰت الصّٰلحٰت خيرٌ عند ربک ثوابًا وخيرٌ املاO﴾ .

ربط: دنیا کے مال وجاہ کے حقیر، فانی اور بے لذت وبے حقیقت ہونے پر ایک تمثیل ابھی اوپر گزر چکی، جو مذاق وفہمِ عرب کے خاص موافق تھی۔ اب دوسری تمثیل بیان ہورہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایجاد واِعدام، اِبقا واِفنا سب پر یکساں قادر ہے، جب چاہے ہست سے نیست کردے، اور نیست سے ہست میں لے آئے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

اختلط: از باب افتعال، مصدر اختلاط: ملنا۔

هشيمًا: صفت مشبہ، فعیل بمعنی مفعول۔ شکستہ، ریزہ ریزہ، بھوسہ۔ هَشَمَ: هشمًا از باب ضرب؛ ہر خشک چیز کو ریزہ ریزہ کرنا۔

تذروہ : مضارع واحد مؤنث غائب، ہ ضمیر مفعول، مصدر ذَرْوٌ؛ بلند کرنا، اُڑنا، اُڑانا۔

مقتدرًا : اسم فاعل، مصدر اقتدار از باب افتعال، قابو یافتہ، پوری قدرت رکھنے والا۔

الباقیات : کا موصوف **الكلمات یا الأعمال** مقدر ہے۔

خیرٌ : اسم تفضیل ہے، اور تفاضل کفار کے خیال کے اعتبار سے ہے، ورنہ حقیقت میں دنیا کی چیزوں میں کوئی خیریت نہیں۔

أملا : اسم واحد، جمع آمالٌ، توقُّع، امید۔

☆......اعراب......☆

فاصبح هشيمًا تذْروه الرِّيٰح . فا عاطفہ، أصبح فعل ناقص ناسخ، ضمیر مستتر اس کا اسم، هشيما أصبح کی خبر منصوب، تذروه مضارع مرفوع الرياح فاعل مرفوع تذروه میں ضمیر ھا مفعول بہ محلا منصوب۔

☆......بلاغت......☆

﴿واضرب لهم مثل الحياة الدنيا كماء انزلناه﴾ میں بھی تشبیہ تمثیلی مقلوب ہے۔ (تشبیہ تمثیلی کی تعریف کے لیے دیکھئے! آیت نمبر:۳۲، بلاغت)

﴿المال والبنون زينة الحيوة الدنيا﴾ میں فنِ جمع ہے، یعنی متکلم ایک ہی حکم میں دو یا دو سے زائد چیزوں کو ایک ساتھ جمع کر دیتا ہے۔ جیسے آیتِ مذکورہ میں مال و اولاد کو حکمِ واحد یعنی زینتِ حیاتِ دنیوی کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......جو لوگ دنیاوی مال و دولت، جاہ و منصب ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں، وہ جان لیں کہ دنیا و مافیہا میں استقرار و استمرار نہیں۔ جو شخص پانی میں داخل ہوتا ہے، تو اپنا دامن پانی میں بھیگنے سے نہیں بچا پاتا، ایسے ہی جو شخص بھی دنیاوی مال و دولت سے نوازا جاتا ہے، فتنوں و آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے، اس لیے انسان بقدر کفاف دولتِ دنیوی پر قناعت کرے، اور

زائد جو نقصان دہ ہے اس سے احتراز کرے، پانی جب سر سے اُوپر چڑھتا ہے، تو موت کا پیغام لاتا ہے، ایسے ہی دنیا کا بھی حال ہے۔ بزرگانِ دین دنیاوی مال و دولت کی مثال کشتی سے دیتے ہیں کہ جب تک کشتی پانی پر رہتی ہے، چلتی رہتی ہے، اور جب پانی کشتی کے اندر آجاتا ہے، تو کشتی کے ڈوبنے کا سبب بنتا ہے، ایسے ہی دنیاوی مال و دولت کی محبت دل میں گھر نہ کرے، ورنہ انسان کو لے ڈوبے گی۔ صحیح مسلم شریف کی راویت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: " **قد أفلح من أسلم ، ورُزِق كفافًا ، وقنّعه الله بما آتاه** "۔ یعنی وہ شخص کامیاب ہے جو اسلام لائے، بقدرِ کفاف اُسے رزق ملے، اور اللہ پاک اس کو جو کچھ عطا کرے، اس پر قناعت کی توفیق عطا فرمائے۔

☆......قرآنِ مجید کا حسنِ بیان ملاحظہ ہو کہ ایک ہی آیت میں زینتِ حیات اور متاعِ حیات کا تذکرہ کر کے فرمایا کہ یہ سب کچھ دھوکے کا سامان ہے، جب کہ آخرت کی نعمتیں دائمی ہیں، گویا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا مٹی گارے سے بنی اور فانی ہے، جب کہ جنت سونے چاندی سے بنی اور باقی رہنے والی ہے، پس عقل مند آدمی کو چاہیے کہ آخرت کو دنیا کی خاطر برباد نہ کرے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿البقيٰت الصّٰلحٰت﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: **قال أبو جعفر عن ابن عباس أنه قال : " الباقيات الصالحات ؛ الصلاة والصوم والحج والغزو والتهليل والتسبيح " . ولا يمتنع شيء من هذا عند أهل اللغة ؛ لأنه كل ما بقي ثوابه جاز أن يقال له هذا** . باقیات صالحات سے مراد؛ نماز، روزہ، حج، غزوہ، تہلیل اور تسبیح ہے، اہلِ لغت کے نزدیک ان میں سے ہر ایک پر باقیاتِ صالحات کا اِطلاق ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر وہ عمل جس پر ثواب ملتا ہے، وہ باقیاتِ صالحات کہے جانے کے لائق ہے۔

اور " **التفسير الموضوعي لسور القرآن الكريم** " میں ہے: باقیاتِ صالحات

سے مراد وہ تمام اعمالِ خیر، اعمالِ صالحہ، طاعاتِ واجبہ، مستحبہ، جن کا ثواب وثمرہ انسان کو ملتا ہے، مثلاً: نماز، روزہ، زکوۃ، صدقات، حج وعمرہ، تلاوت وذکر، طلبِ علمِ نافع، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، صلہ رحمی، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، حقوقِ زوجیت کی ادائیگی، حقوقِ اولاد، اور تمام حقوق، اور احسان وخیرات کی تمام صورتیں۔

سوال: حضرت ابن عباس وغیرہ مفسرین کا ”باقیات صالحات“ کے سلسلے میں کیا قول ہے؟

جواب: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے کہ باقیاتِ صالحات سے کلماتِ ماثورہ: ” **سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله اكبر ، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم** “ مراد ہیں، جس کی تائید مرفوع حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔

(۲) بعض لوگوں نے باقیات صالحات سے نمازِ پنج گانہ کو بھی مراد لیا ہے۔

(۳) وہ تمام اعمالِ صالحہ مراد ہیں جن کے ثمرات ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، جیسے کسی کو علم سکھایا جائے، جو جاری رہے، یا کوئی نیک رسم جاری کی جائے، یا مسجد یا کنواں یا سرائے، یا باغ یا کھیت خدا کے لیے وقف کر جائے، یا اولاد کو تربیت کر کے صالح باعمل عالم چھوڑ جائے، تو یہ سب صدقاتِ جاریہ ہیں، جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی اس کو ملتا رہے گا، اور یہی قول سب اقوال میں ارجح، اَصح، اَعم، واَشمل ہے، جس میں نماز، اعمالِ حج، روزہ اور کلماتِ ماثورہ وغیرہ، اور تمام پاکیزہ اقوال وافعال جن کا ثمرہ آخرت کے لیے باقی رہے، وہ سب باقیاتِ صالحات میں داخل ہیں، اور اسی قول کو امام طبری اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ باقیاتِ صالحات کی تلقین سے آخرت کی ترغیب مراد ہے کہ اس کے لیے تیاری کریں۔

سوال: ثواب کسے کہتے ہیں؟ تعریف کیجیے!

جواب: **الثواب ؛ ما يستحق به الرحمة والمغفرة من الله تعالى ، والشفاعة من الرسول** ﷺ . یعنی جس عملِ خیر سے انسان رحمت ومغفرتِ خداوندی اور شفاعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستحق ہو، وہ ثواب ہے۔

العذاب ؛ كل ما شقّ على الإنسان ومنعه من مراده . وفي المفردات : هو الإيجاع الشديد . یعنی ہر وہ کام جو انسان پر شاق گزرے اور انسان کو اپنی مراد حاصل کرنے سے روک دے۔ سخت تکلیف کو بھی عذاب کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ ہر عملِ خیر وشر سے جو اثر انسان پر مرتب ہوتا ہے، اس کا نام ثواب وعذاب ہے، اور وہ ایک دائمی اور ثابت وقائم رہ جانے والی حقیقت ہے۔

سوال: ﴿**المال والبنون زينة الحيوة الدنيا والبقيٰت الصّٰلحٰت خيرٌ**﴾ الخ سے تو مال واولاد کی بالکلیہ مذمت ہو رہی ہے، جو انسان کے لیے ذریعۂ زینت ہوتے ہیں؟

جواب: آیتِ مذکورہ میں مطلقًا ممانعت ومذمت مقصود نہیں، اصل مقصود باقیاتِ صالحات کی قدر ومنزلت اور فانیاتِ زائلات (مال واولاد) کی حقیقت بتانا ہے، کہ فانیاتِ زائلات انسان کے لیے فتنہ وآزمائش ہے، اگر کسی انسان کو اللہ نے مال واولاد سے نوازا ہے، اور وہ حدود اللہ کا لحاظ کرتے ہوئے اُن کے حقوق ادا کرتا ہے، تو اب وہ قابلِ مذمت نہیں بلکہ مطلوب ومستحسن ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جب قیامت آئے گی!......محشر میں حاضری

آیت : ۴۷ ، ۴۸ : ﴿ویوم نُسیِّر الجبال وتری الارض بارزةً وحشرنٰھم فلم نغادر منھم احدًاO وعُرضوا علی ربک صفًّا لقد جئتمونا کما خلقنکم اول مرة بل زعمتم الَّن نجعل لکم موعِدًاO﴾ .

ربط : یعنی جب قیامت آئے گی، تو پہاڑ جیسی سخت مخلوق بھی اپنی جگہ سے چلائی جائے گی، بلکہ اس کی بھاری بھاری چٹانیں دھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں اُڑتی پھریں گی، غرض زمین کے سارے اُبھار سطحِ زمین کے برابر اور ہموار ہو جائیں گے، اور کوئی شخص خدائی عدالت سے غیر حاضر نہ ہو سکے گا۔ اور لوگوں کو قبروں سے برہنہ بدن، برہنہ پیر اور غیر مختون حالت میں اُٹھا کر میدانِ محشر میں لے جایا جائے گا۔﴿کما بدأنا اول خلق نعیده﴾ . (سورة الأنبياء : ۱۰۴) کوئی کسی کو نہ دیکھے گا، بلکہ ہر ایک شخص کی ایک الگ ہی شانِ بے نیازی ہوگی﴿لکل امرئ منھم یومئذ شاْنٌ یغنیه﴾ . (سورة عبس :۳۷)

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

نُسیِّر : از بابِ تفعیل مصدر تسییرٌ؛ چلانا۔ تسییر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جو سائر یعنی چلنے والے کے امر و اختیار اور اِرادے سے ہو، جیسے:﴿ھو الذي یسیر کم﴾ اللہ وہ ذات ہے جو تم کو چلاتی ہے۔

(۲) دوسرے وہ جو بذریعہ قہر و تسخیر ہو، جیسے؛﴿یوم نسیر الجبال﴾ جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے۔

بارزة : اسم فاعل واحد مؤنث، از باب نصر؛ کھلی جگہ میں نکلنا، ظاہر ہونا۔ مصدر بُروزٌ ہے۔

فلم نغادر : فا حرفِ عطف برائے تعقیب ہے۔ **لم نغادرُ :** مضارع منفی بلم جمع متکلم از باب مفاعلة، مصدر مغادرةٌ؛ چھوڑنا۔ رہ جانا۔

جب کسی چیز کا آئندہ آنا یقینی ہوتا ہے اور مستقبل قریب میں ضرور آنے والی ہوتی ہے، تو اس کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کرلیا جاتا ہے، گویا وہ چیز ہو چکی، **نغادر** مضارع کو **لم** نے ماضی بنا دیا۔ اور بجائے مستقبل کے ماضی استعمال کرنے کی وجہ یہی ہے کہ قیامت کے دن کسی کو نہیں چھوڑا جائے گا۔

جئتمونا : ماضی جمع متکلم، **کم** ضمیر مفعول، مصدر مجیئة از باب ضرب، آنا۔

حشرناھم ، عُرضوا : فعل ماضی بمعنی مستقبل ہیں، تحقُّقِ وقوع کی طرف مشیر ہیں، اس لیے ماضی لائے گئے ہیں۔

ألَّنْ : یہ دو لفظ ہیں:

(۱)أن مخفَّفه من المثقَّلة، اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ أي : أنه۔ اور جملہ لن نجعلَ خبر ہے۔

(۲) لن حرفِ ناصب ہے۔ نون کا لام میں ادغام کیا گیا، اور قرآنی رسم الخط میں ن کو رسمًا حذف کیا گیا ہے۔

موعِدًا : **نجعل** کا مفعولِ اول مؤخر، اور **لکم** مفعولِ ثانی ہے۔

☆......اعراب......☆

ویوم نُسیِّر الجبال وتری الارض بارزةً . و استینافیہ یا عاطفہ، یوم مفعول بہ اذکر فعل محذوف کا، نسیر مضارع مرفوع، نحن ضمیر فاعل برائے تعظیم، الجبال مفعول بہ منصوب، و عاطفہ، تری مضارع مرفوع، علامتِ رفع ضمۂ مقدرہ الف کے ساتھ، أنت ضمیر فاعل، الأرض مفعول بہ منصوب، بارزة حال منصوب۔

☆......بلاغت......☆

﴿بل زعمتم﴾ بل : اِضراب وانتقال من کلام إلی کلام، برائے تبکیت وتقریع منکرینِ بعث۔ أي : زعمتم في الدنیا أن لن تبعثوا. بل؛ برئے اضراب ہے، یعنی ایک کلام سے دوسرے

کلام کی طرف منتقل ہونا،کلام کا رُخ موڑ نا،مقصد منکرین بعث بعد الموت کی تبکیت وتقریع ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......ایک فرقہ تو وہ ہے جو بعث بعد الموت اور قیامت کا قولاً وعملاً انکار کرتا ہے،جس کا آیتِ مذکورہ بالا میں ذکر ہوا،اور مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو قولاً تو بعث وقیامت کا اقرار کرتے ہیں،لیکن عملاً اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کرتے،جب کہ ایسے شخص کو عقل مند کہا گیا ہے جو موت سے پہلے موت کی تیار کرے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" **الکیس من دان نفسہ ، وعمل لما بعد الموت** " .

☆......محشر کے میدان میں کل ایک سو بیس (۱۲۰) صفیں ہوں گی،جن میں سے اسی (۸۰) صفیں امتِ محمدیہ کی ہوں گی۔

☆......سوالات......☆

سوال:﴿**ویوم نُسیِّر الجبال وتری الارض بارزة وحشرنٰھم**﴾ میں **نسیر** اور **تری** کو صیغہ مضارع اور **حشرناھم** کو صیغہ ماضی کے ساتھ کیوں تعبیر کیا گیا؟

جواب:**حشرناھم** کو ماضی لانے کی وجہ یہ ہے کہ،یہ حشر پہاڑوں کے چلانے اور زمین کے میدان ہونے سے پہلے ہوگا،تاکہ سب لوگ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

سوال:﴿**وعُرضوا علی ربک صفًّا**﴾ کے کیا معنی ہیں؟

جواب:(۱)صفًّا کے معنی کھڑے ہونے کی حالت میں بھی ہو سکتے ہیں،یعنی بارگاہِ خداوندی میں سب کی حاضری حالتِ قیام میں ہوگی،وہاں سب کو کھڑا رہنا ہوگا،کوئی بیٹھ نہ سکے گا۔

(۲)صفًّا کے معنی قطار در قطار کے بھی ہو سکتے ہیں،جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اہلِ جنت کی ایک سو بیس (۱۲۰) صفیں ہوں گی،جن میں سے اسی (۸۰) صفیں امتِ محمدیہ کی ہوں گی،یعنی اس امت کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اعمال ناموں کی تقسیم......چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی نہ کرو

آیت : ۴۹ : ﴿**ووُضع الکتٰب فتری المجرمین مُشفقین مما فیہ ویقولون یٰویلتنا ما ل ھذا الکتٰب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصٰھا ووَجدوا ما عملوا حاضرًا ولا یظلم ربک احدًاO**﴾ .

ربط : یعنی اعمال نامہ ہر ایک کے ہاتھ میں دیا جائے گا،اس میں اپنے گناہوں کی فہرست پڑھ کر مجرم خوف کھائیں گے،وہ دنیا میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے،تب بھی وہاں سب کچھ پڑھ لیں گے۔ذرّہ ذرّہ عمل آنکھوں کے سامنے ہوگا۔کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا کہ کسی کی ادنیٰ سی نیکی لکھنے سے رہ جائے،یا حقیر سی بدی بھی کسی کے نامۂ اعمال میں بڑھادی جائے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

مشفقین : اسم فاعل جمع مذکر بحالتِ نصب،مصدر **إشفاق** از باب افعال،ایسی محبت کرنا جس میں ڈر لگا ہوا ہو،اس معنی کے دو جز ہیں:(۱)محبت،(۲)خوف۔

اگر اس کے بعد **مِنْ** مذکور ہو تو،خوف کا معنی ظاہر ہوتا ہے،جیسے **أشفق منہ**؛اس سے ڈرا۔اور اگر **علٰی** یا **فِي** مذکور ہو،تو محبت کے معنی کا زیادہ ظہور ہوتا ہے۔

مال ھذا الکتاب : **ما** استفہامیہ مبتدا، استفہام برائے تعجب۔ لام جارہ، **ھذا الکتٰب** اسم اشارہ ومشارٌ الیہ مل کر مجرور،جار مجرور محذوف سے متعلق ہو کر خبر،اور جملہ **لا یغادر** یا تو حالیہ ہے یا مستانفہ،تقدیرِ عبارت یوں ہے:**أي شيء ثبت لھذا الکتاب حال کونہ لا یغادر الخ** .

لِ ھذا : یہ لامِ جارہ قرآنی رسم الخط میں ہذا سے علیحدہ لکھا جاتا ہے،اور یہ امرِ توقیفی ہے۔

صغیرة ولا کبیرة : دونوں کا موصوف **ھنةٌ** (چیز) محذوف ہے، **ھنةٌ** مؤنث ہے **ھنٌ** کا، یا **فِعلةٌ** (کام) مقدر مانا جائے۔تقدیرِ عبارت یہ ہوگی:**ھنة صغیرة ولا ھنة**

كبيرة . يا فعلة صغيرة و لا فعلة كبيرة .

☆...... اعراب ......☆

يٰويلتنا ما ل هذا الكتٰب . یا حرفِ ندا برائے تحسُّر، ویلتنا منادیٰ متحسّر بہٖ مضاف منصوب، نا ضمیر مضاف الیہ، ما اسم استفہام مبنی محلاً مرفوع مبتدا، ل حرفِ جر، ہا حرفِ تنبیہ، ذا اسمِ اشارہ مبنی محلاً مجرور مبتدا کی خبر، الکتٰب ذا سے بدل یا عطفِ بیان مجرور۔

☆...... بلاغت ......☆

﴿یٰویلتنا﴾ میں استعارہ مکنیہ تخییلیہ ہے۔ (اس کی تعریف ماقبل میں گزر چکی ہے)

﴿ما ل هذا الكتٰب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصٰها﴾ میں استعمال العام في النفي والخاص في الإثبات ہے۔ یعنی صغیرہ پر مؤاخذہ کا وجود مؤاخذۂ کبیرہ کو مستلزم ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......ہم سب کو چاہیے کہ قیامت کی پیشیوں کی فکر کریں۔ قیامت کے دن تین پیشیاں ہوں گی:

پہلی پیشی گناہوں سے بری ہونے کے لیے جھگڑنے اور اپنے اپنے عذر پیش کرنے والوں کی ہوں گی۔

دوسری پیشی حضرت آدم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے سامنے اتمامِ حجت کے طور پر ہوگی، تاکہ دشمنوں کو عذاب دینے کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

تیسری پیشی صرف مومنوں کی ہوگی، جو ان کی مغفرت کے لیے ہوگی، البتہ تنہائی میں اللہ ان کو طلب کر کے کچھ زیادہ سرزنش کر دے گا، مومن کو اپنا گناہ دیکھ کر بڑی شرم آئے گی، اور خجالت کا مزہ چکھنے کے بعد پھر اللہ ان کو معاف کر دے گا، اور ان سے راضی ہو جائے گا۔

☆......صغائر و کبائر کے سلسلے میں اہل علم مختلف ہیں:

(۱) جمہور اہل علم کے نزدیک ذنوب و معاصی صغیرہ و کبیرہ ہوتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ بالا سے قولِ اول کی ترجیح ہوتی ہے، یعنی ذنوب و معاصی صغیرہ و کبیرہ دو طرح ہوتے ہیں۔

(۲) بعض اہل علم کہتے ہیں کہ ذنوب و معاصی صرف کبیرہ ہی ہوتے ہیں، صغیرہ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ قولِ مرجوح ہے۔

(۳) بعض اہل علم کے نزدیک ذنوب و معاصی کی تین قسمیں ہیں: صغیرہ، کبیرہ، اور فاحشہ۔ یہ قول غیر مستند ہے، کتاب و سنت اور قولِ صحابی سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿وَوُضِع الكتٰب﴾ میں ''کتاب'' سے مراد کونسی کتاب ہے؟

جواب: کتاب سے مراد ''کتاب الاعمال/ نامۂ اعمال'' ہے۔ (الموضوعي)

سوال: ﴿لا يغادر صغيرة ولا كبيرة﴾ میں ''صغیرۃ'' کو مقدم کیوں کیا گیا؟

جواب: تحذیر مقصود ہے کہ جب صغیرہ گناہ معاف نہیں ہوگا، اس پر بھی پکڑ ہوگی، تو کبیرہ گناہ تو بدرجۂ اَولیٰ قابلِ مؤاخذہ و موجبِ عقاب ہے۔ اس لیے صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ؛ دونوں سے اجتناب ضروری ہے۔

سوال: کبیرہ و صغیرہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: **کبیرہ**: ہر وہ گناہ جو دنیا میں سزا کا باعث ہو، جیسے قتل زنا اور چوری، یا اس کے ارتکاب پر آخرت میں عذاب یا غضب کی وعید ہو، یا رسول اللہ ﷺ نے اس کے کرنے والے پر لعنت فرمائی ہو۔

صغیرہ: کبیرہ کے علاوہ جتنے گناہ ہیں وہ صغیرہ ہیں، جیسے لَمَم یعنی ''ہلکے ہلکے گناہ''، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿الذين يجتنبون كبائر الإثم والفواحش إلا اللمم﴾. (سورۂ نجم: ۳۲) ''جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائیوں سے بچے رہتے ہیں، مگر ہاں یہ کہ ہلکے ہلکے گناہ ہو جائیں''۔

سوال: وہ کبائر جن کا ذکر قرآن و احادیث میں موجود ہے، کتنے ہیں کون کونسے؟

جواب: ایسے کبائر تیرہ (۱۳) ہیں:

(۱) اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ (۲) والدین کی نافرمانی کرنا۔ (۳) جھوٹی گواہی دینا۔ (۴) ناحق کسی جان کو قتل کرنا۔ (۵) جادو۔ (۶) یتیم کا مال کھانا۔ (۷) سود کھانا۔ (۸) میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنا۔ (۹) پاکدامن بے خبر مومنات پر تہمت باندھنا۔ (۱۰) یمینِ غموس (جھوٹی قسم کھانا)۔ (۱۱) آدمی کا اپنے والدین کو گالی گلوچ کرنا۔ (۱۲) اولاد کو قتل کرنا (نس بندی یا اسقاطِ حمل وغیرہ کے ذریعہ)۔ (۱۳) پڑوسی کی عورت سے زنا کرنا۔

ان کے علاوہ کبیرہ گناہ اور بھی ہیں، جن کا قرآن واحادیث میں ذکر نہیں۔

سوال: امام رازی رحمہ اللہ نے کبائر وصغائر کے بارے میں جو ضابطہ لکھا ہے وہ کیا ہے؟

جواب: آپ فرماتے ہیں کہ طاعات کی دو قسمیں ہیں: ایک امرِ الٰہی کی تعظیم کرنا۔ دوسرے خلقِ خدا پر شفقت کرنا۔ پس جو بات اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں جتنی زیادہ جہالت پر مبنی ہوگی، اسی قدر وہ بڑا گناہ ہوگی، اسی طرح جو کام دوسروں کو جتنا زیادہ ضرر پہونچانے والا ہوگا، وہ اسی قدر بڑا گناہ ہوگا۔

سوال: ﴿ما ل هذا الكتٰب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصٰها﴾ کیسے فرمایا، جب کہ خود اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿ان تجتنبوا كبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سياٰتكم﴾ کہ کبائر سے اجتناب پر صغائر معاف ہوں گے؟

جواب: (۱) پہلی آیت کفار کے متعلق ہے بدلیل آیت ﴿فترى المجرمين﴾ اور دوسری آیت میں مؤمنین کو خطاب ہے، اس لیے کہ کبائر سے اجتناب کفر کے ہوتے ہوئے نہیں ہوسکتا۔

(۲) مجرمین سے مراد اگر مطلق گناہ گار (مؤمنین وکافرین) ہوں، تب بھی کوئی تعارض واقع نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ انسان کے تمام گناہ؛ کبیرہ ہوں یا صغیرہ لکھے جاتے ہوں، اور حشر میں اس کے سامنے پیش کر کے پھر معاف کر دیے جائیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم کی نعمت کا مشاہدہ ہو، اس لیے کہ انسان اپنے اکثر گناہوں کو بھول جاتا ہے۔

۷۶

سوال: ﴿ووجدوا ما عملوا حاضرًا﴾ کیا سب اہلِ محشر اپنے کیے ہوئے اعمال کو مقامِ محشر میں حاضر پائیں گے؟

جواب: (۱) اپنے کیے ہوئے اعمال کی جزا کو حاضر وموجود پائیں گے۔

(۲) بہ قول علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ: یہی اعمال دنیا وآخرت کی جزا وسزا بن جائیں گے، اُن کی شکلیں وہاں بدل دی جائیں گی، نیک اعمال جنت کی نعمتوں کی شکل اختیار کرلیں گے، اور برے اعمال جہنم کی آگ اور سانپ وبچھو بن جائیں گے۔ روایاتِ حدیث بھی اس پر شاہد ہیں، مثلاً: زکوۃ نہ دینے والوں کا مال اژدھے کی شکل میں اُسے ڈسے گا، کہے گا: أنا مالک۔ نیک عمل حسین انسان کی شکل میں انسان کی قبر کی تنہائی ووحشت کو دُور کریں گے۔ قربانی کا جانور پُل صراط پر سواری کا کام دے گا۔

سوال: ﴿ولا يظلم ربك احدًا﴾ کا مطلب بتائیں!

جواب: حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ظلم کا بایں معنیٰ تو اِمکان ہی نہیں کہ وہ ظاہر میں جو ظلم نظر آئے اور بے موقع سمجھا جائے، وہ بھی نہیں کرتا، نہ کسی کو بے قصور پکڑتا ہے، نہ کسی کی ادنیٰ نیکی کو ضائع ہونے دیتا ہے، بلکہ اپنی حکمتِ بالغہ سے نیکی وبدی کے ہر ایک درخت پر وہی پھل لگاتا ہے، جو اس کی طبیعتِ نوعیہ کا اقتضا ہو۔

گندم از گندم بُروید، جو از جو ☆ از مکافاتِ عمل غافل مَشو

☆☆☆☆☆☆☆

دو باغ والے شخص کے قصہ سے ہمیں کیا سبق ملا؟

☆......حق تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اکثر اپنے مقبول بندوں کو دنیا سے دُور رکھتا ہے، اور کافروں کو دنیا کے عیش وآرام سے خوب نوازتا ہے، اور اہلِ ایمان پر بلائیں نازل کرتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿**لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتھم سُقُفًا من فضة**﴾ (اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام لوگ کفر کے فتنہ میں مبتلا ہوجائیں گے، تو ہم کافروں کو اتنا مال ودولت دیتے کہ اُن کے گھروں کی چھتیں بھی چاندی کی کردیتے)۔ قاعدۂ اکثریہ تو یہی ہے، مگر بعض مرتبہ کافر کا غرور وتکبر توڑ دینے کے لیے کوئی بلاء آسمانی اس کے مال ودولت پر نازل کرتے ہیں تاکہ وہ متنبہ ہوجائے، کہ یہ دنیا ہیچ ہے، امیری وفقیری سب اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ دم کے دم میں بڑے سے بڑے متکبر اور سرکش کو محتاج وخوار بناڈالتا ہے۔

☆......انسان ہر وقت اپنے حال ومآل پر نظر رکھے، حال میں جن جن نعمتوں سے نوازا گیا، اُن پر اللہ کا شکر ادا کرے، اور مآل ومستقبل میں اپنے آپ کو مزید سنورانے کی کوشش کرے، اگر ناشکری کرے گا، اور اپنے رب کے ساتھ سوءِ ادب اختیار کرے گا، تو دنیا میں نقد خسارہ اُٹھائے گا، اور آخرت میں بھی خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

☆......اگر غریب وفقیر مؤمن کے دل میں غنی ومال دار کی دولت دیکھ کر، اُس جیسی دولت کا خیال آوے، تو آخرت میں اللہ کے ہاں ملنے والی دائمی نعمتوں کا خیال کرکے اپنے دل کو تسلی دے لے۔

☆...... غافلین ومفتونین کو پند ونصیحت کرنی چاہیے اور ضرورت پڑے، تو دلیل وحجت قائم کرکے سمجھانا چاہیے۔

☆......موت کا تذکرہ اور اُخروی زندگی کا تصور، مترفین ومال داروں کو نصیحت کرنے میں معاون، مدد اور مؤثر ہے۔

☆......اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کی حقیقت، سرعتِ فنائیت، اور اس کے متلاشی کا ایک حقیقی وحسی واقعہ بیان فرماکر مؤمنین کو دنیاوی فتنہ ودھوکہ سے بچانا چاہا ہے؛ اس لیے کہ دنیا کے دھوکے میں پڑکر غفلت کا شکار ہونا فتنوں میں واقع ہونے کا ایک بڑا سبب ہے۔

☆......مال واولاد دنیا کی سب سے بڑی زینت ہے، اور عند اللہ جو ثواب ہے وہ سب سے بہتر ودیرپا ہے، تو مومن پر لازم ہے کہ باقیاتِ صالحات یعنی ہر طرح کے اعمالِ خیر ونافع انجام دے، اور مقصد قربتِ خداوندی اور خوشنودئ رب ہو۔

☆......یومِ آخرت کا استحضار، اور آخرت کی تیاری؛ دنیاوی زینت کے پنجے میں جکڑے جانے اور اس سے نجات اور اس کی آفات سے سلامتی کا سبب وذریعہ ہے۔

☆......دو باغ والے کا قصہ وہ ہے، جس سے ہم کو روز مرہ کی زندگی میں پہلے قصہ سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے، اگر اصحابِ کہف کا قصہ صدیوں اور برسوں میں پیش آتا ہے، تو یہ قصہ تقریباً ہر جگہ اور ہر وقت ہمارے سامنے آتا ہے، اور بار بار دہرایا جاتا ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ہر اعتبار سے خوش نصیب واقبال مند تھا، آسائش وخوش حالی کے سارے سامان اس کے لیے مہیا تھے، انگور جیسے لطیف ومرغوب پھل کے دو باغ تھے، ان کے چاروں طرف کھجور کے دل نواز درخت تھے، درمیان درمیان میں کاشت کے قطعے بھی تھے، یہ ایک متوسط درجہ کی زندگی کے لیے سعادت ومسرت کی آخری منزل تھی، اور متوسط طبقہ اور درمیانی معیارِ زندگی ہی اکثر دنیاوی معاملات میں معیار وپیمانہ ہے۔ لیکن پھر مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے، جو ہمیشہ اہلِ حکومت، جاگیرداروں، قومی لیڈروں، صنعت کاروں، کارخانہ داروں، اور فوجی طاقت رکھنے والوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اس کے اندر وہ شدید مادی رجحان پیدا ہوتا ہے، جو ایمان، معرفتِ صحیحہ اور تربیت کا پابند نہیں، وہ اپنی ساری خوش حالی اور خوش بختی کو اپنے علم ولیاقت اور اپنی ذہانت ومحنت کی طرف منسوب کرتا ہے، جس طرح اس سے پہلے قارون نے کیا تھا، اور پھر بربادی وہلاکت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ آج کے (بلکہ

ہر زمانے کے) مال داروں اور دولت مندوں کو بھی اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے، جو مال ودولت کو ہی سب کچھ، اور اپنے آپ کو سعادت وعزت کے بامِ عروج پر خیال کرتے ہیں۔

☆...... مادی حکومتوں کو بھی اس قصے سے سبق لینا چاہیے جو عمرانی واقتصادی منصوبوں کا بڑی قطعیت کے ساتھ اعلان کرتی رہتی ہے، کہ وہ اتنے سال کے اندر اتنی پیداوار ضرور پیدا کرنے لگیں گی، اور ملک خود کفیل ہوجائے گا، بیرونی امداد پر انحصار ختم ہوجائے گا، لیکن ارادۂ الٰہی ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے، کبھی قحط، کبھی سیلاب، کبھی بارش ہونے میں تاخیر، کبھی قدرتی حوادث میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔

☆......کلمہ ''اِن شاء اللہ'' دراصل ہماری انفرادی زندگی کے چھوٹے اور حقیر کاموں کا سرسری ملاقاتوں اور سفروں یا محض تاریخ کے تعین کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ ان تمام اجتماعی کاموں اور عظیم منصوبوں پر حاوی ہے، جو پوری قوم کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے ان سب چیزوں کو (بشمول جدوجہد، اسباب ووسائل کی اہمیت اور قرآن وسنت، اسوۂ نبوی اور عملِ صحابہ کی روشنی میں تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت کے) اس یقین کے ماتحت ہونا چاہیے کہ فیصلہ کن، بالاتر، اور اول وآخر چیز بہرصورت ارادۂ الٰہی ہے۔

☆......﴿ما شاء الله لا قوة الا بالله﴾ دراصل سورہ کی روح اور سارے قصہ کی جان ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اور آپ کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے والے کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنا سارا معاملہ اور ساری طاقت وصلاحیت کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردے، اور مستقبل کے ہر ارادے اور نیت کو اس کے سپرد اور اس کی مشیت کے ساتھ مشروط اور وابستہ رکھے۔

☆......﴿ولا تقولن لشيء اني فاعل ذلك غدا الا ان يشاء الله﴾ صرف ایک فرد اس کا مخاطب نہیں، بلکہ ہر زمانہ کا معاشرہ، تمام حکومتیں، ادارے اور جماعتیں اور تحریکیں مخاطب ہیں، اور ان سب سے اس کے اہتمام والتزام کا مطالبہ ہے، یہ ہر اُس

اسلامی معاشرہ کی روح ہے، جس میں ایمان اچھی طرح سرایت کرچکا ہو، اور اس تہذیب کی روح اور جوہرِ حیات ہے، جو ایمان بالغیب کی بنیاد پر قائم ہو، اور یہی وہ خطِ فاصل ہے، جو مادی تمدن اور ایمانی تمدن کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

قسمتوں کا اُلٹ پھیر اور خوش نصیبی وبدنصیبی کی یہ تقسیم، ابدی اور ناقابلِ شکست نہیں، زمامِ کار اور تصرف واقتدار کا اختیار خالقِ کائنات کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں چکا، وہ اب بھی اس کا مالک ہے، خوش نصیب بدقسمت ہوجاتا ہے، اور بدقسمت خوش نصیب، مال دار غریب بھی ہوسکتا ہے، اور غریب مال دار بھی، اس لیے اگر حالات پلٹ جائیں، تو اس میں تعجب نہ ہونا چاہیے۔

☆......**عہدِ حاضر کا شرک:** موجودہ مادی تہذیب جس نے طبعی، مادی، اور فنی اسباب اور ماہرینِ فن کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، عہدِ حاضر کے انسان نے اپنی پوری زندگی ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت، کام یابی وناکامی، اقبال وادبار، خوش نصیبی وبدنصیبی، سب ان کے ہاتھ میں ہے۔ اسبابِ مدی، کائناتی قوتوں اور نیچر کی یہ پرستش وتقدیس اور اہلِ اختصاص اور ماہرینِ فن پر اعتمادِ کلی، اور ان کو خدا کے درجے پر رکھنا ایک نئی وثنیت اور نیا شرک ہے، اس نے قدیم بت پرستی کے ذخیرہ میں جس کا ترکہ اس کے پاس اب بھی محفوظ ہے، اور جس کے ماننے والے اور چاہنے والے اب بھی بکثرت موجود ہیں، ایک نئی قسم کی بت پرستی کا اضافہ کیا ہے، جو ایمان اور عبدیت کی حریف ہے، اور یہ وہی وثنیت ہے جس کو سورۂ کہف نے چیلنج کیا ہے، اور جس سے وہ پوری طرح برسرِ پیکار ہے۔

قرآنِ مجید اسی دنیاوی زندگی کو اس کھیتی سے تعبیر کرتا ہے، جو جلد ہی مٹنے والی اور خاک میں مل جانے والی ہے۔

دنیا کی حقیقت قرآنِ کریم کی روشنی میں:

☆......قرآنِ کریم میں اور خاص کر اس سورۃ میں بہت سی حسی واقعی مثالیں بیان کی گئیں

جن میں دنیا کی حقیقت کی پول کھول دی گئی ہے، مثلاً: دنیا کو پانی سے تشبیہ دی گئی کہ خشک ومردہ زمین پر پانی برستا ہے، نتیجۃً زمین ہری بھری، سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے، کھلی کھلی کلیاں، مہکتے پھول، پھلوں سے لدے درخت، لہلہاتی فصلیں، جاذبِ نظر ہوتی ہیں، کہ یکا یک یہ شادابی ورعنائی، پژمردگی کی طرف مائل ہونے لگتی ہے، کلی پھول بنتی ہے، پھول مرجھانے لگتا ہے، فصل کی کٹائی کا وقت آن پہنچتا ہے، تو اس کی زینت، نُضرت اور سرسبز وشادابی غائب ہوجاتی ہے، اور زمین کی حالت ایسی ہوتی ہے گویا گزشتہ اس زمین میں کچھ تھا ہی نہیں، ایسے ہی انسان کی زندگی کی ابتدا شادابی کے ساتھ ہوتی ہے، اور انتہا پژمردگی کے ساتھ۔ اس لیے عقل مند انسان کو چاہیے کہ دنیا کو اپنی محبوبہ نہ بنائے، وہ آج کسی کے ساتھ ہے، تو کل کسی کے ساتھ ہوگی، ہاں! البتہ دنیا کو ایک قنطرہ وپُل کی طرح استعمال کرے، اور اس کے سہارے، دارِقرار یعنی اپنے اصل مستقر وٹھکانے پر پہنچ جائے۔

دنیا کی حقیقت احادیثِ نبویہ کی روشنی میں:

☆......حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:" **إن الدنيا حُلوةٌ خَضِرةٌ ، وإن اللّٰه مستخلفُكم فيها ، فينظرَ كيف تعملون ؟ فاتقوا الدنيا واتقوا النساء ؛ فإن أولَ فتنةِ بني إسرائيل كانت في النساء** ". (بلاشبہ دنیا شیریں سرسبز وشاداب ہے، اللہ نے تمہیں اس میں جانشین بنایا ہے، تاکہ تمہارے اعمال دیکھے، پس تم دنیا سے بچو، اور عورتوں سے بچو، اس لیے کہ سب سے پہلا فتنہ بنی اسرائیل میں عورتوں کے سبب ہوا تھا)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:" **كن في الدنيا كأنك غريب ، أو عابر سبيل** " اے ابن عمر! دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی، یا مسافر رہتا ہے۔

نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے:" **إذا أمسيتَ فلا تنتظر الصَّباحَ ، وإذا أَصبحتَ فلا تنتظر المَساءَ ، وخُذ مِن صحتك لمرضك ، ومن حياتك لموتك** ". یعنی جب تو شام کو پالے تو صبح کا انتظار نہ کر، اور صبح کو پالے، تو شام کا انتظار نہ کر، زمانۂ صحت میں اعمال کرلے کہ زمانۂ مرض میں کام آئیں، اور زندگی میں اعمال کرلے تاکہ مرنے کے بعد کام آئیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چٹائی پر آرام فرمانے کی وجہ سے بدن پر پہلو میں نشان پڑ گئے، تو ہم نے درخواست کی کہ یارسول اللہ! اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں، تو ہم نرم وگداز بستر بنالیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" **ما لي وللدنيا ، ما أنا في الدنيا إلا كراكبٍ استظلَّ تحت شجرةٍ ، ثم راح وتركها** ". یعنی مجھے دنیا سے کیا مطلب، میری مثال دنیا میں ایک مسافر کی طرح ہے، کہ کسی درخت کے نیچے سایہ حاصل کرکے، آگے چلتا بنتا ہے۔

دنیا کی حقیقت دنیائے اشعار میں:

وصدق من قال في وصفها :

أحلامُ نومٍ أو كظلٍّ زائلٍ ۔۔۔ إن اللبيبَ بمثلها لا يُخدَعُ

وقال :

تروحُ لنا الدنيا بغير الذي غَدَت ۔۔۔ وتَحدُث مِن بعد الأمورِ أمورُ
وتجرِي الليالي باجْتماعٍ وفُرقةٍ ۔۔۔ وتَطلُع فيها أنجمٌ وتَغورُ
وتَطمع أن يَبقى السُّرورُ لأهله ۔۔۔ وهذا مُحالٌ أن يَدُوم سُرورُ

وقال أبو العتاهية :

هي الدنيا إذا كَمُلتْ ۔۔۔ وتَمَّ سرُورُها خَذَلتْ
وتَفعل في الذين بَقوا ۔۔۔ كما فيمن مَضى فَعلتُ

وما أروع قول أبي نُواس :

إذا امتحن الدنيا لبيبٌ تكشَّفت له عن عدوٍّ في ثِياب صديقِ
وما الناس إلا هالكٌ وابنُ هالكٍ وذو نسبٍ في الهالكين عَريقِ

وقال ابن عبد ربه في عقده الفريد :

ألا إنما الدنيا نضارةُ أيكةٍ إذا اخضرَّ منها جانبٌ جَفَّ جانبُ
هي الدار ما الآمالُ إلا فجائعُ عليها ولا اللذاتُ إلا مصائبُ
فكم سَخُنت بالأمس عينٌ قَريرَةٌ وقرَّت عُيونٌ دمعُها اليوم ساكِبُ
فلا تَكتحلْ عَيناک فيها بعبرةٍ على ذاهبٍ منها فإنک ذاهبُ

☆☆☆☆☆☆☆☆

قسمِ ثالث (آیت ۵۰ تا ۵۹)

(۳) فتنۂ ابلیس

ابلیس کا اپنی عبادت پر گھمنڈ وتکبر

آیت : ۵۰ : ﴿واذ قلنا للملٰئکة اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس کان من الجن ففسق عن امر ربه افتتخذونه وذریَّته اولیآء من دوني وهم لکم عدو بئس للظّٰلمین بدلاO﴾ .

ربط : گزشتہ آیات میں اہلِ دولت کے غرور وتکبر کا حال بیان کیا، اب ان آیات میں یہ بتلاتے ہیں کہ تمام خرابیوں کی جڑ یہی تکبر ہے، جس کا آغاز ابلیسِ لعین سے ہوا۔

اور تواضع اور نیازمندی اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا تمام بھلائیوں اور خوبیوں کی جڑ ہے، جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا، یہ تمہارے باپ کا طریقہ ہے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اپنے باپ آدم کے طریقہ پر چلو۔

☆......مفرداتِ لغویه......☆

ففسق : فا حرفِ عطف، فسق : از بابِ نصر، ضرب، وکرم؛ حق وصلاح کے راستے سے ہٹ جانا، بدکار ہونا۔ لفظ کے اصلی معنی ہیں: کسی چیز سے باہر نکلنا، کہا جاتا ہے، جیسے:
فسقت الرَّطبة عن قشرها : کھجور اس کے چھلکے سے باہر نکل آئی۔

شریعت کی اصطلاح میں معنی ہیں: حدودِ شریعت سے نکل جانا۔ نزولِ قرآن سے پہلے یہ لفظ انسانوں کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا، شریعت نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے۔

" فسق " کے مختلف ومتعدد معانی ہیں:

(۱) الخروج من الشيء وعنه . کسی چیز سے نکل جانا، اعراض کرنا۔ اہلِ عرب

کہتے ہیں:" قد فسقت الرطبة من قشرها " کھجوراپنے چھلکے سے نکل گئی۔

(۲) العصیان . الفسّاق وصف ملازم للعصاة .

(۳) الترک . الفاسق هو التارک لطاعة ربه وأمره . قال اللیث : الفسق : الترک لأمر الله .

(۴) الإنفاق والتوسع في الشيء . يقالُ : فسق فلان ماله ؛ إذا أهلكه وأنفقه . وفسق فلان في الدنيا ؛ إذا اتسع فيها . وإنما سمي الفاسق فاسقًا لاتساعه في محارم الله .

(۵) المیل والانحراف .

(۶) الفجور والخُبثُ ورديء الفعال .

أ فتتخذونه : أ ہمزہ استفہام برائے انکاروحیرت،اور فا حرفِ عطف برائے تعقیب ہے۔اورتتخذون : از بابِ افتعال مضارع جمع حاضر، ہٗ ضمیر مفعول۔

کان من الجنّ الخ : جملہ مستانفہ ہے۔

بئس : فعل ماضی ضمیر مستتر فاعل،مخصوص بالذم ہے۔

☆...... اعراب ......☆

اسجدوا لأدم فسجدوا الا ابلیس . اسجدوا فعل امر مبنی علی حذف النون،و ضمیر فاعل،لآدم جار مجرور متعلق اسجدوا،علامتِ جرفتحہ،فا عاطفہ، سجدو فعل با فاعل، إلا اداۃِ استثناء،إبلیس مستثنیٰ منصوب۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿ففسق عن أمر ربه﴾ " ربه " أي ؛ ربّ إبلیس .

☆......﴿تتخذونه﴾ أي ؛ تتخذون إبلیس .

☆......﴿ذریته﴾ أي ؛ ذریة إبلیس .

☆......بلاغت......☆

☆......﴿أفتتخذونه وذريته أولياء﴾ میں استفہام برائے انکاروتعجیب ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......انسان کی غفلت اور سرکشی کے دوسبب ہیں: ایک تو دنیا کی مال ودولت،جس کی کیفیت گزشتہ آیات میں بیان ہوچکی۔اور دوسرا سبب اِغوائے شیطانی،اس لیے بنوآدم کو جدّی وآبائی دشمن شیطانِ ملعون کی عداوت پرآگاہ رہنا چاہیے، یہ ہمارے باپ آدم علیہ السلام کا قدیمی دشمن ہے،اس لیےاس سے ڈرتے اور بچتے رہنا چاہیے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿واذ قلنا للملٓئکة اسجدوا لأدم فسجدوا الا ابلیس کان من الجن﴾ اس آیت سے ابلیس کا جنات کی نسل سے ہونا معلوم ہوا،اور﴿واذ قلنا للملٓئکة اسجدوا لأدم فسجدوا الا ابلیس﴾ سے ابلیس کا فرشتہ ہونا معلوم ہوتا ہے، دونوں آیات میں رفعِ تعارض کیسے ہوگا؟

جواب: (۱) ظاہرِ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس حقیقۃً جنات میں سے تھا،اس لیے کہ ابلیس کی ذریت واولاد موجود ہیں، جیسا کہ﴿افتتخذونه وذريّته اولیآء﴾ سے معلوم ہوتا ہے،اور ملائکہ کی ذیت واولاد نہیں ہے،لہٰذا معلوم ہوا کہ ابلیس جن تھا۔

(۲) بقول علامہ زمخشری: مستثنیٰ منقطع ہے،یعنی ابلیس جناتوں میں سے تھا،جنسِ ملائکہ سے نہیں۔

سوال: ﴿افتتخذونه وذريّته اولیآء﴾ میں اولیاء ولي کی جمع ہے، ولی بمعنی دوست احباب، جوعدو کی ضد ہے،اورلوگوں میں سے کوئی بھی ابلیس کی ذریت سے محبت نہیں کرتا،تو پھراس قول کا کیا مطلب؟

جواب: یہاں "مُوالاۃ" (دوستی) سے مراد شیطان کی اطاعت کرنا ہے،وہ برائی اور فحش کاموں کا حکم دیتا ہے،لوگ اس کی باتوں میں آکراس اطاعت کرتے ہیں، گو اطاعت

لازمۂ دوستی ہے، یعنی جس سے دوستی ہو اس کی نافرمانی نہیں کی جاتی، لہٰذا اطاعت کو مجازاً موالاۃ ودوستی سے تعبیر کیا گیا۔

سوال: فسق یا فسوق کی تعریف کریں!

جواب: **قال أبو المحاسن الحنفي : الفسوق الخروج عن الأمر المحمود إلى الأمر المذموم .** امرِ محمود سے امرِ مذموم کی طرف عدول کرنا فسوق کہلاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿**ففسق عن أمر ربه**﴾ (سورة الكهف : ٥٠)

وقال الآلوسي : الفسق شرعًا : خروج العقلاء عن الطاعة . عقلاء کا طاعت سے نکل جانا۔

سوال: قرآنِ کریم میں لفظ ''فسق'' مع مشتقات کن کن معانی کے لیے مستعمل ہے؟

جواب: چھ معانی کے لیے:

(١) شرک۔ ﴿**أو لحم خنزير فانه رجسٌ او فسقًا اهل لغير الله به**﴾ (سورة الأنعام : ١٤٥)

﴿**ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه وانه لفسق**﴾ (سورة الأنعام : ١٢١)

وقال الإمام مالک : الفسوق : الذبح للأنصاب .

(٢) کفر۔ ﴿**واما الذين فسقوا فمأوٰهم النار**﴾ (سورة السجدة : ٢٠)

﴿**أ فمن كان مؤمنًا كمن كان فاسقًا لا يستوٗن**﴾ (سورة السجدة : ١٨)

(٣) معصیت۔ ﴿**يا أيها الذين اٰمنوا ان جاء كم فاسق بنبإٍ**﴾ (سورة الحجرات : ٦)

﴿**فمن تولى بعد ذلک فأولئک هم الفٰسقون**﴾ (سورة آل عمران : ٨٢)

قال الشوكاني : " هم العاصون في الكفر " .

(٤) کذب۔ ﴿**ولا تقبلوا لهم شهادةً ابدًا واولئک هم الفٰسقون**﴾ (النور : ٤)

﴿**واتقوا الله واسمعوا والله لا يهدي القوم الفٰسقين**﴾ (سورة المائدة : ١٠٨)

﴿**يا أيها الذين اٰمنوا ان جاء كم فاسق بنبإٍ**﴾ (سورة الحجرات : ٦)

(٥) اثم (گناہ)۔ ﴿**وإن تفعلوا فإنه فسوق بكم**﴾ (البقرة : ٢٨٢) **أي : إثم بكم .**

(٦) سبّ وشتم۔ ﴿**الحج اشهر معلومٰت فمن فرض فيهنّ الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج**﴾ (سورة البقرة : ١٩٧)

یہاں پر آیت ﴿**ففسق عن أمر ربه**﴾ میں تیسرا معنیٰ ''معصیت'' مراد ہے۔

سوال: کیا ابلیس کے بیوی بچے بھی ہیں؟ جیسا کہ آیت ﴿**افتتخذونه وذريَّته**﴾ سے پتہ چل رہا ہے؟

جواب: (١) ابلیس کے بیوی اور بچے بھی ہیں، اس لیے کہ ذریت بغیر جورو نہیں ہوتی، اس قسم کے اقوال زیادہ تر مجاہد، شعبی اور اعمش رحمہم اللہ سے منقول ہیں، اور بعض مرفوع حدیثوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**سبحٰن الذي خلق الازواج كلها مما تنبت الارض ومن انفسهم ومما لا يعلمون**﴾ (سورة يٰس : ٣٦)- پاک ذات ہے وہ جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل سے بھی اور ان شخصوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو عام لوگ نہیں جانتے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیطان کے معین ومددگار اور لشکر ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہے، اور اولادِ صلبی ہونے کے متعلق صحیح حدیث بھی موجود ہے۔

(٢) ضروری نہیں کہ شیطان کی صلبی اولاد بھی ہو، بلکہ ذریت سے معین ومددگار مراد ہیں۔

(٣) بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ابلیس خود اپنی دُم اپنے دُبر میں داخل کر لیتا ہے، اس سے انڈا پیدا ہو جاتا ہے، اور ایک انڈا پھٹ کر شیطانوں کی ایک جماعت نکل پڑتی ہے۔

سوال: شیطان کی اولاد اور اُن کے نام بتائیں!

جواب: بقول حضرت مجاہد رحمہ اللہ: اولادِ ابلیس میں سے مندرجہ ذیل شیاطین؛ لاقیس،

ولہان، ہفاف، مرہ، زلنبور، اعور، مسوٗط/مطوس، بثر/ یثور اور داسم ہیں۔

سوال: اولادِ شیطان کے ذمہ کیا کیا کام سپرد ہوتے ہیں؟

جواب: **لاقیس و لھان**؛ یہ دونوں وضو اور غسل میں وسوسہ پیدا کرتے ہیں۔

ھفاف: یہ صحرا پر مامور ہے، صحرا میں شیطنت پھیلاتا ہے۔

مرہ؛ کے نام سے ابلیس کی کنیت ''ابومرہ'' مشہور ہے۔

زلنبور؛ یہ بازاروں پر مامور ہے، جھوٹی تعریف اور جھوٹی قسموں پر لوگوں کو اُکساتا ہے۔

اعور؛ زنا پر آمادہ کرتا ہے۔ مرد کے عضوِ تناسل اور عورت کے سرینوں میں پھونک مارتا ہے؛ یعنی بوقتِ زنا مرد و عورت کی شرم گاہوں پر سوار رہتا ہے۔

مسوٗط/مطوس؛ غلط، بے بنیاد اور جھوٹی افواہیں لوگوں میں پھیلاتا ہے۔

بثر/یثور؛ مردہ کے وارثوں کو منہ پیٹنے اور نوحہ خوانی پر آمادہ کرتا ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کو جہالت کے کام؛ نوحہ، ماتم، گریبان چاک کرنا، چہرے کو نوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

ابیض: یہ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے پر مامور ہے۔

داسم؛ کا کام یہ ہے کہ جب کوئی آدمی گھر میں بغیر سلام و ذکر اللہ کے داخل ہوتا ہے، تو یہ اس آدمی کو گھر کی ہر چیز بے محل و بے سلیقہ رکھی ہوئی دکھاتا ہے، جس سے آدمی کو غصہ آتا ہے، اور پھر وہ گھر والوں کو سخت سست کہنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی بغیر بسم اللہ کے کھانا کھاتا ہے، تو داسم بھی اس کے ساتھ شریک ہوجاتا ہے۔ (اس کے وسوسہ کے بارے میں خود امام اعمش رحمہ اللہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ میں بغیر بسم اللہ کے داخل ہوا، بے محل لوٹا رکھا دیکھ کر گھر والوں سے جھگڑنے لگا، مگر پھر یاد آیا کہ یہ شیطان داسم ہے۔

خناس: شیطان کو ''خنّاس'' بھی کہا جاتا ہے، ''خنس'' کے معنی ہیں پیچھے ہٹنا، سکڑ جانا، شیطان بھی ذکر الٰہی کے وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور وسوسہ انداز نہیں ہو پاتا، قرآن پاک میں ہے: ﴿**من شر الوسواس الخنّاس**﴾ (سورۃ الناس: ۴) ﴿**فلا اقسم بالخُنّس**﴾ (سورۃ التکویر: ۱۵)

سوال: بعض لوگوں نے شیطان کو ملائکہ میں شامل کیا ہے، بلکہ معلم الملکوت (فرشتوں کا استاذ) مانا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: (۱) جی بالکل نہیں! یہ خیال اسرائیلی روایات کی پیداوار ہے۔ بقول حضرت حسن بصری تابعی رحمہ اللہ: ابلیس لحہ بھر کے لیے بھی فرشتہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا ناس کرے جو یہ کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتہ تھا، خو اللہ تعالیٰ اسے جنّی کہہ رہے ہیں؛ ﴿**کان من الجنّ**﴾ (الکھف: ۵۰) پس اس صریح نص کے مقابلہ میں کسی کا بھی قول قابل اعتنا نہیں۔

(۲) ابلیس نے خدائی حکم نہ مانا، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اطاعت سے باہر ہوجانا فرشتوں کی صفت نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿**لا یعصون اللہ فیمآ امرھم**﴾ (سورۃ التحریم: ۶) فرشتے فطرۃً مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں، جب کہ ابلیس نے نافرمانی کی، یہ اس کے لیے اسی وقت ممکن ہوا، جب کہ وہ غیر فرشتہ؛ جنّ تھا۔

سوال: کیا ابلیس کے ساتھ ساتھ تمام جنات نے سجدہ سے انکار کیا تھا؟

جواب: ابلیس جو جانّ کی نسل سے سرکش و نافرمان تھا، صرف اس نے ہی سجدہ سے انکار کیا تھا، تمام جنات نے نہیں، کیوں جنات میں بھی مومن بندے تھے اور ہیں، انہوں نے پہلے حکم عدولی کی اور نہ آج کرتے ہیں۔

سوال: اگر کوئی شخص جنات کے وجود کا انکار کرے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ جیسا کہ بعض نیچری حضرات جنات کے وجود سے انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جو چیز نظر نہیں آتی، اس کو مان کر کیا فائدہ؟

جواب: قرآن مجید میں جنوں کا ذکر بار بار آیا ہے، لہٰذا جنوں کے وجود کا اِقرار فرض ہے، اُن کا انکار قرآن مجید کی خبروں کا انکار ہے، اگر ہم اُن کو نہیں دیکھ پاتے، تو ہم کو انکار کا حق نہیں، اس لیے کہ جس چیز کو ہم دیکھ نہ سکیں، تو اس سے لازم نہیں آتا کہ وہ چیز ہے ہی نہیں، مادّی چیزوں کے اِدراک کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہم کو حواسِ خمسہ دیئے ہیں؛ سن کر،

دیکھ کر، سونگھ کر، چکھ کر، اور چھوکر ہم چیزوں کا اِدراک کر لیتے ہیں، لیکن جو چیزیں غیر مادی ہیں اور ہماری گرفت سے باہر ہیں، انُ کے براہِ راست اِدراک سے ہم معذور ہیں، لیکن ان کا انکار بھی صحیح نہیں ہے، فضائی لہروں میں آوازیں موجود ہیں، جن میں سے بعض کو ایک خاص طریقہ اور خاص ضابطہ کے تحت ریڈیو کی مدد سے سن بھی لیتے ہیں، لیکن اگر ریڈیو یا اس جیسا آلہ استعمال نہ کریں، تو فضا میں موجود خاموش آوازوں کا اِدراک نہیں کر سکتے، ایسی صورت میں اگر ہم فضائی آوازوں کے وجود کا انکار کر دیں، تو ہمارا یہ انکار حقیقت پر مبنی نہ ہوگا۔ خالقِ کائنات نے تو خود ہی فرما دیا کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو، **﴿انه یراکم هو وقبیله من حیث لا ترونهم﴾** ''بے شک وہ [شیطان] اور اس کا لشکر تم کو اس طور پر دیکھتے ہیں کہ تم اُن کو نہیں دیکھتے''۔ (سورۂ اعراف: ۲۷)

سوال: کیا شیاطین وجنات احکامِ شرع کے مکلّف ہیں؟ یعنی دِین کی پابندی اُن پر لازم ہے؟

جواب: جس طریقے سے انسان پر دین کی پابندی لازم ہے، اسی طریقہ سے شیاطین وجنات پر بھی دین کی پابندی لازم ہے، قرآنِ مجید میں شیاطین وجنات کی مذمت، اُن پر لعنت، اُن کے شر وفتنہ سے بچنے کی تاکید، اور اُن کو دیئے جانے والے عذاب کا ذکر ہے، جو دلیل ہے اس بات کی کہ کسی مخالفِ اوامر ونواہی، مرتکبِ کبائر پر قدرت رکھنے والے کو ہی یہ سب وعیدیں اور دھمکیاں سنائی جا سکتی ہیں، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشادات سے معلوم ہوتا ہے: **﴿یا معشر الجن والانس الم یأتکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیٰتي وینذرونکم لقآء یومکم هذا﴾** . (سورة الأنعام : ١٣٠)

﴿قال ادخلوا في امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس في النار﴾ .
(سورة الأعراف : ٣٨)

﴿ولقد ذرأنا لجهنم کثیرًا من الجن والانس لهم قلوب لا یفقهون بها﴾ .
(سورة الأعراف : ١٧٩)

﴿وحق علیهم القول في امم قد خلت من قبلهم من الجن والانس﴾ .
(سورة فصلت : ٢٥)

﴿وقال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلّٰنا من الجن والانس نجعلهما تحت اقدامنا لیکونا من الأسفلین﴾ . (سورة فصلت : ٢٩)

﴿اولئک الذین حق علیهم القول في امم قد خلت من قبلهم من الجن والانس إنهم کانوا خٰسرین﴾ . (سورة الأحقاف : ١٨)

﴿یا قومنآ اجیبوا داعي الله واٰمنوا به یغفر لکم من ذنوبکم﴾ .
(سورة الأحقاف : ٣١)

﴿وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون﴾ . (سورة الذاریات : ٥٦)

﴿یا معشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا﴾ . (سورة الرحمن : ٣٣)

﴿فبأي اٰلآء ربکما تکذبان﴾ . (سورة الرحمن : ٣٤)

﴿قل اوحي الي انه استمع نفرٌ من الجن﴾ . إلی قوله تعالی : ﴿فاٰمناً به ولن نشرک بربنا احدًا﴾ . (سورة الجن : ١، ٢)

سوال: جن اور شیطان میں کیا فرق ہے؟

جواب: محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ جن اور شیاطین اصل کے اعتبار سے ایک ہیں، مگر ایمان دار ''جن'' کے نام سے اور کفار ''شیاطین'' کے نام سے موسوم ہیں۔

جن، شیطان، وابلیس کا تعارف:

جن کی تعریف : الجنّ خلاف الإنس ، والجانّ أبوهم . مخلوقات لا نراها ، مکلفون کالإنسان ، أصل خلقهم من النار . (جن انسانوں سے مختلف ایک مخلوق ہے، جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے، انسانوں کی طرح مکلفِ شرع ہیں، ان کی اصل

آگ ہے، جیسے انسان کی اصل مٹی ہے)۔

شیطان کی تعریف : الشيطان : بفتح فسكون من شَطَنَ ، أي : بعُد عن رحمة الله . كل متمرّد عاتٍ من الجنّ والإنس . الكافر من الجن . (Devil) . (شیطان یعنی جو اللہ کی رحمت سے دُور ہو۔ جنات میں سے سرکش، نافرمان اور کافر جنّ کو شیطان کہا جاتا ہے)۔

ابلیس کی تعریف : شیطانوں کا سردار، سرکش۔ جمع أباليس ، أبالسة۔

جنّ کو جنّ کہنے کی وجہ: جنّ یہ جَنَّ یجُنُّ سے مشتق ہے، بمعنی چھپانا، ہر وہ شے جو نظر نہ آئے اس کو جنّ کہا جا سکتا ہے، اور جن کو بھی جن اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نظروں سے غائب رہتے ہیں، نظر نہیں آتے۔ ماں کے پیٹ میں موجود بچہ کو ''جنین'' اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔

شیطان کو شیطان کہنے کی وجہ: شیطان؛ جمع شیاطین۔ معنی ہیں:

(۱) بری روح۔ (۲) ہر سرکش نافرمان خواہ انسان ہو یا جن یا جانور۔ (۳) شیاطین نافرمان جنات کو کہتے ہیں، یہ ابلیس کی اولاد میں سے ہیں۔

☆......اگر فَيْعَالٌ کے وزن پر شیطان؛ شیطن؛ رباعی مجرد سے مشتق مانیں، تو منصرف پڑھا جائے گا۔ اور اگر فَعْلانَ کے وزن پر شیطان؛ تشیطن رباعی مزید سے مشتق مانیں، تو غیر منصرف پڑھا جائے گا۔

☆......اُبوالبقاء فرماتے ہیں شیطانٌ بروزن فیعالٌ مشتق ہے شَطَنَ يَشْطُنُ سے، بمعنی دور ہونا۔ اور ایک لغت کے مطابق شاطن از باب مفاعلة اور تشیطن از باب تفعیل ثلاثی مزید فیہ ملحق برباعی مزید فیہ بھی ہے۔

☆......جیسے انسان کے مورثِ اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ایسے ہی جنات کے

مورثِ اعلیٰ جانّ ہیں، اور ابلیس جانّ کی نسل میں سے ایک ملعون شخص ہے، جیسے بنی آدم میں فرعون، شداد، نمرود اور ابوجہل وغیرہ سرکش افراد ہوئے ہیں۔

اِبلیس کو ''ابلیس'' کہنے کی وجہ:

إبليس مشتق ہے اِبلاس سے، جس کے معنی ہیں؛ مایوس ہونا، اور شیطان بھی رحمتِ خداوندی سے مایوس ہے، اہلِ عرب کہتے ہیں:'' **أبلس الرجل إبلاسا فهو مبلس**'' جب کوئی مایوس ہو جائے۔ اِبلیس کا یہ نام اُس وقت رکھا گیا تھا جب وہ خدا تعالیٰ کے دربار سے مردود ہو چکا تھا۔

☆......بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما: جب تک ابلیس ملائکہ کے ساتھ رہا، اس وقت تک اس کا نام عزازیل رہا، پھر جب وہ ملعون ہو گیا، تو ابلیس کہا جانے لگا۔

☆......بروایت ابوالمثنی: ابلیس کا نام نائل تھا، جب وہ مغضوب ہوا تو شیطان کہا جانے لگا۔

☆......بقول سفیان ثوری: ابلیس کی کنیت ''ابوکدوس'' ہے۔

☆......بقول ابوالبقاء: لفظ ابلیس عجمہ و معرفہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

☆......بقول ابن عبدالبر: اہل علم کے نزدیک جنات کے چند درجے ہیں:

جب خالص جنّ بولنا مقصود ہوتا ہے، تو جنّ کہتے ہیں۔

اور جب آبادی میں رہنے والے جنات مراد ہوتے ہیں، تو عامر کہتے ہیں، اس کی جمع عمار ہے۔

اور جب بچوں کو ستانے والے مراد ہوتے ہیں، تو اُرواح کہتے ہیں۔

اور نہایت گندے خبیث جنات کو شیطان کہتے ہیں۔

اور جو بہت ہی شریر ہو اس کو مارد کہتے ہیں۔

اور جو سب سے زیادہ مکار ہو، اس کو عفریت کہتے ہیں، اس کی جمع عفاریت آتی ہے۔

☆......ابلیس، شیطان؛ شیطانِ ملعون کے وصفی نام ہیں، اور علم وخاص نام؛ عزازیل ہے۔

☆......پورے قرآن میں ۱۱ر جگہوں پر لفظ ''ابلیس'' استعمال ہوا ہے:

(۱) سورۂ بقرہ: آیت:۳۴۔ (۲) سورۂ اعراف: آیت:۱۱۔ (۳) سورۂ حجر: آیت:۳۱۔ (۴) سورۂ حجر: آیت:۳۲۔ (۵) سورۂ بنی اسرائیل: آیت:۶۱۔ (۶) سورۂ کہف: آیت: ۵۰۔ (۷) سورۂ طٰہٰ: آیت:۱۱۶۔ (۸) سورۂ شعراء: آیت: ۹۵۔ (۹) سورۂ سبا: آیت: ۲۰۔ (۱۰) سورۂ ص: آیت:۷۴۔ (۱۱) سورۂ ص: آیت:۷۵۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نظامِ تکوین و ایجاد میں شیطان کا کوئی حصہ نہیں
مشرکین کے شبہ کا ردّ اور اعراض عن الحق کے اسباب

آیت : ۵۱ ، ۵۲ ، ۵۳ : ﴿مآ اشهدتهم خلق السمٰوٰت والارض ولا خلق انفسهم وما كنت متّخذ المضلّين عضُدًاO ويوم يقول نادوا شركآء ي الذين زعمتم فدعوهم فلم يستجيبوا لهم وجعلنا بينهم موبقاO ورأ المجرمون النار فظنوآ انهم مواقعوها ولم يجدوا عنها مصرِفاO﴾ .

ربط : فتنۂ دنیا (مال ودولت) اوراس کے زوال، حساب وجزا کے بعداب دوسرے عظیم فتنے، فتنۂ ابلیس کا بیان ہے، تاکہ مومن اس فتنہ سے اپنے آپ کو بچائے۔ فرمایا کہ جن شیاطین کو تم نے اپنا ولی ودوست بنایا ہوا ہے، اُن کی طرف علم غیب کی نسبت کرتے ہو، حالاں کہ وہ تمہاری ہی طرح میرے بندے اور غلام ہیں، کسی چیز کے مالک نہیں، زمین وآسمان کے پیدا کرتے وقت اُن سے نہیں پوچھا گیا کہ ٹھیک بنا ہے یا کچھ اونچ نیچ رہ گئی، نہ اُن سے تکوین وایجادِ عالم میں کچھ مشورہ لیا گیا، نہ مدد طلب کی گئی، خود ان کو پیدا کرتے وقت بھی یہ نہ پوچھا گیا کہ تمہیں کیسے بنایا جائے، پھر بھی خدا جانے تم لوگ کیوں ان شیاطین وابلیس کو خدائی کا درجہ دیتے ہو، اپنے رب کو چھوڑ کر انہیں رفیق ومددگار بناتے ہو۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

ما أشهدتهم : ما نافیہ، أشهدت از باب افعال دکھلانا، گواہ بنانا، حاضر کرنا۔ اس کا مجرد شهد از باب سمع ہے، حاضر ہونا۔ شهد الشيء : معائنہ کرنا، اطلاع پانا۔ شهد على كذا : گواہی دینا۔

المضلين : اسم فاعل جمع مذکر بحالت جر، مصدر اضلال از باب افعال؛ گمراہ کرنا۔

عضُدًا : بازو، ہاتھ کا کہنی سے لے کر کندھے تک کا حصہ، مجازی معنی ہیں: معین ومددگار، قوتِ بازو۔ اسم واحد، جمع أعضُد و أعضادٌ آتی ہے۔

اہلِ تہامہ عضد کو مؤنث بولتے ہیں، اور بنو تمیم مذکر بمعنی یار ومددگار، قوتِ بازو۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ عضد کہنی سے لے کر کاندھے تک درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔

شركاء ي : کے قرینہ سے زعمتم کے دونوں مفعول محذوف ہیں، أي ؛ زعمتموهم شركاء .

فدعوهم : فا حرفِ عطف، دعوا فعل ماضی جمع مذکر غائب، هم ضمیر مفعول، مصدر دعاء از باب نصر پکارنا۔

موبِقا : اسم ظرف مکان، ہلاکت کی جگہ، جہنم کا ایک خاص درجہ۔ وبَقَ از باب ضرب وسمع، مصدر وُبوقًا : ہلاک ہونا۔

رأ : از باب فتح یفتح، مصدر رؤية ، دیکھنا۔ اصل میں رآی تھا، آخر میں ي قرآنی رسم الخط کے مطابق پڑھی نہیں جاتی، اس لیے لکھی بھی نہیں گئی۔

رآی دراصل رأَيَ ہے، یا متحرک ماقبل مفتوح ي کو الف سے بدل دیا۔

کوفی حضرات آخر میں ي لکھتے ہیں، بصری حضرات نہیں لکھتے، عربی زبان میں کوفیوں کا رسم الخط رائج ہے، ان کے نزدیک یہ ي علامتی ہے کہ اس کو الف سے بدلا گیا ہے، پھر جب رآی کو المجرمون سے ملایا، تو الف ساقط ہوگیا، تو ي کو بھی ساقط کر دیا، اور رأ لکھا گیا۔

مُواقِعُوها : اسم فاعل جمع مذکر مضاف، ها ضمیر مضاف الیہ۔ دراصل مواقعون تھا، بوجہ

اضافت نون گرا، مواقع : ایک دوسرے سے قریب ہونے والا، مصدر: مواقعة .

مصرِف : ظرف مکان؛ لوٹنے کی جگہ، جائے پناہ۔ از باب ضرب مصدر صرفٌ؛ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف لوٹا دینا، یا ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل دینا۔

☆...... اعراب ......☆

وما کنت متّخذ المضلّین عضُدًا . ما نافیہ، کنت فعل ناقص ماضی، ت ضمیر اس کا اسم، متخذ کنت کی خبر منصوب، المضلین مضاف الیہ مجرور، علامتِ جري، عضدًا مفعول بہ ثانی متخذ اسم فاعل کا۔

☆......بلاغت......☆

﴿وما کنت متّخذ المضلّین عضُدًا﴾ میں تشبیہ بلیغ ہے، مضلین کو عضد (قوت) کے ساتھ تشبیہ دی، اور اداتِ شبہ کو حذف کر دیا۔

تشبیہ بلیغ : وہ تشبیہ ہے جس میں اداۃِ تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں محذوف ہوں۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿ما اشهدتهم﴾ " هم " ضمیر کے مرجع میں تین احتمال ہیں:

(۱) إبليس وذريته .

(۲) جميع الخلق . یعنی میں نے مخلوق میں سے کسی کو خود ان کی اپنی تخلیق میں بھی شریک نہیں کیا۔

(۳) الملائكة . یعنی میں نے تخلیق کے وقت فرشتوں کو نہیں بلایا اور نہ خود ان کی اپنی تخلیق میں ان کو شریک کیا۔

☆......﴿خلق انفسهم﴾ أي ؛ خلقَ أنفُس إبليس وذريته . یعنی آسمان وزمین کی پیدائش کے وقت ابلیس اور اس کی ذریت کو خود ان کی اپنی تخلیق میں شریک نہیں کیا۔

☆......﴿وجعلنا بينهم﴾ بينهم کی هم ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

(۱) الداعين والمدعويين . یعنی پکارنے والے اور پکارے جانی والی ہستیاں۔

(۲) المؤمنين والكافرين . یعنی مشرکین اور موحدین۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......اللہ تبارک وتعالیٰ انسانوں (خصوصاً مشرکین) کو تنبیہ فرما رہے ہیں کہ جب میں نے شیطانوں سے کسی چیز کو پیدا کرنے میں مدد ہی نہیں لی، تو پھر تم کیا غضب کرتے ہو کہ رب رحیم کی جگہ شیطانِ لعین اور شیطان زادوں کو اپنا کارساز اور چارہ گر بناتے ہو، جن کا کام تمہیں بھڑکانا اور ضرر پہنچانا ہے۔

☆......اس آیت سے بھی نظریۂ ملاحدہ اور ڈارون کا ردّ ہوتا ہے؛ کہ انسان کی پیدائش اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے فرمائی ہے، کسی غیر (بندروغیرہ) کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

☆......انسانیت کے لیے سب سے بڑا شیطانی فتنہ؛ دنیا کی ظاہری ومادی زینت کو حقیقی زینت بنا کر پیش کرنا ہے، تاکہ لوگ اس کے دامِ فریب میں پھنس کر جہنم کا ایندھن بنیں؛ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**يا ايها الناس ان وعد الله حق فلا تغرّنكم الحيوة الدنيا ولا يغرنكم بالله الغرورO ان الشيطٰن لكم عدو فاتخذوه عدوًّا انما يدعوا حزبه ليكونوا من اصحٰب السعيرO**﴾ . (سورة فاطر : ۵ ، ٦)

☆......شیطان انسان کے لیے بدعات وخرافات کو مزین کر کے پیش کرتا ہے، اور اس میں مشغول ومبتلا کر دیتا ہے، معاصی کے راستے آسان کرتا ہے، طاعات سے روکتا ہے، عبادات سے غافل رکھتا ہے، توبہ سے باز رکھتا ہے، غرور وتکبر، کفر وشرک، فخر وشیخی، بغض وعناد، کینہ وحسد، عداوت ونفرت، تمرُّد وعصیان، عُجب وتعصُّب پر لوگوں کو اُبھارتا اور آمادہ کرتا ہے، اس نے جب ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کو نہیں چھوڑا، تو ہمیں کیا بخشے گا، لہٰذا مسلمانوں کو اس کے وساوس واکاذیب سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے، اور تقویٰ کا راستہ اختیار کر کے

اللہ کی رسی (قرآن وحدیث) اورشریعتِ اسلامیہ کومضبوطی سے تھام لیناچاہیے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿ویوم یقول نادوا شرکاء ي﴾ اور ﴿قالوا ربنا هؤلاء شرکاؤنا﴾ دونوں آیتوں میں تعارض ہے، کہ پہلی آیت میں بتوں سے کلام کی نفی ہے، اور دوسری آیت میں ان کے لیے کلام ثابت ہوتا ہے؟

جواب: اول الذکر آیت سے مراد ہے؛ شرکاء کو سفارش اور عذاب ہٹانے کے لیے پکارو، اور وہ کفار پکاریں گے، مگر شرکاء ان کا جواب نہیں دیں گے۔ اور ثانی الذکر آیت میں اثباتِ کلام مشرکین کو دعویٔ عبادت میں جھٹلانے کے لیے ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

سوال: ﴿نادوا شرکاء ي﴾ میں شرکاء سے کون مراد ہیں؟

جواب: (۱) کل ما عُبد من دونه تعالی. ہر وہ باطل معبود جس کی پرستش کی جائے۔ (۲) ابلیس اور اس کی ذریت۔

سوال: سورۂ کہف میں ﴿شرکاء ي﴾ فرمایا، اور سورۂ نحل میں ﴿شرکاء هم﴾ مذکور ہے، ایسا فرق کیوں؟

جواب: سورۂ کہف میں بطورِ تہکّم شرکاء ي فرمایا، یعنی ان کے اعتقاد وزعم کے مطابق وہ میرے شرکاء ہیں۔ اور سورۂ نحل میں معبودانِ باطلہ جن کی یہ پرستش کرتے ہیں، وہ مراد ہیں۔

سوال ﴿فسجدوا﴾ سے کون سا سجدہ مراد ہے؟

جواب: سجدۂ تکریمی وتعظیمی۔

سوال: قیامت تک مہلت تمام شیاطین کو ملی ہے؟

جواب: ابلیس جو شیطانِ اکبر ہے، صرف اسے ہی قیامت تک مہلت ملی ہوئی ہے، تمام شیاطین یا تمام جنات کو نہیں، وہ انسانوں کی طرح جیتے اور مرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کو مضبوطی سے تھامنا......جھگڑالو انسان
کفار کی حق بیزاری ودین دشمنی......کافرین ومنکرین کو مہلت وڈھیل

آیت : ٥٤، ٥٥، ٥٦، ٥٧، ٥٨، ٥٩ :

﴿ولقد صرفنا في هذا القراٰن للناس من كل مثل وكان الانسان اكثر شيء جدلاO وما منع الناس ان يؤمنوٓا اذ جآء هم الهدى ويستغفروا ربهم الا ان تأتيهم سنة الاولين او يأتيهم العذاب قبلاO وما نرسل المرسلين الا مبشرين ومنذرين ويجادل الذين كفروا بالباطل لِيدحضوا به الحق واتخذوا اٰيٰتي وما انذروا هزوًاO ومن اظلم ممن ذكر باٰيٰت ربه فاعرض عنها ونسي ما قدمت يداه انا جعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه وفيٓ اٰذانهم وقرًا وان تدعهم الى الهدى فلن يهتدوٓا اذًا ابدًاO وربک الغفور ذو الرحمة لو يؤاخذهم بما كسبوا لعجّل لهم العذاب بل لهم موعِد لن يجدوا من دونه موئلاO وتلک القُرىٓ اهلكنٰهم لما ظلموا وجعلنا لمَهلِكهم موعِدًاO﴾ .

ربط : ان آیات میں منکرین کافرین کو تین باتیں کہی گئی ہیں کہ:

(۱) حجتِ خداوندی تمام ہوچکی پھر بھی حق کا انکار کررہے ہیں، تو بس اب عذاب کا کوڑا برسانا باقی ہے۔

(۲) اب ان سے ایمان کی کوئی امید نہیں، ان کی سمجھنے اور حق بات سننے کی صلاحیت سلب کرلی گئی۔

(۳) اللہ چاہتے ہیں کہ انسان دیرسویر راہِ راست پر آجائے، فوراً اس کی گرفت نہیں فرماتے، اسے ڈھیل ومہلت دیتے رہتے ہیں، کفار کو چاہیے کہ وہ اس مہلت کا غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

☆......مفردات لغویہ......☆

صرّفنا : از باب تفعیل فعل ماضی صیغہ جمع متکلم۔ مصدر تصریف؛ پھیرنا، ظاہر کرنا۔ بقول

امام راغب رحمہ اللہ: **تصریفٌ صرفٌ** ہی کی طرح ہے، البتہ تکثیر میں فرق ہے کہ **تصریفٌ** کے معنی بہت پھیرنے کے ہیں، اور **صرفٌ** کے معنی صرف پھیرنے کے ہیں۔

بعض علماء کے مطابق صرفنا کا مفعول (**البینات و العبر**) محذوف ہے، اس صورت میں مِن ابتدائے غایت کے لیے ہوگا۔ اور بعض کے نزدیک مِن زائدہ برائے تاکید ہے، اس صورت میں صرفنا کا مفعول (**کل مثل**) ہوگا۔

مِن کل مثل : **صرفنا** کا مفعول بہ ہے۔ اور مِن مفعول بہ پر زائد ہے۔

منع : فعل ماضی از باب فتح۔ **الناسَ** : مفعول اول، أن مصدریہ، جملہ یؤمنوا بتاویل مصدر ہو کر مفعول ثانی، أن سے پہلے مِن جارہ محذوف ہے۔

أن یؤمنوا : **أن** مصدریہ ناصبہ، **یؤمنوا** : مضارع منصوب جمع مذکر غائب، مصدر **إیمان** از بابِ افعال؛ یقین کرنا، ایمان لانا۔

إذ جاء هم : ظرف **یؤمنوا** کا، **یستغفروا** کا عطف **یؤمنوا** پر ہو رہا ہے۔

أن تأتیهم: میں بھی اَن مصدریہ ہے، اور جملہ **تأتیهم** بتاویل مصدر ہو کر **منع** کا فاعل، اور مضاف طلب یا انتظار محذوف، اور مضاف الیہ اس کے قائم مقام، اور **یأتیهم** کا عطف **تأتیهم** پر، اور **قبلا** حال **العذاب** کا۔

قُبُلا : بضم القاف والباء۔ اور ایک لغت کے مطابق: بکسر القاف وفتح الباء؛ آنکھوں کے سامنے۔ **قابلٌ** یا **قَبِیْلٌ** کی جمع ہے، جیسے **سَبِیْلٌ** کی جمع **سُبُلٌ** ہے۔ معنی ہیں: گروہ گروہ۔ نوع بہ نوع۔ قسم قسم۔ **وفي تفسير الجلالين : مقابلة وعيانًا** .

مبشرین و منذرین : **مرسلین** سے حال ہے۔

یجادل : از باب **مفاعلة** فعل مضارع واحد مذکر غائب، مفعول **یجادل** محذوف ہے، **أي : یجادل المرسلین** . مصدر **مُجادَلةٌ** اور **جِدالٌ** ہے؛ ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنا، جنگ وجدال کرنا۔

لیدحضوا : **یجادل** سے متعلق ہے۔ مصدر اِدحاضٌ از بابِ افعال؛ پھسلانا، ٹلانا۔ ثلاثی مجرد از باب فتح **دحض یدحض** ، کہا جاتا ہے: **دحضت رِجله** ؛ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ **مکانٌ دحْضٌ** ؛ پھسلنے کی جگہ۔ **حجة داحضةٌ** : باطل دلیل۔

ما انذروا : **ما** مصدریہ یا موصولہ، عائد محذوف ہے، **أي : أنذروا به** . **آیاتي** پر معطوف ہے، اور هزوًا مفعول ثانی ہے۔

هزوًا : مصدر از بابِ فتح، بمعنی اسم مفعول، مسخرا، وہ جس کا مذاق اُڑایا جائے، چھچھورا، ہلکا۔

ومَن أظلم : **مَن** موصولہ لفظاً مفرد ہے، اس لیے آگے پانچ ضمیریں اس کی طرف لوٹتی ہیں؛ یعنی (۱) **ذُکِّر** (۲) **ربه** (۳) **أعرض** (۴) **نسي** (۵) **یداہ** کی ضمیریں۔ اور معنیً جمع ہے، اس لیے آگے پانچ جمع کی ضمیریں اُس کی طرف لوٹتی ہیں، یعنی (۱) **قلوبهم** (۲) **یفقهوه** (۳) **آذانهم** (۴) **تدعهم** (۵) **لن یهتدوا** کی ضمیریں۔

أکنّة : **کِنان** کی جمع ہے، معنی پردے۔ غلاف۔ **الکن** ؛ ہر وہ چیز جس میں کسی چیز کو محفوظ کیا جائے۔ **کننت الشيء کنا** : کسی چیز کو کن میں محفوظ کر دیا۔ **کننت** : ثلاثی مجرد، خصوصیت کے ساتھ کسی مادی شے کو گھر یا کپڑے میں چھپانے پر بولا جاتا ہے، جیسے: قرآنِ پاک میں آتا ہے: ﴿**کأنهنّ بیضٌ مکنونٌ**﴾ گویا وہ چھپے ہوئے محفوظ انڈے ہیں۔ اور از بابِ افعال؛ کسی بات کو دل میں چھپانے پر بولا جاتا ہے، مثلاً: ﴿**او اکننتم في انفسکم**﴾ یا نکاح کی خواہش کو اپنے دلوں میں مخفی رکھو۔

وَقرًا : اسم مصدر منصوب؛ ثقل، گرانی، بہرہ پن۔

ما کسبوا : ما مصدریہ یا موصولہ ہے۔

موئلا : اسم ظرف، جائے پناہ، لوٹنے کی جگہ۔ **وأل یئِل وأْلًا من کذا** : نجات ڈھونڈنا۔ **وأَلَ إلیه** : پناہ لینا۔ **وأل إلی اللّٰه** : رجوع کرنا، توبہ کرنا۔

مَهلک : مصدر میمی: ہلاک ہونا، تباہ ہونا۔ یا ظرف مکان: ہلاکت کی جگہ، جمع

مهالک . اسی طرح مصدر هَلَکٌ و تَهْلُکَةٌ از بابِ ضرب؛ ہلاک ہونا۔

☆...... اعراب ......☆

وان تدعهم الی الهدی فلن یهتدوٓا اذًا ابدًا .

إن حرفِ شرط جازم، تدعهم مضارع مجزوم فعل شرط، علامتِ جزم حرفِ علت محذوف، هم ضمیر مفعول بہ، إلی الهدی جار مجرور متعلق تدعهم، علامتِ جر کسرۂ مقدرہ، فا رابطۂ جوابِ شرط، لن حرفِ نفی ونصب، یهتدو امضارع منصوب فعل بافاعل، إذا حرفِ جواب لا عمل له، أبدا ظرفِ منصوب متعلق یهتدو فعل کے۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿لیدحضوا به﴾ میں " به " کی ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

(۱) الجدال . تاکہ ان ٹنٹوں کے ذریعہ حق بات کو بچلا دیں اور اس کو زک دیں۔

(۲) الباطل . تاکہ ناحق باتوں کے ذریعہ حق بات کو بچلا دیں اور اس کو زک دیں۔

☆......﴿فاعرض عنها﴾ میں ها ضمیر کا مرجع الآیات ہے۔ یعنی ان آیتوں سے منہ پھیر لے۔

☆......﴿یفقهوه﴾ میں ضمیر کا مرجع الذکر یعنی القرآن ہے۔ یعنی انہیں اس ذکر یعنی قرآن کی بات کو نہیں سمجھنے دیتے۔

☆......﴿من دونه موئلا﴾ " دونه " کی ضمیر کے مرجع میں تین احتمال ہیں:

(۱) الموعد . اس وعدہ سے بچ کر بھاگ نکل نہیں سکتے۔

(۲) العذاب . اس عذاب سے بچ کر بھاگ نکل نہیں سکتے۔

(۳) الله . اللہ سے بھاگ کر کہیں نکلنے کا راستہ نہیں۔

☆...... بلاغت ......☆

﴿مبشرین﴾ اور ﴿منذرین﴾ میں طباق ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......قرآنِ کریم انسانوں کے لیے ہدایت، رحمت، نور وعصمت ہے، قسمہا قسم کے اسلوب، اور مختلف اچھوتے مسالک سے حجت قائم کرتا ہے، اور شبہات کو دفع کرتا ہے۔ کھلی نشانیاں اور مثالیں پیش کر کے انسانیت کو سمجھاتا ہے اور موعظت وعبرت کا ذریعہ ہے۔

☆......مخالفین، منکرین، کافرین اور مشرکین معاصی کے ارتکاب پر مصر ہیں، اس کے باوجود اُن کو مہلت دے کر توبہ کی تلقین کرتا ہے، عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے۔

☆......رسولوں، پیغمبروں کی رسالت وپیغام واضح وجلی ہے، رسالت ایک عظیم وجلیل منصب ہے، جس میں بشارت کا پیغام پہلے، اور نذارت وتخویف کا پیغام بعد میں ہوتا ہے، دینی ودنیاوی ہر طرح کی رہنمائی اُن کے پیغام میں شامل ہوتی ہے، انسانیت پر اُن کی اتباع واقتدا لازم ہے، کہ اتباع وانقیاد فتنوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

☆......کفار ومشرکین اور ملاحدہ وزنادقہ جدالِ عقیم (بے نتیجہ بحث ومباحثہ) کرتے ہیں، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں، باطل کو بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں، آیاتِ قرآنی کا استہزا کرتے ہیں، انبیاء کی توہین کا ارتکاب کرتے ہیں۔

☆......اسلام فضول جدال، مباحثہ ومناظرہ سے منع کرتا ہے، جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، اور اہل باطل مزید مغالطات، غلط مقدمات اور جھوٹے دعووں میں مبتلا ہو جائیں۔

☆......سوالات......☆

سوال: صرّف . وصف . قصّ . ضرب . حدّث . بیّن . فصّل اور فسّر میں کیا فرق ہے؟

جواب: صرّف : کسی بات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔

وصف : کسی چیز کا حلیہ بیان کرنا۔

قصّ : کوئی قصہ یا ماجرا بیان کرنا۔

ضرب (مثلاً) : مثال یا کہاوت بیان کرنا۔

حدّث : ایسی چیز بتانا جس سے عام لوگ بے خبر ہوں۔

بیّن : بات کو دلائل کے ساتھ بیان کرنا۔

فصّل : کوئی بات ترتیب واراور الگ الگ کر کے بیان کرنا۔

فسّر : مبہم اور مشکل مقامات کی وضاحت کرنا۔

سوال: اللہ پاک قرآنِ کریم میں تصریفِ امثال کیوں کرتے ہیں؟

جواب: تصریفِ امثال کا مقصد بندوں کی تذکیر وتہدید، اور عبرت وموعظت حاصل کرنا ہے۔

سوال: اللہ پاک نے قرآنِ کریم میں ہر طرح کی مثال بیان کی، بطورِ نمونہ چند مثالوں کی وضاحت کریں!

جواب: مچھر کی مثال، جیسے ﴿ان اللّٰہ لا یستحیي ان یضرب مثلا ما بعوضة فما فوقها﴾۔ (سورۂ بقرہ:۲۶)

مکھی کی مثال، جیسے: ﴿یا أیها الناس ضرب مثل فاستمعوا له ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لین یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له﴾۔ (سورۂ حج:۷۳)

عنکبوت یعنی مکڑی کی مثال، جیسے: ﴿مثل الذین اتخذوا من دون اللّٰہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتا وان اوهن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون﴾۔ (سورۂ عنکبوت:۴۱)

کتے کی مثال، جیسے: ﴿فمثله کمثل الکلب ان تحمل علیه یلهث او تترکه یلهث﴾۔ (سورۂ اعراف:۱۷۶)

گدھے کی مثال، جیسے: ﴿مثل الذین حملوا التوراة ثم لم یحملوها کمثل الحمار یحمل اسفارًا﴾ (سورۂ جمعہ:۵) وغیرہ۔

سوال: ﴿سنة الأولین﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: سنة اللّٰہ في الذین ضلوا من قبلهم ؛ یعنی: سنة اللّٰہ في إنزال العذاب علی المکذبین الأولین۔ (اللہ نے پہلے بھی مکذبین وگمراہوں پر عذاب نازل فرمایا ہے)۔ واللہ اعلم!

سوال: ﴿وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین﴾ ایک داعی کو اس سے کیا سبق ملتا ہے؟

جواب: داعی الی اللہ کو چاہیے کہ تبشیر (بشارت) کے ساتھ انذار، اور ترغیب کے ساتھ ترہیب کا پہلو بھی اختیار کرے، محض تبشیر یا محض ترہیب وتخویف ہی سے کام نہ لے۔

سوال: ﴿ومن اظلم ممن ذکر بایٰت ربه فاعرض عنها﴾۔ ﴿ومن اظلم ممن منع مسٰجد اللّٰہ أن یذکر فیها اسمه﴾۔ ﴿فمن اظلم ممن افتری علی اللّٰہ کذبا لیضل الناس بغیر علم﴾ وغیرہ آیات میں تعارض کو دور فرمائیں!

جواب: (۱) آیاتِ مذکورہ میں سب ظلم میں برابر ہیں، اور ظلم کے درجۂ عُلیا میں ہیں۔

(۲) علمِ منطق کے حساب سے تعارض وتناقض کے لیے وحدتِ موضوع شرط ہے:

در تناقُض ہشت وحدت شرط دان ☆ وحدتِ موضوع ومحمول ومکان

وحدتِ شرط واضافت جزوکل ☆ قوت وفعل است درآخر زماں

جب کہ آیاتِ مذکورہ میں اختلافِ موضوع ہے، لہٰذا کوئی تناقض نہیں۔ اب تینوں آیات کا مطلب ہوگا:

معرضین میں آیات اللہ کا منکر سب سے بڑا ظالم ہے۔

مفترین میں اللہ پر جھوٹ گھڑنے والا سب سے بڑا ظالم ہے۔

مانعینِ خیر میں مساجد میں عبادت سے روکنے والا سب سے بڑا ظالم ہے۔

سوال: ﴿وربک الغفور ذو الرحمة﴾ وسعتِ رحمتِ باری پر قرآن وحدیث سے چند دلائل مہیا فرمائیں!

جواب: قرآنِ کریم سے جیسے: ﴿الرحمٰن الرحیم﴾ (سورۂ فاتحہ:۳) ﴿وربک الغفور ذو الرحمة﴾ (سورۂ کہف:۵۸) ﴿ورحمتي وسعت کل شيء﴾ (سورۂ اعراف: ۱۵۶) ﴿إن ربک واسع المغفرة﴾ (سورۂ نجم: ۳۲) ﴿وأنت ارحم الراحمین﴾ (سورۂ اعراف:۱۵۱) وغیرہ۔

اوراحادیث جیسے: ''إن رحمتي تغلب غضبي''. (صحیح بخاري وصحیح مسلم)۔ ''جعل اللّٰہ الرحمة مائة جزء؛ فأمسک عنده تسعة وتسعین، وأنزل في الأرض جزئًا واحدًا'' (صحیح بخاری وصحیح مسلم) وغیرہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قسمِ رابع (آیت۶۰/تا۸۲)

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا تعلیمی وعلمی سفرنامہ

زادِسفر خلافِ سنت نہیں!......آدابِ طلبِ علم!

آیت : ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳ :

﴿واذ قال موسیٰ لفتٰه لآ ابرح حتی ابلغ مجمع البحرين او امضي حقبا O فلما بلغا مجمع بينهما نسيا حوتهما فاتخذ سبيله في البحر سربًا O فلما جاوزا قال لفتٰه اٰتنا غدآء نا لقد لقينا من سفرنا هذا نصبًا O قال ارء يت اذ اوينآ الى الصخرة فاني نسيت الحوت وما انسٰنيه الا الشيطٰن ان اذكره واتخذ سبيله في البحر عجبًا O﴾ .

ربط : چوں کہ قریش نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لیے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق جو سوالات کیے تھے، وہ یہود کے بتلانے اور سمجھانے سے کیے تھے، کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کا جواب دے دیں، تو جانو کہ وہ نبی ہیں، ورنہ نہیں، اس لیے یہود کے سنانے کے لیے موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا قصہ بیان فرماتے ہیں، تاکہ معلوم کریں کہ نبی کے لیے یہ شرط نہیں کہ اس کو سب چیزیں معلوم ہوں، اور وہ تمام اخبار اور قصص کا عالم ہو، بلکہ نبوت کے لیے وحی اور علومِ ہدایت کی معرفت ضروری ہے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام باوجود کلیم اللہ ہونے کے ان علوم سے واقف نہ تھے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو عطا کیے تھے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں مؤثر وعظ کہا، جس سے

آنکھیں نم ہوگئیں، اور دل پگھل گئے، لوگوں نے پوچھا: اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں! اللہ تعالیٰ کو یہ جواب ناپسند آیا، حکم آیا کہ میرا ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم پر ہے، وہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: خدایا! مجھے اس کا پتہ بتا دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک مچھلی لے لو، دو دریاؤں کے سنگم پر جہاں مچھلی گم ہوجاوے، وہاں وہ بندہ ملے گا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی لے کر سفر شروع کیا۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

لفتٰه : لام حرفِ جر، فتی مضاف، ہٗ ضمیر مضاف الیہ، فتی کے چند معانی آتے ہیں؛ لڑکا، جوان، بوڑھا، عربی میں سب کے لیے بولا جاتا ہے، خادم کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور غلام کے لیے بھی، یہاں خادم کا معنی ہے۔ فتی کی جمع فتية آتی ہے، جیسے: ﴿إنهم فتية امنوا بربهم﴾ . علامہ دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فتی کے لفظی معنی نوجوان کے ہیں۔ اور مجازی معنی غلام یا خادم کے ہیں۔ بطورِ حسنِ ادب کے خادم کو فتی (نوجوان) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لا أبرح : مضارع منفی بلا واحد متکلم، مصدر بَرْحٌ از باب سمع، کسی جگہ سے ہٹنا اور پلٹنا۔ اس کا ماضی ما برح افعالِ ناقصہ میں سے ہے۔

مجمع البحرين : مجمع ظرفِ مکان مضاف، البحرين مضاف الیہ، دو دریا کے ملنے کی جگہ، سنگم، مجمع کا مصدر جَمْعٌ آتا ہے، از بابِ فتح ؛ اجزا یا افراد کو اِکٹھا کرنا، یا کیفیات واعراض کو ملانا۔

حُقُبًا : واحد، جمع أحْقَابٌ، (اور حُقُبٌ جمع حِقَابٌ) مدتہائے دراز۔ برسوں۔ زمانہ ایک سال یا بہت سے سال۔ تقریباً اسی (۸۰) سال یا اس سے زیادہ کا عرصہ۔

حُقُب بسکونِ قاف؛ زمانہ کی ایک مدتِ مقررہ کا نام ہے، مگر اس مدت کی کوئی تعیین نہیں ہے، مفسرین سلف میں سے حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے صاف تصریح کردی ہے کہ احقاب

سے غیر منقطع زمانہ مراد ہے۔ باقی حقب کی مدت کا تعیُّن بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔

حوتهما : الحوت؛ چھوٹی یا بڑی مچھلی، عموماً بڑی مچھلی پر حوت کا اِطلاق ہوتا ہے۔ جمع **حيتان وأحوات . صاحب الحوت :** حضرت یونس علیہ السلام کا لقب۔

سربا : واحد، جمع أسرابٌ آتی ہے، معنی سرنگ۔

سربًا : مفعول ثانی ہے فاتخذ کا، اور مفعول اول سبيله ہے۔

اتنا : آتِ فعل امر واحد مذکر حاضر، نا ضمیر مفعول، مصدر إيتاءٌ از بابِ افعال: دینا، عطا کرنا۔

غداء نا : غداء مضاف، نا ضمیر مضاف الیہ، دن کے ابتدائی حصہ کے کھانے کو **غداء** کہتے ہیں، **تغدّي** بمعنی ناشتہ کرنا۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے **تغدّي** کو سحری کھانے کے لیے استعمال کیا ہے، فرمایا: **كنتُ أتغدّى عند عمر – رضي الله عنه – في رمضان .**

لقينا : ماضی جمع متکلم۔

نصبًا : اسم، مشقت، تھکان، کوفت۔

أوينا : مصدر اَوِيٌّ از باب ضرب؛ فروکش ہونا، اُترنا۔

نسيتُ : فعل ماضی واحد متکلم، مصدر نسيانٌ از بابِ ضرب، بھولنا۔

أنسٰنيه : أنسى ماضی واحد مذکر غائب، ن وقایہ کا ي ضمیر واحد متکلم، اور ہ ضمیر واحد مذکر غائب۔ مصدر إنساءٌ از باب افعال؛ بھلا دینا۔

أنسٰنيه : أي وما أنساني ذكره إلا الشيطان ، وهو بدل اشتمال .

☆...... اعراب ......☆

لآ ابرح حتى ابلغ مجمع البحرين . لا نافیہ، أبرح مضارع مرفوع، أنا ضمیر فاعل، حتى حرفِ غایت وجر، أبلغ مضارع منصوب بأن مضمرہ، أنا ضمیر فاعل، **مجمع** مفعول بہ

منصوب، البحرين مضاف الیہ مجرور، علامتِ جري۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿اتخذ سبيله﴾ میں دو احتمال ہیں:

(١) **الحوت** یعنی؛ **اتخذ الحوت سبيله عجبًا للناس .** مچھلی تو عجب طریقہ سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔

(٢) **موسٰی** یعنی؛ **اتخذ موسى سبيل الحوت يعجب عجبًا منه .** موسیٰ ایک عجیب طریقہ سے مچھلی کا راستہ دریا میں تلاش کرنے لگے۔

☆......بلاغت......☆

﴿نسيتُ﴾ اور ﴿أذكر﴾ میں طباق ہے۔

رؤوسِ آیات میں رعایتِ سجع ہے: مثلاً: ﴿نصبًا . سَربًا . عَجبًا﴾ .

سجع : یعنی کلامِ منثور میں کے دو یا چند فاصلوں کا حرفِ اخیر میں یکساں اور موافق ہونا، چاہے یہ یکسانیت ایک ہی حرف کے استعمال سے ہو، یا دو قریب المخرج حروف لانے سے ہو۔

سجع کا فائدہ : جس کلام کے اجزاء میں ہم آہنگی اور یکسانیت ہوتی ہے، تو مخاطب کو ایک خاص قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے، اور ایسا کلام نفس کو اُس جیسے دوسرے کلام کا مشتاق بنا دیتا ہے، پھر جب اُسی توافُق اور کلام کے اجزاء میں ہم آہنگی کے ساتھ دوسرا کلام بھی اُسی انداز میں پیش ہوتا ہے، جس کا نفس منتظر تھا، تو اس وقت لذت دوگنا ہو جاتی ہے، اور جب فواصل میں بھی دونوں فقرے مشترک ہو جاتے ہیں، تو لذت سہ گنا ہو جاتی ہے، اور فطرتِ سلیمہ اپنے ذوقِ سلیم سے موزون ومقفیٰ کلام کی حلاوت اور مٹھاس محسوس کرتی ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیقِ سفر یوشع بن نون سے کہا: ﴿لا ابرح حتى ابلغ مجمع البحرين او امضي حقبا﴾، جس کا مطلب اپنے سفر کا رُخ اور

منزلِ مقصود، رفیقِ سفر کو بتانا تھا، اس میں بھی حسنِ ادب ہے کہ سفر کی ضروری باتوں سے اپنے رفیق اور خادم کو بھی باخبر کردینا چاہیے، متکبر لوگ اپنے خادموں اور نوکروں کو نہ قابلِ خطاب سمجھتے ہیں، نہ اپنے سفر کے متعلق اُن کو کچھ بتاتے ہیں۔

☆......توشہ وغیرہ کا سفر میں لے کر جانا کوئی خلافِ توکل نہیں، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عین سنت ہے۔ بخاری شریف کی ''کتاب بدء الوحی'' میں یہ الفاظ موجود ہیں: ''**ویتزود لذلک ، ثم یرجع إلی خدیجة فیتزود لمثلها**''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں توشہ ساتھ لے جاتے تھے، جب ختم ہوجاتا، تو پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس گھر تشریف لاتے، اور وہ دوبارہ آپ کو توشہ باندھ دیتی تھیں۔

☆......مسلمانوں کے تعلق سے اس واقعہ کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کے عذاب میں تاخیر سے مسلمان بے چین نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے کام پُراَسرار ہوتے ہیں، عوام تو عوام خواص بھی ان حکمتوں کو نہیں پہنچ سکتے، جب ایک جلیل القدر پیغمبر کی نظر بعض معمولی واقعات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی، تو قوموں کی تباہی کا معاملہ تو نہایت اہم معاملہ ہے، اس کے اسرار اور حکمتوں کو، اور اس کی مقررہ مدت کے رُموز اور مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے؟

☆......مشرکین کے تعلق سے مقصد یہ ہے کہ ان کو جو غریبوں کے ساتھ شریکِ تعلیم ہونے سے عار آتی ہے، وہ موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں غور کریں، انہوں نے اپنے چھوٹے کو بھی بعض خاص علوم میں استاذ بنانے سے عار نہیں کیا۔

☆......یہود کے تعلق سے، جنہوں نے امتحانی سوالات دیئے تھے، یہ مقصد ہے کہ وہ جو خود کو بڑا عالم سمجھتے ہیں، اور اپنی کتابوں کو تمام علوم کا جامع خیال کرتے ہیں، وہ جان لیں کہ یہ اُن کا زعمِ باطل ہے۔ خود موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان سے بڑے عالم موجود تھے، جن سے استفادہ کے لیے آپ علیہ السلام نے سفر کیا۔

۹۴

☆......آگے آنے والے واقعۂ ذوالقرنین کے تعلق سے مقصد یہ ہے کہ ذوالقرنین کا سفر حکومت و دولت حاصل کرنے کے لیے تھا، جس کی کچھ اہمیت نہیں، قابلِ لحاظ موسیٰ علیہ السلام کا تعلیمی سفرنامہ ہے، جو تحصیلِ علم کے لیے تھا، پس یہود کو چاہیے تھا کہ وہ امتحان کے لیے یہ واقعہ پوچھتے، نہ کہ وہ!

☆......طالبِ علم میں علم کی سچی طلب ہونی چاہیے، علم کا ایسا متوالا ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ یعنی طلبِ مطلوب اور تفتیش و تحقیق میں اگر مدتِ مدیدہ بھی صرف ہوجاوے، تو طالب کو اس سے منہ نہیں موڑنا نہیں چاہیے۔

☆......طلبِ علم کی تحصیل کے لیے عمر کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ جس چیز کے علم کی جس وقت ضرورت پڑے، اسی وقت اس کی تیاری کرنی چاہیے۔

☆......﴿**اتنا غداء نا**﴾ سے معلوم ہوا کہ نبی بھوکے ہوتے ہیں، اور زادِ راہ بھی ساتھ رکھتے ہیں، اور تکان بھی محسوس کرتے ہیں، ان میں سے کوئی بات نہ ولایت کے منافی ہے، نہ نبوت کے، پس جو خوش عقیدہ لوگ بزرگوں کی جانب بھوک پیاس اور بشری ضرورتوں کا انتساب بے ادبی تصور کرتے ہیں، وہ صحیح عقیدہ کے لوگ نہیں۔

☆......﴿**لقد لقینا من سفرنا هذا نصبًا**﴾ سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اپنی تکلیفوں کا اظہار جائز ہے، کمال کے منافی نہیں، البتہ بے صبری اور شکوہ شکایت ممنوع ہے۔

☆......حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لیے سفر کیا، تاکہ وہ ان سے علوم حاصل کریں، جو اللہ تعالیٰ نے خاص ان کو عطا کیے ہیں، معلوم ہوا کہ نبی اور رسول کے لیے تمام علوم کا عالم ہونا اور تمام واقعات اور قصص سے باخبر ہونا، اور ہر قسم کے علم سے واقف ہونا ضروری نہیں، البتہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان علومِ ہدایت سے پوری طرح باخبر ہو، جن کو رضائے خداوندی اور قربِ خداوندی اور امت کی اصلاح اور تربیت میں دخل ہو۔

☆......﴿فإني نسيت الحوت﴾ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم یوشع بن نون سے ناشتہ مانگا، تو انہوں نے کہا: میں مچھلی بھول گیا، یہ حسنِ ادب ہے کہ بھولنے کو اپنی طرف منسوب کیا، مخدوم کو اس میں شامل نہ کیا۔

☆......روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو مچھلی کی خبر گیری کے لیے کہا تھا، تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں، لہٰذا ان کو متنبہ کیا گیا کہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کو محض اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

☆......جب انسان سے کسی کام میں بھول ہو جاوے، یا کسی موقع پر کوئی چیز بھول جاوے، اور یاد نہ آ رہی ہو، تو اللہ کا ذکر کرے۔

☆......سفر وغیرہ میں سامان کا ذمہ دار بھی خادم ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس میں مخدوم کی بھی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ہوتی ہے، چنانچہ پہلے فرمایا کہ دونوں بھول گئے؛ ﴿**فلما بلغا مجمع بينهما نسيا حوتهما**﴾۔

☆......کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا عالم ہو، اپنے بارے میں سب سے اعلم ہونے کا دعویٰ بالکل نہ کرے، بلکہ اپنے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرے؛ کہ ہر علم والے سے بڑھ کر کوئی علم والا ہوا کرتا ہے، ﴿**وفوق كل ذي علمٍ عليم**﴾۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿**مجمع البحرين**﴾ سے کون سی جگہ مراد ہے؟ یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟

جواب: (۱) دو دَریاؤں کے سنگم کی تعیین جزم ویقین کے ساتھ مشکل ہے۔ اگر یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیامِ مصر کے زمانہ میں پیش آیا ہے، تو سوڈان میں خرطوم شہر کے پاس، جہاں دریائے نیل کی دو شاخیں ملتی ہیں، وہ جگہ مراد ہے۔ بعض کے نزدیک افریقہ کے دو دَریا مراد ہیں۔

(۲) مجمع البحرین یعنی روم اور فارس کے دو سمندر، جو آپس میں ملتے ہیں۔

بقول شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمہ اللہ: لیکن بحر فارس ورُوم آپس میں ملتے نہیں، شاید ملاپ سے مراد قُرب ہوگا، یعنی جہاں دونوں کا فاصلہ کم رہ جائے۔

(۳) بعض علماء کے نزدیک ''مجمع البحرین'' وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر دجلہ اور فرات خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ واللہ اعلم!

(۴) بقول علامہ قرطبی رحمہ اللہ: مجمع البحرین کے لفظی معنی ہیں؛ ہر وہ جگہ جہاں دو دَریا ملتے ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بے شمار ہیں، اس جگہ مجمع البحرین کی حتمی تعیین قرآن وحدیث میں نہیں ہے، اس لیے آثار وقرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال اس میں مختلف ہیں:

بقول قتادہ: بحر فارس وروم کے ملنے کی جگہ مراد ہے۔

بقول ابن عطیہ: آذربائیجان کے قریب ایک جگہ ہے۔

بقول بعض: بحر اُردن اور بحر قلزم کے ملنے کی جگہ۔ یا مقام طَنجہ۔

بقول ابی بن کعب: افریقہ میں ہے۔

بقول سدی: آرمینیہ۔

بقول دیگر بعض: بحر اندلس جہاں بحر محیط سے ملتا ہے، وہ جگہ مراد ہے۔

وقال الدكتور وهبة الزحيلي رحمه الله : و﴿مجمع البحرين﴾ : هو مكان اجتماع البحرين وصيرورتهما بحرًا واحدًا ، وهما في رأي الأكثرين بحر فارس والروم ؛ أي ملتقى البحر الأحمر بالمحيط الهندي عند باب المندب ، وقيل : إنه ملتقى بحر الروم والمحيط الأطلنطي ، أي ملتقى البحر الأبيض المتوسط والمحيط الأطلسي عند مضيق جبل طارق عند طنجة . وهو المكان الذي وعد فيه موسى بلقاء الخضر .

(۵) بعض حضرات نے مجمع البحرین سے مجازی معنی مراد لیے ہیں، یعنی بحرین سے مراد حقیقی دریا یا سمندر نہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام ظاہری علم؛ علمِ شریعت کے سمندر ہیں۔ اور خضر علیہ السلام باطنی علم کے سمندر ہیں۔ یہ دونوں حضرات جس مقام پر بھی ملیں گے، وہی مجمع البحرین ہے۔

(٦) جمہور مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ واقعہ وادیِ سَینا کی اِسارت کے زمانہ کا ہے، پس بحرِ قلزم کی دوشاخیں؛ خلیج عقبہ اور خلیج سوئز جہاں ملتی ہے؛ وہ جگہ مراد ہے۔ جیسا کہ **أطلس الحديث النبوي** میں ہے: " **والأرجح منطقة البُحيرات بين البحر الأحمر والبحر المتوسِّط ، غرب سيناء** " .

سوال: ﴿**فاتخذ سبيله في البحر سربًا**﴾ میں **سربًا**، اور ﴿**واتخذ سبيله في البحر عجبًا**﴾ میں **عجبًا** کی تعبیر اختیار کی گئی، دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: پہلی تعبیر نفس الامر کے اعتبار سے ہے، کہ مچھلی کا سرنگ بناتے ہوئے جانا، موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے خادم دونوں کے لیے عَجب؛ یعنی حیرت انگیز تھا۔ اور دوسری تعبیر ناظر کے اعتبار سے۔

سوال: ﴿**وإذ قال موسى لفتٰه**﴾ میں فتیٰ سے کون مراد ہے؟

جواب: اس سے مراد حضرت یوشع بن نون بن اُفرائیم بن یوسف علیہ السلام ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عزیز، خادمِ خاص اور متعلم وتلمیذ رشید تھے، بعد کو خود بھی حضرت موسیٰ کے رُو برو نبوت سے مشرف ہوئے، اور اُن کے بعد خلیفہ ہوئے۔ صحیح بخاری میں اس کی تصریح موجود ہے، اور مفسرین بھی تقریباً سب اس پر متفق ہیں۔

سوال: حضرت یوشع بن نون حضرت موسیٰ کے خادم تھے، تو کون سے خادم مراد ہیں؛ خادمِ اجیر، یا خادمِ مملوک، یا خادمِ متبرع؟

جواب: غالبًا آپ حضرت موسیٰ کے خادمِ متبرع ہوں گے، جیسے لڑکا اپنے والدین کے ساتھ، شاگرد اپنے استاذ کے ساتھ، مرید اپنے شیخ کے ساتھ، صغار کبار کے ساتھ، اور عظیم شخصیتوں کے متبعین، معتقدین اور متوسلین اُن کے ساتھ رہا کرتے ہیں، بغیر کسی اُجرت کے۔

سوال: ﴿**نسيا حوتهما**﴾ میں نسیان کو حضرت موسیٰ ویوشع علیہما السلام دونوں کی طرف کیوں منسوب کیا گیا، حالانکہ مچھلی کو حضرت یوشع نے بھولا تھا، خود ہی فرمایا ﴿**فاني نسيت الحوت**﴾؟

جواب: (۱) دونوں کی طرف نسیان کی نسبت مجازی ہے، مراد اس سے حضرت یوشع علیہ السلام ہی ہیں۔ بقول امام فراء رحمہ اللہ: اس کی نظیر یہ آیت ہے: ﴿**يخرج منهما اللؤلؤ**

والمرجان﴾ حالانکہ لؤلؤ اور مرجان صرف کھارے سے نکلتے ہیں، میٹھے سے نہیں، لیکن نکلنے کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے متعلق پوچھنا بھول گئے، اور حضرت یوشع علیہ السلام مچھلی کا عجیب وغریب واقعہ بتانا بھول گئے، لہٰذا نسیان کی اضافت دونوں کی طرف کرنا صحیح ہے۔

سوال: مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ ویوشع سے نسیان کا صدور مچھلی کے زندہ ہوکر دریا میں جانے کے بعد ہوا، اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی کے زندہ ہونے سے قبل مجمع البحرین پہنچ کر وقوعِ نسیان ہوا تھا؟

جواب: آیت میں تقدیم وتاخیر ہے، تقدیرِ عبارت اس طرح ہے: ﴿**فلما بلغا مجمع بينهما اتخذت الحوت سبيله في البحر سربًا فنسيا حوتهما**﴾۔

سوال: حضرت یوشع اس عجیب وغریب واقعہ کو کیسے بھول گئے، حالانکہ یہ واقعہ (مچھلی کا گم ہوجانا) ہی حضرت خضر کی ملاقات کی علامت تھی، پھر نسیان کا صدور کیسے؟

جواب: حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہ کر بہت سے عجیب وغریب واقعات خوارقِ عادات دیکھے تھے، اس وجہ سے اس واقعے کو سابقہ کی طرح ایک واقعہ سمجھا، اس لیے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

سوال: **نَوف البَكّالِي الكُوفي** کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا خیال تھا؟

جواب: حضرت سعید بن جُبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا کہ نوف بکالی کوفی نامی ایک شخص کا گمان وخیال ہے کہ موسیٰ صاحبِ خضر، موسیٰ بنی اسرائیل نہیں تھے، بلکہ کوئی دوسرے موسیٰ ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواباً ارشاد فرمایا: " **كذب عدو الله** "، دشمنِ خدا نے جھوٹ بکا۔

وہ موسیٰ علیہ السلام ہی تھے، جو بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر مبعوث ہوئے تھے۔

سوال: کیا توریت میں حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے اس قصۂ سفر کا ذکر ہے؟

جواب: جی نہیں! اس سفر کا کوئی ذکر نہیں، اور اسی سے ظاہر ہے کہ موجودہ ومروجہ توریت بہ حیثیت تاریخ وتذکرہ کے بھی نامکمل وناقص ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

عقیدۂ باطلہ کا ردّ

آیت : ٦٤ ، ٦٥ : ﴿قال ذلک ما کنا نبغ فارتدّا علی اٰثارھما قصصًاO فوجدا عبدًا من عبادنا اٰتینٰہ رحمۃ من عندنا وعلّمنٰہ من لدنا علمًاO﴾ .

ربط : حضرت خضر علیہ السلام کی اس بے مثال تمثیل (إني علی علم من علم اللّٰہ علّمنیہ لا تعلمہ أنت) سے ﴿وما اوتیتم من العلم الا قلیلا﴾.(سورۃ الإسراء : ۸۵) کی خوب تفسیر ہوگئی، اور مشرکینِ مکہ نے جو اہلِ کتاب کے مشورہ سے آپ کے امتحان کے لیے تین سوال کیے تھے، ان کے ساتھ اس قصہ کا ربط خوب ظاہر ہوگیا کہ نبی کے لیے تمام علوم کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خادمِ خاص یوشع بن نون کے ساتھ مجمع البحرین (دو دَریاؤں کے سنگم) پر پہنچے، اور تھوڑی دیر سُستا کر آگے کی راہ لی، اور اگلے روز دِن چڑھے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم یوشع سے صبح کا ناشتہ مانگا، تب اُنہیں یاد آیا کہ مچھلی تو وہیں بھول گئے ہیں جہاں ستانے کے لیے رُکے تھے، پھر حضرت موسیٰ اور آپ کے رفیقِ خاص واپس اُس جگہ کی طرف لوٹے، تو وہاں حضرت خضر علیہ السلام کو موجود پایا۔

☆……مفرادتِ لغویہ……☆

کنا نبغ : ماضی استمراری جمع متکلم، مصدر بغي از بابِ ضرب، بغي کا اصل معنی ہے؛ میانہ روی سے بڑھنے کی خواہش کرنا، اور اس کی دو قسمیں ہیں:

ایک محمود جیسے عدل کے بجائے احسان کرنا۔ اور فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی پابند رہنا۔

دوسرے مذموم جیسے حق سے تجاوُز کر کے باطل کو اختیار کرنا۔ شبہات میں پڑنا۔

قرآنِ کریم میں اکثر بغي کا استعمال مذموم معنی کے لیے ہوا ہے۔

فارتدّا : فا حرفِ عطف، ارتدّا ماضی تثنیہ مذکر غائب، مصدر اِرتِدادٌ از بابِ افتعال؛

جس راستہ آیا اُسی راستہ واپس جانا۔

قصصًا : مصدر از بابِ نصر، بحالتِ نصب، اسی معنی نشانِ قدم تلاش کرتے ہوئے چلنا، معنیٔ مصدری؛ نقشِ قدم پر چلنا، پیروی کرنا، قدم تلاش کرنا۔

قصصًا : مصدریت کی بنا پر منصوب ہے اور فعل مقدر ہے، جس پر ارتدّا دال ہے، أي : فارتدا یقصّان الأثر قصصًا .

من عبادنا : میں مِن ابتدائیہ ہے۔

علّمناہ : علّم ماضی جمع متکلم، ہٗ ضمیر مفعول، مصدر تعلیمٌ از بابِ تفعیل؛ سکھانا۔

☆……اعراب……☆

فوجدا عبدًا من عبادنا . فا عاطفہ، وجدا فعل بافاعل، عبدا مفعول بہٖ منصوب، من عبادنا جار مجرور متعلق صفت کے، نا ضمیر مضاف الیہ۔

☆……بلاغت……☆

﴿عبدًا﴾ : عبدًا کو نکرہ استعمال کیا گیا، تنکیر برائے تفخیم ہے۔

﴿عبادنا﴾ : اضافت تشریفی ہے، بندہ یعنی حضرت خضر علیہ السلام کے اکرام و تخصیص کے لیے جمع لائی گئی۔

﴿من عندنا﴾ اور ﴿من لدنا﴾ اعادۂ کلمہ بغرضِ تفنُّن ہے۔

☆……پیغام واحکام……☆

☆……حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم و رفیقِ خاص کو اُن کی غفلت کے باوجود ڈانٹ پھٹکار سے نہیں نوازا، بلکہ پرسکون انداز میں کہا، چلو واپس اسی جگہ چلتے ہیں، جہاں مچھلی غائب ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو عموماً اور طبقۂ علماء کو خصوصاً اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے۔

☆……جب کسی شخص کو تھوڑا بہت علم آجاتا ہے، تو وہ لوگوں پر فخر کرنے لگ جاتا ہے، تکبر وغرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس قصہ میں یہ سبق اور پیغام دیا جا رہا ہے، کہ خدا تعالیٰ کے

دریائے علم کی کوئی حد اور انتہا نہیں، جس کو جو علم ملا وہ اس کے دریائے علم کا ایک قطرہ ہے، اور ایک قطرۂ آب پر ناز کرنا مناسب نہیں، جب بھی ناز وتکبر ذہن میں آئے، اس دریا پر نظر کرو جہاں سے یہ قطرہ ملا ہے۔

☆......**عبدًا من عبادنا** :اِن الفاظ سے عقیدۂ باطلہ کا ردّ بھی ہوتا ہے کہ وہ بزرگ (خضر علیہ السلام) بایں مرتبۂ کمال بہر حال اللہ کے ایک بندے ہی تھے، بندہ سے ذرہ بھر بھی زائد نہ تھے، اور بندے بھی کیسے؟ حق تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک! اللہ اللہ! قرآن مجید کو کس درجہ اہتمام تحفُّظِ توحید کا، اور شائبۂ شرک سے احتراز واحتیاط کا ہے!

لیکن آج کی عوام کالانعام اور اندھے بھکتوں کا حال یہ ہے کہ جہاں کسی شخص میں غیر معمولی خرقِ عادت کوئی چیز دیکھ لیں، بس اُس کے خوش عقیدت بن جاتے ہیں، اور حد تو یہ ہے کہ ''گھوڑے شاہ''، ''گدھے شاہ''، اور ''بھیلے شاہ باوا'' (نربھینسہ) کو بھی حاجت روا، مشکل کشا بلاچوں وچرا تسلیم کر بیٹھتے ہیں، اور باقاعدہ اُن کی مزاریں بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ **اللّٰھم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه . آمین !**

☆......بعض لوگ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام من جملہ فرشتوں کے ایک فرشتہ تھے، بنی آدم میں سے نہ تھے،...... یہ ناچیز (علامہ ادریس کاندھلوی) کہتا ہے کہ حقیقتِ حال تو اللہ کو معلوم ہے، مگر خضر علیہ السلام کے جو افعال حق تعالیٰ نے ذکر فرمائے، تو وہ ملائکہ مُدبراتِ امر سے؛ یعنی کارکنانِ قضاوقدر سے ملتے جلتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ملائکہ کرام کا علم اور قسم کا ہے، اور انبیاء ومرسلین کا علم اور قسم کا ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ دکھلا دیا کہ ہمارے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ جو ملائکہ کی طرح ہمارے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں، اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ درِپردہ کیا ماجرا ہے۔

☆......حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ چار پیغمبر زندہ ہیں، جو زمین

والوں کے لیے امان ہیں، ان چار میں سے دو زمین میں ہیں: خضر علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام، یہ دونوں نبی ہیں، اور دونوں زندہ ہیں، اور ہر سال موسم حج میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ اور دو نبی آسمان پر زندہ ہیں: ادریس علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿فوجدا عبدًا﴾ میں عبدًا سے کون سا بندہ مراد ہے؟

جواب: ''عبد مقرب ومقبول'' جس کا نام ''خضر'' یا ''عابر'' یا ''خضرون'' یا ''الیسع'' یا ''الیاس'' تھا۔ اور صحیح وراجح قول کے مطابق حضرت خضر کا نام ''بلیا بن مَلْکان'' ہے۔ ابو العباس آپ کی کنیت اور خَضِر آپ کا لقب تھا۔

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کو ''خضر'' کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: خضر کے معنی ہیں ''سبزہ زار''، وہ ایک مرتبہ سفید سوکھی زمین پر بیٹھے تھے، تو وہ یکا یک سبز زار ہو کر لہلہانے لگی۔

بروایت بغوی: ہمام بن منبہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خضر کو ''خضر'' کہنے کی وجہ یہ تھی کہ خضر جب خشک زمین یا خشک گھاس پر بیٹھ جاتے، تو وہ سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی تھی۔

بقول امام مجاہد: جس جگہ خضر نماز پڑھتے تھے، اس کے گرداگرد سبزہ ہی سبزہ ہو جاتا تھا۔

سوال: کیا حضرت خضر علیہ السلام اسرائیلی نسل سے ہیں؟

جواب: جی ہاں! بقول امام بغوی: حضرت خضر اسرائیلی نسل سے ہیں۔

اور بقول بعض: شاہی خاندان سے تھے، دنیا کو ترک کیا اور زہد ودرویشی کی راہ اختیار کی۔ ظاہر میں ذوالقرنین کے وزیر تھے، لیکن درِپردہ فقیر اور درویش تھے۔

بقول صاحب تفسیر مظہری: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ خضر اسرائیلی نہیں تھے، ورنہ موسیٰ کی اتباع اُن پر لازم ہوتی، حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔ صحیح حدیث میں بھی ہے

کہ خضر کے جواب میں حضرت موسیٰ نے کہا: میں موسیٰ ہوں، خضر نے کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ تو حضرت موسیٰ نے جواب دیا: جی ہاں! موسیٰ بنی اسرائیل!

سوال: جمہور علماء کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام کس کی نسل سے ہیں؟

جواب: جمہور علماء کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی فرزند ہیں۔

سوال: بعض لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو فرشتہ تسلیم کیا ہے، جب کہ اکثر نے نسلِ آدم میں شمار کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ واضح فرمائیں!

جواب: مفسر قرآن علامہ کاندھلوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: حضرت خضر علیہ السلام اگرچہ نسلِ آدم سے ہوں، مگر عجب نہیں کہ ان پر غلبہ شانِ مَلَکِیَّت کا ہو، اور اس طرح کے اُمور ان کے سپرد کیے گئے ہوں، جس طرح کے اُمور ملائکہ کے سپرد کیے گئے، اور عجب نہیں کہ اسی غلبۂ ملکیت کی وجہ سے خضر علیہ السلام عام نظروں سے محجوب و مستور کر دیئے گئے ہوں، جیسے عام لوگوں کو فرشتے نظر نہیں آتے، اسی طرح خضر علیہ السلام بھی عام لوگوں کو نظر نہیں آتے۔

خلاصہ یہ کہ خضر علیہ السلام حقیقت کے اعتبار سے اگرچہ انسان ہوں، مگر عملی طور پر نمونۂ ملائکہ ہیں، اور رجالِ غیب میں سے ہیں، جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

سوال: جس وقت موسیٰ وخضر کی آپس میں ملاقات ہوئی، خضر کس حال میں تھے؟

جواب: ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ متعینہ جگہ پر پہنچے، تو دیکھا کہ ایک شخص کپڑا اوڑھے چت لیٹا ہے، کپڑے کا کچھ حصہ سر کے نیچے دبا ہے، اور کچھ ٹانگوں کے نیچے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس وقت حضرت خضر وسطِ سمندر میں ایک جھالر دار سبز مسند بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔

سوال: ﴿اٰتینٰہ رحمۃً﴾ میں رحمۃً سے کیا مراد ہے؟

جواب: (۱) بعض کے نزدیک رحمت سے نبوت اور ہدایت مراد ہے۔

(۲) جمہور مفسرین کے نزدیک رحمت سے ولایت اور مقبولیت مراد ہے، اور لفظ رحمت مجمل ہے، جس میں دونوں معنی کا احتمال ہے، اس لیے بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام ولی تھے، نبی نہ تھے۔

سوال: حضرت خضر علیہ السلام رسول تھے، یا نبی تھے؟ یا محض ولی؟

جواب: (۱) بقول شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمہ اللہ: اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خضر کو رسول مانا جائے، یا نبی، یا محض ولی کے درجے میں رکھا جائے۔ ایسے مباحث کا فیصلہ یہاں نہیں ہوسکتا، تاہم احقر (علامہ عثمانی) کا رجحان اسی طرف ہے کہ ان کو نبی تسلیم کیا جائے، اور جیسا کہ بعض محققین کا خیال ہے کہ جو انبیاء جدید شریعت لے کر نہیں آتے، ان کو بھی اتنا تصرف واختیار عطا ہوتا ہے، کہ مصالح خصوصیہ کی بنا پر شریعتِ مستقلہ کے کسی عام کی تخصیص، یا مطلق کی تقیید، یا عام ضابطہ سے بعض جزئیات کا استثناء کر سکیں۔ اسی طرح کے جزئی تصرفات حضرت خضر کو بھی حاصل تھے۔ واللہ اعلم!

(۲) بقول قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ: امام بغوی لکھتے ہیں کہ اکثر علماء خضر کو نبی تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن میرے (قاضی ثناء اللہ کے) نزدیک علماء کا یہ قول غور طلب ہے، کیوں کہ اولیاء کو جو علم الہام سے حاصل ہوتا ہے، وہ ظنی ہوتا ہے، یقینی نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، اُن کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خاص احکام وہ دیئے گئے تھے، جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود اس کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا ﴿وما فعلتُه عن امري﴾ میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امر الٰہی سے کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں۔

(۳) بقول فقیہ ملت ومفکر اسلام مفتی محمود صاحب پاکستانی رحمہ اللہ: حضرت خضر کے متعلق فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ تکوینیات کے پیغمبر تھے، تشریعی نبی نہیں تھے۔ اور امورِ تکوینیہ قانون نہیں بنتے، نہ ان کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ امورِ تشریعیہ کے نبی تھے، اور امورِ تشریعیہ قانون بھی ہوتے ہیں، اور ان کی تبلیغ بھی کی جاتی ہے۔

سوال: جب دونوں کی نبوت الگ الگ تھی، یعنی خضر علیہ السلام امورِ تکوینیہ کے نبی تھے، اور موسیٰ علیہ السلام امورِ تشریعیہ کے نبی تھے، تو پھر موسیٰ کو خضر کے پاس کیوں بھیجا گیا؟

جواب: حضرت موسیٰ کو ان تکوینیات کی تعلیم کی ضرورت نہ تھی، صرف اللہ تعالیٰ انہیں یہ بتلانا چاہتے تھے کہ دنیا میں ایسے بندے بھی موجود ہیں۔

سوال: ﴿**وعلّمناه من لدنا علمًا**﴾ میں علماً سے کیا مراد ہے؟

جواب: (۱) بقول مفسر کاندھلوی رحمہ اللہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو اسرارِ غیبی اور باطنی حکمتوں اور مصلحتوں کا علم عطا فرمایا تھا، صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ایسے علم کو علمِ لدنی کہتے ہیں، جس میں اسبابِ ظاہری کا دخل اور واسطہ نہ ہو، اور عالمِ غیب سے براہِ راست علم اس کے قلب میں داخل ہو، ملائکہ پر جو من جانب اللہ علوم فائض ہوتے ہیں، وہ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

(۲) علماً سے؛ ذات وصفات کا علم مراد ہے۔

سوال: علمِ لدنی اور علمِ حصولی یا اکتسابی میں کیا فرق ہے؟

جواب: قلب میں عام طور پر جو علم داخل ہوتا ہے وہ حواسِ ظاہری کے دروازوں سے داخل ہوتا ہے، ایسے علم کو ”علمِ حصولی یا علمِ اکتسابی“ کہتے ہیں۔ اور جب کسی کے قلب میں کوئی دروازہ عالمِ ملکوت کی طرف کھل جائے، اور بلا ان ظاہری دروازوں کے کوئی علم قلب میں پہنچ جائے، تو ایسے علم کو علمِ لدنی/علمِ وہبی/اور علمِ حضوری کہتے ہیں۔

سوال: جب حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کی ملاقات ہوئی، تو کیا گفت وشنید ہوئی؟

جواب: آپس میں سلام ہوا، اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آنے کی غرض اُن کے سامنے پیش کیں، تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ”**إني على علم من علم الله علّمنيه لا تعلم ، وأنت على علم من علم الله علّمك الله لا أعلم** “، یعنی مجھے اللہ پاک کی طرف سے ایک خاص علم ملا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے خاص مجھ کو عطا کیا ہے، جس کا تعلق اسرارِ کونیہ اور جزئیاتِ غیبیہ سے ہے، یہ علم مجھ کو ایک خاص مقدار میں ملا ہے، تم اس کو نہیں جانتے، اور تم کو من جانب اللہ ایک خاص علم ملا ہے، جس کا تعلق اسرارِ شریعت، احکامِ ہدایت اور اصلاحِ امت سے ہے، یہ علم اللہ نے خاص تمہیں سکھایا ہے، میں اس علم کو نہیں جانتا، مطلب یہ کہ میرا علم اور تمہارا علم دو مختلف قسمیں ہیں، دونوں یک جا جمع نہیں ہو سکتے، اس لیے تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے، اسی اثنا میں وہاں ایک چڑیا دکھائی دی جو دریا میں سے پانی پی رہی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محض تفہیم کے لیے کہا: میرا علم، تمہارا علم، اور ساری مخلوقات کا علم اللہ کے سامنے ایسا ہے جیسے دریا میں سے چڑیا کے منہ میں ایک قطرہ پانی، الغرض! ساری دنیا کا علم متناہی ہے، جسے خدا کے غیر متناہی علم سے کیا نسبت!...... چہ نسبت خاک را با عالَمِ پاک!

سوال: کیا حضرت خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں، یا وفات پا چکے؟

جواب: (۱) جمہور علمائے شریعت کا مذہب یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں، اور تا قیامت زندہ رہیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چشمۂ حیات سے پانی پیا ہے، اور یہی وہ شخص ہیں جن کو دجال قتل کر کے زندہ کرے گا۔ اور ان کے بعد کسی کے قتل پر قادر نہ ہوگا، قیامت کے قریب جب قرآن سینوں اور مصاحف سے اُٹھا لیا جائے گا، اس وقت ان کی وفات ہوگی۔

(۲) اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام مر چکے ہیں۔

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کی وفات وحیات کے بارے میں قولِ فیصل کیا ہے؟

جواب: (۱) صوفیائے کرام، اولیائے عظام، اہلِ صلاح، اہلِ معرفت؛ بلا اختلاف

سب اسی پر متفق ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔اور اہلِ صلاح ومعرفت کے حضرت خضر کے ساتھ ملاقات اور ان کے دیدار کی حکایات بھی بکثرت، بے شمار اور مشہور ہیں، حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔نیز اولیائے کرام وگروہِ صادقین کا؛ اہلِ کشف واہلِ الہام میں سے ہونا مسلّم اور امرِ قطعی وبدیہی ہے، اس لیے ان کے مکاشفات ومتفقہ مشاہدات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) خضر علیہ السلام کی حیات کا مسئلہ اُمورِ تشریعیہ سے نہیں، بلکہ اُمورِ تکوینیہ اور اَسرارِ کونیہ کی جنس سے ہے۔

سوال: حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی تحقیق اس بابت (خضر علیہ السلام سے متعلق) کیا ہے؟

جواب: (علامہ کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں): حضرت استاد مولانا سید انور شاہ قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں علمائے شریعت اور اولیائے طریقت کا اختلاف پاؤ، تو یہ دیکھو کہ وہ مسئلہ اُمورِ تشریعیہ یعنی احکامِ شریعت سے متعلق ہے، یا اُمورِ تکوینیہ یا اسرارِ کونیہ کے باب سے ہے، پس اگر وہ مسئلہ اُمورِ تشریعیہ یعنی حلال وحرام اور یجوز ولا یجوز سے متعلق ہو، تو اس وقت علمائے شریعت کے قول وفتویٰ کو ترجیح دینا، کیوں کہ علمائے شریعت کا گروہ احکامِ شریعت سے خوب آگاہ ہے۔اور اگر وہ مسئلہ اُمورِ تکوینیہ واسرارِ کونیہ سے متعلق ہو، اور افعالِ مکلفین سے اس کا تعلق نہ ہو، تو اس جگہ اولیائے طریقت اور اہلِ معرفت وارباب بصیرت کے قول کو ترجیح دینا، کیوں کہ یہ گروہ اہلِ کشف اور اہلِ الہام، صادقین وصالحین کا گروہ ہے، اگر وہ اپنا کوئی مشاہدہ ومکاشفہ بیان کرے، تو عقلاً ونقلاً اس کو قبول کرنا ضروری ہے۔واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم!

سوال: بعض محدثین حضرات نے حیاتِ خضر کا انکار کیا ہے، وہ کون کون ہیں؟

جواب: ابو یعلیٰ حنبلی، قاضی ابو بکر بن عربی، ابو بکر بن عیاش، ابن جوزی اور علامہ ابن تیمیہ رحمہم اللہ؛ یہ حضرات کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں، اگر زندہ ہوتے تو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں ضرور حاضر ہوتے، اور آپ پر ایمان لاتے، آپ کے ہم راہ جہاد کرتے، حالانکہ یہ امر کہیں ثابت نہیں۔

سوال: حیاتِ خضر کے منکرین محدثین کا استدلال کیا ہے؟

جواب: وہ ﴿**وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد**﴾ (سورة الأنبياء: ۳۴) سے استدلال کرتے ہیں کہ کسی بشر کے لیے خلود ودوام نہیں۔نیز بخاری شریف کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ایک ماہ قبل یہ ارشاد فرمایا: ”**لا یبقی ممن ھو علی وجه الارض**“ (جو لوگ اس وقت روئے زمین پر زندہ ہیں، وہ سو سال کے بعد باقی نہ رہیں گے)۔اور وفات کے قول کی امام بخاری رحمہ اللہ کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

سوال: جمہور علمائے کرام منکرین حیاتِ خضر کے استدلال کا کیا جواب دیتے ہیں؟

جواب: جمہور اہلِ علم کے مطابق مذکورہ استدلال نہایت ضعیف وکم زور ہے، اور یہ استدلال اگر صحیح ہو بھی جائے، تو اس سے تو ملائکہ اور جنات وشیاطین سب کی وفات بھی ثابت ہوسکتی ہے، بلکہ دجال کی موت بھی ثابت ہوسکتی ہے، حالانکہ وہ بالاجماع زندہ ہے، اور ایک جزیرے میں محبوس ہے۔

سوال: جمہور علماء حیاتِ خضر کے سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: حضرت خضر علیہ السلام تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ طویل العمر ہیں، انہوں نے چشمۂ حیات سے پانی پیا ہے، اور وہ ولی کامل ہیں، معمر (طویل العمر) اور محجوب عن الابصار؛ یعنی عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات کا متعدد احادیث میں ذکر آیا ہے، جن کا حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے۔(مفتی محمود صاحب پاکستانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمیں اس قصہ کی باتوں کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہ کوئی عقیدے کا مسئلہ نہیں ہے)۔

سوال: محدثین حضرات کے مطابق، حافظ ابن حجر عسقلانی کی حیاتِ خضر سے متعلق ذکر کردہ روایات مستند نہیں ہیں؟ تو پھر جمہور علماء انہیں کیا جواب دیتے ہیں؟

جواب: وہ روایتیں اگرچہ زیادہ مستند نہیں، لیکن موضوع اور بے اصل بھی نہیں، اور اس بارے میں زیادہ مشہور، حدیثِ تعزیت ہے، وہ یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سفید ریش بزرگ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ پر آئے اور روئے، اور لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور غائب ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے لوگوں سے کہا کہ: یہ خضر تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما نے کہا کہ: یہ خضر ہیں۔

نوٹ: حصن حصین کے متعلق معارف القرآن شفیعی میں ہے کہ: مصنف (اس (حصن حصین) میں صرف صحیح السند روایات ہی درج کرتے ہیں۔

سوال: عند اور لدن میں کیا فرق ہے؟

جواب: (۱) عند: قربِ زمانی ومکانی کے لیے آتا ہے، اور مِن داخل ہو، تو مزید تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ لدن: پر مِن ہمیشہ داخل ہوتا ہے۔ اور عند سے اخص وابلغ ہے۔ مزید قربت اور تمکُّن کے لیے آتا ہے۔ لدی اس کا ہم معنی ہے جو مِن کے بغیر آتا ہے۔

(۲) **عند** اور **لدی** و **لدن** میں فرق یہ ہے کہ **عند** میں شے یعنی چیز کا قبضہ اور ملک میں ہونا کافی ہے، ہر وقت پاس رہنا ضروری نہیں، جیسے **المال عند زید** (مال زید کے پاس ہے)، خواہ مال خزانہ (بینک اکاؤنٹ) میں ہو، یا اس کے پاس حاضر ہو۔ اور **المال لدی زیدٍ** اس وقت کہیں گے جب مال زید کے پاس حاضر ہو۔ پس **عند** عام ہے، اور **لدی** و **لدن** خاص ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

طالبِ علم کا استاذ کے ساتھ گفتگو کا انداز...... گفتگو میں تواضع وآداب کا لحاظ شاگرد پر استاد کا اتباع لازم ہے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طالبِ علمی

قدرے جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

آیت: ٦٦ ، ٦٧ ، ٦٨ ، ٦٩ ، ٧٠ :

﴿قال له موسىٰ هل اتبعک علىٰٓ ان تعلمن مما علمت رُشدًاO قال انک لن تستطیع معي صبرًاO و کیف تصبر علی ما لم تحط به خُبرًاO قال ستجدنيٓ ان شآء الله صابرًا ولا اعصي لک امرًاO قال فان اتبعتَني فلا تسئلني عن شيء حتیٓ احدث لک منه ذِکرًاO﴾ .

ربط: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے ملے، علیک سلیک کے بعد خضر نے آنے کا سبب پوچھا، موسیٰ نے سبب بتلایا، کہ آپ کو اسرارِ کونیہ اور امورِ باطنیہ کا علمِ لدنی حاصل ہوا ہے، وہ مجھے بھی سکھائیں، تو حضرت خضر نے فرمایا کہ آپ شریعت واحکام کے پابند ہیں، جن کا دارومدار ظاہر پر ہے، اور مجھ سے ایسے اُمور سرزد ہوں گے، جو بظاہر شریعت کے خلاف ہوں گے، اور ان کے اصل راز اور اندرونی حقیقت کی آپ کو اطلاع نہ ہوگی، نتیجۃً آپ صبر نہ کرسکیں گے، سوال کریں گے، اس لیے کہ آپ نبی ہیں، اور نبی کے ذمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ عائد ہوتا ہے، آپ جس کام کے ظاہر میں مامور ہوں گے، میں من جانب اللہ باطنی حکمت ومصلحت پر مطلع ہونے کی وجہ سے اس کام کے کرنے پر معذور ہوں گا، آپ کی طرف سے سوالات مؤاخذہ اور روک ٹوک جاری رہے گی، اور تعلیم وتعلُّم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکے گا۔ بہرحال حضرت موسیٰ نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں آپ کی مخالفت نہ کروں گا۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

أن تعلّمن : مضارع منصوب بِأَنْ واحد مذکر حاضر، ن وقایہ، ي متکلم ضمیر محذوف مفعول۔

مما عُلّمت رُشدًا : ما اسم موصول بمعنی الذي ، علّمت : جملہ فعلیہ ہوکر صلہ ما موصول کا۔ ضمیر عائد محذوف ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: من الذي عُلّمته رشدًا، ہٗ ضمیر کو بغرض تخفیف حذف کیا گیا جو علمت کا مفعول ثانی ہے۔ رشدًا تعلمني کا مفعول ثانی ہے۔

لن تستطیع : مضارع واحد مذکر حاضر، منصوب منفی بَلَنْ۔ مصدر استطاعة از بابِ استفعال، طاقت رکھنا، قدرت رکھنا۔

لم تُحط : مضارع واحد مذکر حاضر، مجزوم بَلَمْ، مصدر إحاطةٌ از باب افعال، گھیر لینا۔

خُبرًا : اسم ومصدر از بابِ نصر، دانش، سمجھ، خبر، خبرداری، خبر رکھنا، وغیرہ۔

ستجدني : مضارع واحد مذکر حاضر، ن وقایہ کا ي ضمیر مفعول۔ مصدر وُجودٌ از بابِ ضرب، پانا۔

حتی أحدث : مضارع منصوب بِحَتّٰی واحد متکلم، مصدر إحدَاثٌ از بابِ افعال، پیدا کرنا، کسی شے کو نئے سرے سے شروع کرنا۔

☆...... اعراب ......☆

ستجدنيٓ ان شآء اللّٰه صابرًا . س حرفِ استقبال، تجدني مضارع مرفوع، ن وقایہ، ي ضمیر متکلم مفعول بہ منصوب، ضمیر أنت فاعل، إن حرفِ شرط جازم، شاء فعل شرط ماضی محلاً مجزوم، اللّٰہ لفظ جلالہ فاعل مرفوع، صابرًا مفعول بہ ثانی منصوب۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......طالبِ علم کے لیے استاذ کی اِطاعت اور فروتنی ضروری ہے، اس کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا۔

☆......طالبِ علم جب اپنے استاذ کے ساتھ گفتگو کرے، تو نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ کرے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کی۔

☆...... مستقبل کے کسی کام کی انجام دہی کے لیے بطورِ تبرک وبطریقِ توکل؛ ''اِن شاءاللّٰہ'' کہنا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آیتِ مذکورہ میں استعمال کیا؛ **﴿قال ستجدنيٓ ان شآء اللّٰه صابرًا و لا اعصي لک امرًا﴾**.

☆...... بندے کا فعل خواہ صبر ہو، یا شکر ہو، سب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، بندہ اپنے کسی قول، فعل اور عمل میں مستقل بالذات نہیں۔ '' **لا حول و لا قوة إلا باللّٰه العلي العظيم** '' .

☆......**﴿قال ستجدنيٓ ان شآء اللّٰه صابرًا و لا اعصي لک امرًا﴾** حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سارا کلام درحقیقت حضرت خضر علیہ السلام کے قول **﴿انک لن تستطیع معي صبرًا﴾** کا جواب تھا، اہلِ فہم وبصیرت حضرات ؛ موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب باصواب پر غور فرمائیں، کہ جس کے ہر لفظ اور ہر حرف سے ادب اور تواضع ٹپک رہی ہے، مثلاً:

(۱)......**هل أتبعک** سے اتباع کی اجازت چاہی کہ اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنے آپ کو، آپ کے تابع کر دوں۔

(۲)......**علی ان تعلمن** سے اقرار کیا کہ آپ عالم اور معلّم ہیں، اور میں آپ کا متعلّم بننا چاہتا ہوں۔

(۳)......**مما عُلِّمت** کہہ کر حضرت خضر علیہ السلام سے بعض علم کی درخواست کی کہ آپ اپنے علم میں سے کچھ حصہ اور اس کا کوئی جز مجھ کو مرحمت فرمائیں، مطلب یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ- میں علم میں آپ کے برابر ہو جاؤں، بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ جو علم آپ کو حاصل ہے، اس میں سے کوئی جز مجھے عطا فرمائیں۔

(۴)......**عُلِّمت** سے اس بات کا اقرار کیا کہ یہ علم آپ کو من جانب اللہ ملا ہے۔

(۵)......**رُشدًا** سے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ علم رُشد وہدایت ہے، اس رشد میں سے

کچھ عطا کیے جانے کی درخواست کی۔

(۶)......**ستجدني ان شآء الله صابرًا** یعنی اِن شاءاللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔

(۷)......**ولا اعصي لک أمرًا** یعنی میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

☆......علامہ ابن عاشور تحریر آیت ﴿**هل اتبعک**﴾ کے تحت لکھتے ہیں: '' **ويؤخذ من الآية جواز التعاقد على تعليم القرآن والعلم ..... العرف فيه يقوم مقام الاشتراط** '' . (آیتِ کریمہ سے تعلیم قرآن و دینی تعلیم پر آپس میں معلم و متعلم کے مابین عقد جائز ہے۔ نیز معلم و استاذ کی ذمہ داری ہے کہ متعلمین وطلبہ کے لیے جو حکومتی و سرکاری قوانین اور عرف موجود ہوں، اُن کے مطابق انہیں تعلیم دیں)۔

☆......﴿**انک لن تستطيع معي صبرًا**﴾ سے اصولِ تعلیم معلوم ہوا، کہ مہتمم و منتظمِ مدرسہ، داخلہ کے لیے آنے والے طلبہ و متعلمین کے سامنے ادارہ کی شرائط بیان کردے۔ اور معلم اپنے پاس پڑھنے والے متعلم وطالبِ علم کے سامنے اپنی درس گاہ کے اصول وضوابط واضح کردے، موضوعاتِ علوم کی اُسے تلقین کردے، اور صبر وثبات کی تاکید کردے۔

☆......﴿**فلا تسئلني عن شيء حتىٰ احدث لک منه ذِكرًا**﴾ سے معلوم ہوا کہ استاذ سبق میں جب تک اپنی بات مکمل نہ کرلے، تب تک سبق کی تقریر پر کوئی اعتراض نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ تقریر کے ختم تک دفع دخل مقدر کردے، قبل از وقت ہی سوال واعتراض کر بیٹھنا استاذ و شاگرد کے مابین نفرت پیدا ہونے کا سبب ہے۔

☆......درمیانِ درس و تقریر ہی سوال واعتراض کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ مسؤول واستاذ ذہنی طور پر کسی اور موضوع میں مشغول ہے، بیچ درس میں اعتراض کا جواب تشفی بخش واطمینان بخش نہیں ہوگا، دل میں قلق واضطراب کی سی کیفیت پیدا ہوجائے گی، برخلاف درس کے مکمل ہونے پر بتانے سے، دل میں ایک انبساط کی کیفیت ہوگی، استاذ نشیط، چست اور چاق وچوبند ہوگا۔ کھلے ذہن سے اعتراضات کے جوابات دے گا، سامع وسائل کو بھی تشفی حاصل ہوگی۔

☆......سوالات......☆

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام خود وقت کے نبی اور صاحبِ شریعت تھے، پھر آپ دوسروں سے علم حاصل کررہے ہیں، یہ تو شانِ نبوت کے منافی معلوم ہوتا ہے؟

جواب: (۱) جو علم حضرت خضر علیہ السلام کو دیا گیا تھا، اس کا تعلق اسرارِ شریعت سے نہیں، بلکہ اسرارِ کونیہ واُمورِ باطنیہ سے تھا، اور ایسا علم جس کا تعلق شریعت اور احکامِ خداوندی سے نہ ہو، نبی کا غیر نبی سے ایسے علم کا سیکھنا نبوت کے منافی نہیں، اور حدیث؛ ''**أنتم أعلم بأمر دنیاکم**''. اس کی مؤید ہے۔

الغرض! صاحبِ شریعت پیغمبر کا کسی غیر نبی سے ایسے اُمور کو سیکھنا کہ جن کا اصولِ دین اور فروعِ دین سے کوئی تعلق نہ ہو، شانِ نبوت کے منافی نہیں۔

(۲) بقول امام رازی رحمۃ اللہ علیہ: یہ بہ آسانی ممکن ہے کہ ایک شخص بہت سے علوم میں عالم ترین ہو، پھر بھی بعض علوم سے ناواقف ہو، اور اس کے سیکھنے کے لیے وہ کہیں اور بھیج دیا جائے۔

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کی تصریح کے مطابق کہ؛ ہم دونوں کے علم کی نوعیت مختلف ہے، جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے، تو ان دونوں کے احکام میں تضاد اور اختلاف کیسے ہوا؟

جواب: تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اس کی اقرب الی الصواب اور دل لگتی تحقیق بیان فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں، وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں، جن کے سپرد اصلاحِ خلق کی خدمت ہوتی ہے، ان پر کتاب وشریعت نازل کی جاتی ہے، جن میں خلقِ خدا کی ہدایت واصلاح کے اصول وقواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن کریم میں بتصریح نبوت ورسالت آیا ہے، وہ سب کے سب ایسے ہی تھے، جن کے سپرد تشریعی واصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں، جن کے لیے عام طور پر ملائکۃ اللہ مقرر ہیں، مگر زمرۂ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لیے مخصوص کرلیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں۔''

سوال: تکوینی خدمات سے کیا مراد ہے؟

جواب: تکوینی خدمات واقعاتِ جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں، مثلاً: فلاں ڈوبنے والے شخص کو بچالیا جائے، یا فلاں کو ہلاک کردیا جائے، فلاں کو ترقی دی جائے، فلاں کو زیر کیا جائے، ان تکوینی معاملات کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اوران کے احکام بھی عوام سے متعلق نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے واقعاتِ جزئیہ میں بعض وہ صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریعی قانون کے خلاف ہیں، مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریعی قانون سے مستثنیٰ کرکے اس شخص کے لیے جائز کردیا گیا ہے، جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علماء، اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے، اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے، وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے۔

سوال: پورے قرآن میں جملہ " إن شاء الله "، کتنی جگہ آیا ہے؟

جواب: کل چھ جگہوں پر آیا ہے، وہ یہ ہیں:

(١)﴿قالوا ادع لنا ربک یبیّن لنا ما ھي ان البقر تشابه علینا وانا ان شاء الله لمھتدونO﴾ . (سورة البقرة : ٧٠)

(٢)﴿فلما دخلوا علی یوسف اٰوٰی الیه ابویه وقال ادخلوا مصر ان شآء الله امنینO﴾ . (سورة یوسف : ٩٩)

(٣)﴿ستجدنيٓ ان شآء الله صابرًا ولا اعصي لک امرًاO﴾ (الکھف : ٦٩)

(٤)﴿ومآ ارید ان اشق علیک ستجدنيٓ ان شآء الله من الصّٰلحین O﴾ .
(سورة القصص : ٢٧)

(٥)﴿قال یآ ابت افعل ما تؤمَر ستجدنيٓ ان شآء الله من الصّٰبرین O﴾ .
(سورة الصافات : ١٠٢)

(٦) ﴿لتدخلنّ المسجد الحرام ان شآء الله امنین محلّقین رؤوسکم ومقصّرین﴾ . (سورة الفتح : ٢٧)

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت موسیٰ وخضر کے سفر کا پہلا مرحلہ
بھول ہوجانا، نہ کمالِ نبوت کے منافی ہے نہ کارِ نبوت کے
عذرِ معقول پیش کیا جاسکتا ہے......عذرِ معقول کو قبول کرلینا چاہیے

آیت : ٧١، ٧٢، ٧٣ :

﴿فانطلقا حتی اذا رکبا في السفینة خرقھا قال اخرقتھا لتغرق اھلھا لقد جئت شیئًا اِمرًاO قال الم اقل انک لن تستطیع معي صبرًاO قال لا تؤاخذني بما نسیتُ ولا ترھقني من امري عُسرًاO﴾ .

ربط : بہرحال عہد وپیمان کے بعد حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام نے رختِ سفر باندھا، چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے جہاں کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت پیش آئی، ناخدا نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان کر بصد تعظیم وتکریم کشتی میں مفت سوار کرلیا، کچھ دور چلنے کے بعد حضرت خضر نے کشتی کا ایک تختہ اُکھاڑ کر اس میں سوراخ کردیا، موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر گھبرائے اور کہا: اے خضر! آپ تو احسان کا بدلہ نقصان سے دے رہے ہیں، بے وجہ لوگوں کا مال بھی برباد ہوگا، اور جانیں بھی تلف ہوں گی۔ آپ کا یہ عمل نہ شرعاً روا ہے نہ اخلاقاً، یہ بہت ہی معیوب کام ہے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو سفر سے پہلے کا عہد وپیمان یاد دلایا، تو حضرت موسیٰ نے فرمایا: مجھ سے بھول ہوگئی، بھول پر آپ میری گرفت نہ کریں۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

فانطلقا : فا حرفِ عطف، انطلقا فعل ماضی تثنیہ مذکر غائب، مصدر اِنطلاقٌ از بابِ انفعال؛ چھوڑ کر چل کھڑا ہونا۔

حتی : اس کے دو فائدے ہیں:

(١) برائے غایتِ انطلاق؛ یعنی وہ دونوں چلے یہاں تک کشتی میں سوار ہوگئے۔

(۲) برائے ابتدا؛ اس صورت میں کلام میں ایجاز واختصار ہوگا؛ اصل کلام یہ ہوگا: **حتی استأجرا سفینة فرکباها فلما رکبا في السفینة خرقها** . یہاں تک کہ دونوں نے ایک کشتی کرایہ پر لیں، اس میں سوار ہوئے، اور سوار ہونے کے بعد کشتی کو نقصان پہنچایا۔

السفینة : تعریفِ عہدِ ذہنی ہے۔ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول: ﴿**وأخاف أن یأکله الذئب**﴾ (سورة یوسف : ۱۳)

أخرقتها : أ ہمزہ استفہامِ انکاری، محلِ انکار وہ علت ہے جو ﴿**لتغرق اهلها**﴾ میں بیان ہوئی۔

خرقتَ فعل ماضی واحد مذکر حاضر، ها ضمیر مفعول، مصدر خرقٌ از بابِ ضرب؛ پھاڑ ڈالنا، بغیر سوچے سمجھے بگاڑنے کے لیے کسی چیز کی قطع وبرید کرنا۔ (خرق یہ خلق کی ضد ہے، اس لیے کہ خلق کا معنی ہے کسی چیز کا اندازے کے مطابق نرمی وسہولت کے ساتھ انجام دینا، اور خرق کا معنی ہے بغیر اندازے کے کرڈالنا)۔

لتغرق : مضارع منصوب بلامِ کَيْ ، واحد مذکر حاضر، مصدر إغراقٌ از بابِ افعال ڈبودینا۔

إمرًا : انوکھا، قابلِ انکار، بھاری، عجیب۔

ألم أقل : أ ہمزہ استفہام تقریری وتعریضی ہے، کہ وعدہ وفا نہ کیا جس کا التزام کیا تھا، اس پر ملامت کی جارہی ہے۔

لا تؤاخذني : فعل نہی واحد مذکر حاضر، ن وقایہ کا ي ضمیر مفعول۔ مصدر مؤاخذةٌ از بابِ مفاعلةٌ گناہ وغلطی پر پکڑنا، گرفت کرنا۔

لا تُرهقني : فعل نہی واحد مذکر حاضر، ن وقایہ کا ي ضمیر مفعول۔ مصدر إرهاقٌ از بابِ افعال، زبردستی چھاجانا، دُشواری میں ڈالنا۔

مِن أمري : مِن ابتدائیہ یا بیانیہ ہے۔

عُسرًا : سختی، تنگی۔ کہا جاتا ہے: **لا تُرهقني لا أرهقک الله** . تم مجھ پر سختی نہ کرو، تم پر اللہ سختی نہ کرے گا۔

☆...... اعراب ......☆

ولا ترهقني من امري عُسرًا . محلاً منصوب ہے، اور جملہ **لا تؤاخذني** پر عطف ہے۔

☆......بلاغت......☆

﴿**لا ترهقني**﴾ **الإرهاق : مستعارٌ للمعاملة والمقابلة** . لفظ إرهاق معاملہ ومقابلہ کے لیے مستعار ہے۔

﴿**لاتؤاخذني بما نسیت**﴾ میں توریہ ہے۔

توریه: یہ ہے کہ متکلم ایک ایسا لفظ استعمال کرے جس کے دو معنی ہوں، ایک قریبی معنی؛ یعنی مشہور معنی جو لفظ سے بہت جلد سمجھ میں آنے والا ہو، اور دوسرا بعیدی (قلیل الاستعمال)، اور متکلم کسی مخفی قرینے کی وجہ سے اسی معنی کو مراد لے رہا ہو۔

توریہ مجاز اور کنایہ میں فرق:

(۱) توریہ میں قرینہ عموماً مخفی ہوتا ہے، جب کہ مجاز وکنایہ میں عموماً قرینہ ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) توریہ میں دونوں معانی لفظ ہی سے سمجھ میں آتے ہیں، ان میں کسی واسطے اور علاقے کی ضرورت نہیں ہوتی، جب کہ مجاز وکنایہ میں معنیٔ اصلی اور معنیٔ مجازی وکنائی کے درمیان علاقے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......انبیائے کرام سے بھی بھول ہوتی ہے، سورۂ طٰہٰ آیت نمبر: ۱۱۵ر میں حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے کی صراحت موجود ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی یا عصر کی نماز پانچ رکعتیں پڑھا دیں، اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اور

نماز کے بعد ارشاد فرمایا کہ: ''ایک انسان ہوں، جس طرح آپ لوگوں کو یاد رہتا ہے، مجھے بھی یاد رہتا ہے، اور جس طرح آپ لوگوں کو بھول پڑتی ہے، مجھے بھی بھول پڑتی ہے''۔

الغرض بھول ہو جانا، نہ کمالِ نبوت کے منافی ہے، نہ کارِ نبوت کے۔

☆......عالمِ شریعت کے لیے جائز نہیں کہ خلافِ شرع اُمور پر صبر کرے۔

☆......طالبِ علم و متعلم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے، تو فوراً استاذ کے سامنے اپنے فعلِ نسیان پر عذر و معذرت کر لینی چاہیے، اپنی بات پر اَڑے رہنا مناسب نہیں۔

☆......عذرِ معقول پر عفو و درگزر کر دینی چاہیے، اور عذرِ غیر معقول پر سزا، تادیبی کارروائی کی جا سکتی ہے۔

☆......﴿**لا تؤاخذني**﴾ میں صیغۂ نہی برائے تعطُّف والتماس ہے، کہ برائے مہربانی میرا مؤاخذہ نہ فرمائیں، اس لیے کہ نسیان پر مؤاخذہ مصاحبت و استفادہ کے منافی ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام تعلیمی و علمی سفر پر روانہ ہوئے، تو ﴿**فانطلقا**﴾ تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا، تو حضرت موسیٰ کے رفیق و خادمِ خاص یوشع بن نون اُن کے ساتھ تھے یا نہیں؟ اگر تھے، تو پھر صیغۂ جمع ﴿**فانطلقوا**﴾ کا استعمال کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: اس میں چند احتمالات ہیں:

(۱) ظاہر تو یہی ہے کہ یوشع بن نون بھی آپ کے ساتھ تھے، کیوں کہ وہ حضرت موسیٰ کے تابع تھے، اس لیے اصل متبوع؛ یعنی موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر دیا، اور تابع (یوشع بن نون) کا ذکر چھوڑ دیا۔ اور قاعدۂ فقہیہ بھی ہے: '' **التابع تابع لا یفرد بالحکم** '' .

(۲) علامہ قشیری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر کی ملاقات کے بعد حضرت یوشع کو واپس روانہ کر دیا تھا۔ واللہ اعلم!

(۳) یہ بھی اِمکان ہے کہ مجمع البحرین پر ٹھہرا دیا ہو، تاکہ واپسی میں ساتھ لے لیں۔ البتہ مفسرین کرام عام طور پر پہلا احتمال مراد لیتے ہیں۔

سوال: ﴿**حتی اذا رکبا في السفينة خرقها**﴾ میں جزا خرقها کو بغیر فا کے، اور ﴿**حتی اذا لقيا غلاما فقتله**﴾ میں قتلہ کو فا کے ساتھ کیوں لایا گیا؟

جواب: ﴿**خرقها**﴾ مکمل جزائے شرط ہے، لہٰذا اس میں فا لانے کی ضرورت نہیں، اور ﴿**قتله**﴾ جزا نہیں، بلکہ شرط کا جز ہے، لہٰذا پہلے جز پر عطف کرنے کے لیے فا عاطفہ لائی گئی، اور شرط کی جزا ﴿**قال اَقتلت**﴾ ہے۔

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا کہ میں کچھ کہوں گا نہیں، صبر کروں گا، پھر کیوں صبر نہ کیا، اور وعدہ بھول کر حضرت خضر کو روک ٹوک فرمائی؟

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا، اس لیے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلافِ شرع نہیں ہوگا، گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے، اس لیے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالمِ دین کے لیے جائز نہیں، لیکن پھر شریعت کے بارے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت موسیٰ وخضر کے سفر کا دوسرا مرحلہ

آیت : ٧٤ ، ٧٥ ، ٧٦ :

﴿**فانطلقا حتی اذا لقیا غلمًا فقتله قال اقتلت نفسًا زکیَّةً بغیر نفس لقد جئت شیئًا نُّکرًاO قال الم اقل لک انک لن تستطیع معي صبرًاO قال ان سألتک عن شيء بعدها فلا تصٰحبني قد بلغت من لدني عذرًاO**﴾ .

ربط : حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام نے کشتی سے اُتر کر خشکی کی راہ لی، اور ایک گاؤں کے قریب پہنچے، تو چند لڑکے کھیل رہے تھے، ان میں سے ایک کو جو زیادہ خوب صورت اور سیانا تھا، پکڑ کر مار ڈالا، حضرت موسیٰ بولے اب تو آپ نے غضب ہی کر دیا، کشتی کے نقصان کا تدارک تو ممکن ہے، مگر یہ تو جان کا معاملہ ہے، اس کی تلافی کی تو کوئی صورت نہیں۔ حضرت خضر نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے، حضرت موسیٰ کو اندازہ ہوگیا کہ اس قسم کے تحیُّر خیز واقعات پر صبر کرنا اور خاموشی کے ساتھ اُن کو دیکھتے رہنا بہت ٹیڑھی کھیر ہے، اس لیے آخری بات کہہ دی، خیر اب تو جانے دیجئے، اس کے بعد اگر کچھ کہوں تو آپ مجھے اپنے سے جدا کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

☆......مفرادتِ لغویہ......☆

غلامًا : حالتِ نصبی میں لقیا کا مفعول ہے۔ غلام واحد ہے، جمع غِلمانٌ وغِلمةٌ وأغلِمةٌ آتی ہے۔ اس کے مختلف معنی ہیں؛

(١) نوجوان لڑکا جس کی مونچھیں نکل آئی ہوں۔

(٢) پیدائش سے جوان ہونے تک کی عمر کا لڑکا۔

(٣) مجازاً أمرد کو بھی کہتے ہیں۔

(٤) خادم، نوکر۔ یہاں پہلا معنی مراد ہے۔

زکیة : صفت مشبہ واحد مؤنث، گناہوں سے پاک وصاف، مصدر زکاءٌ از باب نصر؛ درست ہونا، سنورنا، زیادہ ہونا۔ (مترادفات القرآن میں ''زکیہ'' کا معنی ہے: نفس کا اخلاقِ رذیلہ سے پاک ہونا اور صلاح یافتہ ہونا یا سنورنا)۔

نُکرًا : مصدر از باب سمع بمعنی مُنکرٌ؛ برا کام، بہت برا کام، بے جا حرکت، نامعقول، نا مرغوب۔ نَکُرًا ونُکُراً ؛ الأمر : ناواقف ہونا۔ نکِر الرجلَ : نہ پہچاننا۔

تستطیع : فعل مضارع صیغہ واحد مذکر حاضر از بابِ استِفعال، مصدر استطاعةٌ ؛ طاقت رکھنا قدرت رکھنا۔

فلا تصٰحبني : فا جزائیہ۔ لا تصاحب فعل نہی واحد مذکر حاضر۔ ن وقایہ کا ي ضمیر مفعول۔ مصدر مصاحبة ؛ از بابِ مفاعلة؛ کسی کی صحبت میں رہنا۔

قد بلغت : قد حرفِ تحقیق، **بلغت** : فعل ماضی واحد مذکر حاضر۔ مصدر بُلوغٌ ؛ از بابِ نصر، پہنچنا۔

عذرًا : واحد ہے، جمع أعذارٌ . معنی ہیں:

(١) حجت جس کی بنا پر عذر کیا جائے۔ وہ دلیل جس کے ذریعے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی مجبوری ظاہر کی جائے۔

(٢) حیلہ، بہانہ۔ (٣) غلبہ۔ (٤) بکارت۔

☆...... اعراب ......☆

لقد جئت شیئًا نُّکرًا . لام قسم (قسم مقدر)، قد حرفِ تحقیق، جئت فعل با فاعل، شیئًا مفعول بہ منصوب، نکرا شیئًا منصوب کی صفت۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿**بعدها**﴾ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں:

(١) **المسئلة** . یعنی اس سوال ومسئلہ کے بعد پھر کچھ پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھیں۔

(۲) الكرّة . اس مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ کچھ پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھیں۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿لقد جئت شيئًا نُكرًا﴾. ''نکر'' یعنی انسان اپنی جہالت وناواقفیت کی وجہ سے کسی چیز کو غلط سمجھے، حالانکہ وہ شے حقیقت میں صحیح ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ناواقف تھے، اس لیے نکیر فرمائی، جب کہ حضرت خضر علیہ السلام اپنے کام میں حق بجانب تھے۔ اسے ''النکر فی القرآن'' کہتے ہیں۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......ظاہراً کسی حرام چیز کے حلال ہونے، یا حلال کے حرام ہونے کا استثناء کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ استثنا بذریعہ وحی نبوت ہو، کسی ولی کا کشف والہام ایسا استثناء کرنے کے لیے ہرگز کافی نہیں۔ اسی لیے حضرت خضر کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا، ظاہرِ شریعت میں حرام تھا، لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کرکے مامور کیے گئے تھے۔ ان پر کسی غیر نبی کے کشف والہام کو قیاس کرکے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے، بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے۔

مثلاً: کوئی بے دین جاہل صوفی اپنے کسی مرید سے کسی فرض نماز کو معاف کردے، اور کہے کہ مجھے بذریعہ الہام وتکشُّف ایسا حکم ہوا وغیرہ۔

☆......قتلِ غلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک تنبیہ بھی تھی، کہ ایک ایسا ہی قتل آپ کے ہاتھوں سے بھی ہوا تھا، جب ایک قبطی ایک اسرائیلی شخص سے جھگڑ رہا تھا، تو موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو ایک مکا مارا جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا (اگرچہ یہ قتلِ خطا تھا)، پھر بھلا آپ خضر کے ہاتھوں قتل ہونے پر اعتراض کیسے کررہے ہو، قتلِ قبطی کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ﴿هذا من عمل الشيطٰن﴾ بھی فرمایا تھا، کہ یہ ایک شیطانی حرکت ہے، ارادہ تو ایک مظلوم کے ساتھ خیرخواہی وہمدردی کا تھا، مگر قتل ہوگیا، ایسے ہی خضر

نے بھی اس بچے کو اُس کے والدین اور خود اس کی خیرخواہی کے طور پر قتل کیا تھا۔ بہرحال اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کی تربیت اور تنبیہ مقصود تھی۔

☆......سوالات......☆

سوال: گزشتہ آیت میں السفينة معرفہ اور مذکورہ آیت میں غلامًا کو نکرہ کیوں استعمال کیا؟

جواب: تفاسیر کے مطابق جب حضرت خضر وموسیٰ علیہما السلام ساحل پر پہنچے، تو کوئی کشتی وہاں موجود نہ تھی، کچھ دیر بعد ایک کشتی گزرتی ہوئی نظر آئی، تو اہل کشتی کو آواز دی، تو انہوں نے حضرت خضر کو پہچان لیا، اور بغیر اجرت کے ان دونوں بزرگوں کو کشتی میں سوار کرلیا، اس لیے ''السفینۃ'' کو معرفہ استعمال کیا۔ اور رہا غلام، تو وہ بھی کوئی متعین ومعرف نہ تھا، بلکہ راستے میں مل گیا، اس لیے ''غلاما'' کو نکرہ استعمال کیا گیا۔

سوال: گزشتہ آیت ﴿حتى إذا ركبا في السفينة خرقها﴾ اور ﴿حتى اذا لقيا غلمًا فقتله﴾ کی تعبیر میں فرق کیوں؟ یعنی فقتله فا کے ساتھ، اور خرقها بغیر فا کے، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: خرقها یہ جزا وجوابِ شرط ہے، اور قتله جملۂ شرط، معطوف علیہ ہے، اس کی جزا وجوابِ شرط ﴿قال أقتلت نفسًا﴾ ہے۔ دونوں جملوں میں تعبیر کا اختلاف ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خرقِ سفینہ رکوب کے فوراً بعد نہیں، بلکہ اُترنے سے پہلے کا ہے، کہ کشتی سے اُترنے سے پہلے حضرت خضر علیہ السلام نے دو تختیاں نکال دی تھیں، اور قتلِ غلام یہ ملاقات کے فوراً بعد واقع ہوا، اس لیے فا تعقیب کے لیے لائی گئی ہے۔

امام ابوالحسن اخفش رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فقتله میں فا برائے تعلیل ہے، اس لیے کہ لقائے غلام، قتلِ غلام کی علت ہے۔

سوال: حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے کو کس طرح مارا؟

جواب: اس کی تفصیل مروی نہیں، کوئی کہتا ہے کہ سر اُکھاڑ دیا، کوئی لکھتا ہے کہ پتھر یا دیوار سے سر ٹکرا دیا، یا زمین پر چت لٹا کر چھری سے ذبح کر دیا۔ غرض لڑکے کی موت کا کوئی ظاہری سبب بھی بنا، جسے عام لوگوں نے دیکھا، اور درپردہ حضرت خضر علیہ السلام کا ہاتھ تھا، جسے موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا۔

سوال: آیت: ۷۲/ ﴿قال الم اقل انک﴾ اور آیت: ۷۵/ ﴿قال الم اقل لک انک﴾، میں فرق ہے، یعنی دوسری آیت میں "لک" کا اضافہ ہے، ایسا کیوں؟

جواب: اس مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خفگی بڑھ گئی ہے، اس لیے "لک" کا اضافہ کیا گیا ہے، اور موسیٰ علیہ السلام نے اس بار بھول کر نہیں ٹوکا، بلکہ عمداً نکیر فرمائی تھی۔

سوال: کشتی کے واقعہ میں ﴿الم اقل انک﴾ فرمایا، اور قتلِ غلام کے واقعہ میں ﴿الم اقل لک﴾ فرمایا، ایسا کیوں؟

جواب: دوسری مرتبہ وصیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے متنبہ کرنے کے لیے "انّ" تاکید کا کلمہ اختیار کیا گیا، اور بار بار بے صبری سے پوچھنے پر تنبیہ کے لیے ایسا کیا گیا۔

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدہ کے مطابق ظاہری امرِ منکر پر خاموش کیوں نہ رہے؟ جب کہ خاموش رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا!

جواب: احکامِ شریعت کی خلاف ورزی پر تحمّل جب عام صالحین سے نہیں ہوسکتا، تو موسیٰ علیہ السلام تو پیغمبر تھے، اُن کا کام ہی ہر قسم کی ظاہری و باطنی بدی کو روکنا اور نیکی کو پھیلانا تھا، بھلا اس امرِ منکر پر خاموش کیسے رہ سکتے تھے!

سوال: ﴿لقد جئت شیئًا اِمرًا﴾ اور ﴿لقد جئت شیئًا نکرا﴾ میں تعبیر بدلنے میں کیا حکمت ہے؟ جب کہ ظاہر امرِ منکر پر نکیر تو دونوں جگہ ہے!

جواب: (۱) "اِمرا" اور "نُکرا" دونوں ہم معنی ہیں، لہٰذا کوئی فرق نہیں۔

(۲) "الإمر" عجیب اور خوف ناک کام کو کہتے ہیں۔ خرقِ سفینہ قتلِ غلام سے اشد ہے، کہ قتلِ غلام میں ایک فرد کا قتل، اور خرقِ سفینہ میں بہت سوں کا قتل ہے، اس لیے إمرا کہا۔

(۳) بعض کے نزدیک "النکر" زیادہ عظمت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے قتلِ نفس پر نکیر کرتے ہوئے "نُکرا" کہا، اور خرقِ سفینہ پر نکیر کرتے ہوئے "إمرا" کی تعبیر اختیار کی گئی۔ نُکرًا بمقابلہ اِمرًا زیادہ قبیح ہے، کہ قتلِ غلام کا کوئی تدارُک نہیں ہوسکتا، جب کہ خرقِ سفینہ کا تدارُک یعنی سوراخ بند کرنا ممکن تھا۔

سوال: "نکر" اور "منکر" میں کیا فرق ہے؟

جواب: قرآن مجید میں دو لفظ "نکر" اور "منکر" استعمال ہوئے ہیں، جن کا مادۂ اصلیہ ایک ہی ہے۔ امام راغب اصفہانی "مفردات القرآن" میں لکھتے ہیں کہ "انکار" عرفان کی ضد ہے، اور یہ زبان سے انکار کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ منکر ایسے کام کو کہتے ہیں جو عقلِ سلیم کے نزدیک قبیح ہو۔ قرآن مجید میں "نکر" کا لفظ تین بار، جب کہ "منکر" کا لفظ سولہ (۱۶) بار آیا ہے۔

سوال: نجدہ حروری نامی خارجیہ عورت نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خط لکھا، اس میں حضرت خضر علیہ السلام کے قتلِ نابالغ پر اعتراض کیا، کہ رسول اللہ نے تو اس سے منع فرمایا ہے، پھر خضر نے کیسے قتل کیا؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا؟

جواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جواب میں لکھا کہ اگر بچے کے متعلق تمہیں وہ علم حاصل ہوجائے، جو موسیٰ علیہ السلام کے عالم (خضر علیہ السلام) کو حاصل ہوا تھا، تو تمہارے لیے بھی نابالغ کا قتل جائز ہوجائے گا۔ مطلب یہ کہ خضر کو بذریعہ وحی اس کا علم ہوا تھا، وہ اب کسی کو نہیں ہوسکتا، اور نبوت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت موسیٰ وخضر کے سفر کا تیسرا مرحلہ

آیت : ۷۷ ، ۷۸ :

﴿فانطلقا حتى اذا اتيا اهل قرية ن استطعما اهلها فابوا ان يضيّفوهما فوجدا فيها جدارًا يريد ان ينقضّ فاقامه قال لو شئت لتّخذتَ عليه اجرًاO قال هذا فراق بيني وبينک سانبئک بتأويل ما لم تستطع عليه صبرًاO﴾

ربط : پھر حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام آگے چلے، تو ایک بستی میں پہنچے، قدیم زمانہ میں جب کہ سرائے، ہوٹل، اور کھانے پینے کی دکانوں کا رواج نہ تھا، مسافر اپنا حق سمجھتے تھے کہ بستی والوں سے کھانا طلب کریں، اور بستی والے بھی ان کی مہمان داری اپنا فرض سمجھتے تھے، اور بڑی خوش دلی سے یہ فریضہ انجام دیتے تھے، مگر اس بستی کے لوگوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی، انہوں نے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام جیسے مقربین کی مہمانی سے انکار کر دیا۔ اور چلتے چلتے اس گاؤں میں ایک بڑی بھاری دیوار جو گرنے کے قریب تھی، اُسے سیدھی کر دیا، حضرت موسیٰ نے تنبیہ کی کہ ایسے تنگ دل، سنگ دل، بے مروت اور بخیل لوگوں پر، بجائے اُجرت لینے کے، اُن پر احسان کا معاملہ کر رہے ہو، جب انہوں نے مہمان نوازی نہ کی، تو مفت میں دیوار سیدھی کرنے کی کیا ضرورت تھی، اُجرت لے لیتے تو اُن کی تنبیہ بھی ہو جاتی؟!

اس کے بعد حسب وعدہ حضرت خضر نے کہا: آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیں، آپ کا نباہ میرے ساتھ نہیں ہو سکتا، لیکن جدا ہونے سے پہلے ان واقعات کے پوشیدہ اسرار کھول دوں گا، جن کو دیکھ کر آپ ضبط نہ کر سکے۔

☆......مفرادتِ لغویہ......☆

قرية : واحد، جمع قُری ، گاؤں۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿وتلک القری اهلکنٰهم لما ظلموا﴾ . (سورة الكهف : ۵۹)

111

استطعما : ماضی تثنیہ مذکر غائب از بابِ استفعال ، مصدر استطعامٌ : کسی سے کھانا کھلانے کی خواہش کرنا، کھانا طلب کرنا۔

فأبوا : فا جزائیہ، أبوا ماضی جمع مذکر غائب، مصدر إباءٌ ؛ از بابِ فتح وضرب، سختی سے انکار کرنا۔

أن يُضيِّفوهما : مضارع منصوب بأن، جمع مذکر غائب، هما ضمیر مفعول بہ۔ أن مصدریہ کے اعتبار سے ترجمہ ہوگا؛ ان دونوں کی مہمانی کرنے سے۔ مصدر تضييفٌ از بابِ تفعيل؛ ضیافت کرنا۔

جدارًا : واحد، جمع جُدر ؛ دیوار، زمین سے اونچی اور بلند ہو تو اُسے جدار ، اور احاطہ کیے ہو تو اسے حائط کہتے ہیں۔

أن ينقضّ : مضارع منصوب بأن ، واحد مذکر غائب، مصدر انقضاض از بابِ انفعال ؛ گر پڑنا۔ قضض مادّہ ہے، کہا جاتا ہے: قضضته فانقض؛ میں نے اسے گرایا تو وہ گر پڑا۔

ہدایت القرآن میں ہے: انقضّ از بابِ افعلّال ؛ گر پڑنا، ٹوٹ پڑنا۔

لتخذت : ل تاکید برائے جوابِ شرط۔ اتخذت فعل ماضی واحد مذکر حاضر، مصدر اتخاذ از بابِ افتعال، بمعنی: لینا، پکڑنا۔

أجرًا : واحد، جمع أُجورٌ ، ارشاد ہے: ﴿واٰتوهنّ اجورهن﴾ (سورة النساء : ۲۴) .

اُجر و جزا میں فرق: أجرٌ وأُجرةٌ کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد و پیمان یا تقریباً اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے، اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔

الجزاء ہر بدلہ کو کہتے ہیں، خواہ وہ کسی عہد کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے، اچھا ہو یا برا، دونوں پر بولا جاتا ہے۔

فراق : مصدر از بابِ مفاعلة ، ارشاد ہے:﴿وظن انه الفراق﴾ (سورة القيامة :٢٨) فراق ومفارقة کالفظ عام طور پر اجسام کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

هذا فراق : أي هذا الاعتراض والسؤال الثالث سبب الفراق .

سأنبئک : س مستقبل قریب کے لیے ہے، أنبئک مضارع واحد متکلم، ک ضمیر مفعول، مصدر تنبئةٌ از بابِ تفعیل بتلانا، ٹھرانا۔

☆...... اعراب ......☆

هذا فراق بيني وبينک . هذا مبتدا، فراق اس کی خبر، بيني مضاف اليه مجرور معطوف عليه، وبينک معطوف۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿عليه اجرًا﴾ یعنی علی فعل إقامة الجدار . اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿هذا فِراقُ بيني وبينک﴾ دراصل ﴿هذا فراقٌ بيني وبينک﴾ ہے، فِراقُ بغیر تنوین کے پڑھا گیا، اضافة المصدر إلى الظرف کے قبیل سے ہے۔

☆......﴿سانبئک بتأويل ما لم تستطع عليه صبرًا﴾ إضافة المصدر إلى المفعول به (مصدر کی اضافت مفعول بہ کی طرف کی گئی ہے)۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......حدیث شریف میں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ دیوار سیدھی ہوگئی۔ یہ خارقِ عادت امر ان کی کرامت تھی۔

☆......حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے عمداً

پوچھا، تاکہ وہاں سے رخصت ہوجائیں، یہ سمجھ لیا کہ یہ علم میرے ڈھب کا نہیں، حضرت موسیٰ کا علم وہ تھا جس کی خلقت پیروی کرے، تو اس کا بھلا ہو۔ حضرت خضر کا علم وہ تھا کہ دوسروں سے اس کی پیروی بن نہ آئے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿أهل قرية﴾ میں قرية سے کون سی بستی مراد ہے؟

جواب: قرية سے ''أنطاکیہ، أیلہ، أُبُلَّة بصرہ، ناصرہ یا طَنجہ مراد ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ صحتِ تعیینِ قریہ پر کوئی حتمی ویقینی بات کہنا مشکل ہے۔

أطلس الحديث النبوي میں ہے کہ راجح قول کے مطابق ''أیلہ'' شہر مراد ہے۔

☆......''أيله'' جسے آج ''مدينة العقبة '' کہا جاتا ہے۔ حجاز کا آخری کنارہ اور ملکِ شام کا اول کنارہ ہے، خلیج عقبہ (جو بحر قلزم [بحر احمر] کی ایک شاخ ہے) کے سرے پر واقع ہے۔

☆......أُبُلَّہَ بصرہ اُن چار علاقوں میں سے ہے، جن کو جنتِ ارضی کہا گیا ہے؛ وہ چار علاقے یہ ہیں: الصُّغد . الأبُلَّة . شعب بوّان . غُوطة دمشق .

سوال: قرآن پاک میں اُس بستی کا صراحۃً تذکرہ کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں اُس شہر یا بستی کا نام صراحۃً ذکر کردیتے، تو لوگ تا قیامت بخل کو اُس بستی وشہر کے لوگوں کی طرف منسوب کرتے، اس میں اُن کی فضیحت ورُسوائی ہوتی، اس لیے بغرضِ ستر وپوشیدگی صراحت نہیں کی گئی۔

سوال: ﴿استطعما اهلها﴾ فرمایا، ماقبل آیت میں أهل کا ذکر آیا، تو اس کو دوبارہ ذکر کرنے کے بجائے ضمیر لائی جاتی، جیسا کہ عام اصول ہے، تو ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کیوں لایا گیا؟ کہنا چاہیے تھا: ﴿استطعماهم﴾؟

جواب: أهل کو دوبارہ ذکر کرنا محض تاکید کے لیے ہے۔

سوال: فرمانِ الٰہی ﴿يريد ان ينقض﴾ میں چاہنے کو دیوار کی طرف کیوں منسوب کیا گیا؟ چاہنا، ارادہ کرنا تو ذی روح کا فعل ہے، نہ کہ جماد کا؟

جواب: دیوار کی طرف ارادے کی نسبت مجازاً ہے، جب کہ بالکل آخری حالت میں

دیکھا گویا آپ گر رہی ہے، تو گویا وہ گرنا چاہتی ہے۔ اہلِ عرب عقلاء کے افعال کو مالا یعقل کی طرف بطورِ مجاز منسوب کیا کرتے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے:

یرید الرمح صدر أبي براء ☆ ویعدل عن دماء بني عقیل

(نیزہ براکے سینے میں لگنا چاہتا ہے، اور بنوعقیل کے خون سے عدول کرتا ہے)

اور جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿ولما سکت عن موسی الغضب﴾ (جب موسیٰ کا جوشِ غضب ٹھنڈا ہوا)۔

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے جدا کیوں ہو گئے؟ جب کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ کاش موسیٰ اور صبر کرتے تو عجیب چیزیں ہمیں معلوم ہوتیں!؟

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ کے علوم کی کوئی حد نہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی علم دیا اور کسی کو کوئی علم دیا، اور اللہ کے بعضے بندے ملائکہ کی طرح ہیں جو کرتے ہیں وہ اللہ کے حکم سے کرتے ہیں، اور ان کے افعال کے اسرار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتے، خضر علیہ السلام کا علم اسی قسم کا تھا جو ملائکہ کو عطا ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کا علم اس قسم کا تھا جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عطا کیا، اور ان کو اپنا خلیفہ اور مسجودِ ملائک بنایا۔ واللہ اعلم!

سوال: حضرت خضر علیہ السلام نے پہلے اور دوسرے سوال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جدائی اختیار نہیں کی، تیسرے پر ہی کیوں جدا ہوئے؟

جواب: (۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ تین اعتراضات تک ساتھ رکھیں، اس کے بعد جدائی کا وعدہ کیا تھا، لہٰذا اس پر حضرت موسیٰ راضی تھے۔ (۲) پہلا اور دوسرا اعتراض تورُّع اور دینی صلاحیت کی بنا پر تھا، جب کہ تیسرا اعتراض اپنی خواہش یعنی کھانا طلب کرنے اور پیٹ کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے تھا، اس لیے اس کے بعد جدائی اختیار کی۔

پردہ اُٹھتا ہے!

پہلا تکوینی حکم اور اُس کی تاویل

آیت : ۷۹ : ﴿اما السفینة فکانت لمسٰکین یعملون في البحر فاردت ان اعیبها وکان ورآء هم ملك یأخذ کل سفینة غصبًاO﴾ .

ربط : خرقِ سفینہ یعنی کشتی کے تختے نکالنے کی حکمت حضرت خضر علیہ السلام نے یہ بتائی کہ وہ کشتی چند غریب و مسکین لوگوں کی تھی، اور وہ کشتی جدھر جارہی تھی اس طرف آگے ایک ظالم بادشاہ کی عمل داری شروع ہوتی تھی، جو ہر اچھی کشتی کو چھین لیتا تھا، اس لیے اگر میں اس کشتی میں سوراخ نہ کرتا، تو وہ بادشاہ اسے بھی پکڑ لیتا، اور ان غریبوں کے ہاتھ سے ذریعۂ معاش چلا جاتا، اب یہ لوگ اس کی مرمت تھوڑے میں کرالیں گے، اور نقصانِ عظیم سے بچ جائیں گے۔

گر خضر در بحر کشتی را شکست ☆ صد درستی در شکستِ خضر ہست

(اگر خضر نے سمندری سفر میں کشتی میں تخریب کی، تو یہ تخریب درحقیقت تعمیر ہی تھی)

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

السفینة : واحد، جمع سُفُن، ماخوذ از سَفْنٌ ؛ اس کے اصل معنی چوب اور چمڑا وغیرہ کو چھیلنے کے ہیں، اور سَفَنَ الریحُ الترابَ عن الأرض کے معنی ہیں؛ ہوا نے زمین سے مٹی کو گھس ڈالا۔ شاعر الطویل کہتا ہے: ؎

فجاء خفیًّا یَسْفِنُ الأرضَ صدره

''وہ زمین پر اپنا سینہ رگڑتے ہوئے پوشیدہ طور پر وہاں جا پہنچا''

اور چھیلنے کے معنی کے لحاظ سے کشتی کا نام سفینةٌ رکھا گیا ہے، کیوں کہ وہ بھی سطحِ آب کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ پھر مجازاً کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر آرام دہ سواری کو سفینةٌ کہا جانے لگا۔

لمسٰکین : ل حرفِ جر، مساکین جمع ہے مسکین کی۔ بے چارہ، جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

البحر : سمندر۔(۱)اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں بکثرت پانی جمع ہو۔

(۲)پھر جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہواُسے **بحر** کہا جاتا ہے، چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو **بحر** کہہ دیا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھوڑے پرسواری کے بعد فرمایا: " **وجدته بحرًا** "میں نے اسے سمندر یعنی تیز دوڑنے والا پایا۔

(۳)اسی طرح وسعتِ علمی کے اعتبار سے بھی **بحر** کہہ دیا جاتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے: **تبحَّر في كذا**: اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کرلی۔ **التبحُّر في العلم**؛ علم میں وسعت حاصل کرنا۔

أن أعيبها : مضارع منصوب بأن واحد متکلم۔ ھا ضمیر مفعول، مصدر عیبٌ از بابِ ضرب، عیب دار کرنا۔

ورآء هم : وراء کے معنی؛ آگے، پیچھے دونوں آتے ہیں، اصل میں مصدر ہے، اور اس کے معنی ہیں؛ آڑ، حد فاصل۔

ملک : واحد، جمع مُلوکٌ ؛ بادشاہ جو پبلک پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف انسانوں کے منتظم کے ساتھ خاص ہے، یہی وجہ ہے کہ **ملک الناس** تو کہا جاتا ہے، **ملک الأشياء** کہنا صحیح نہیں ہے۔

غصبًا : مصدر از بابِ ضرب، چھیننا۔ معنیٰ اسی ہے؛ جبر وظلم۔

☆...... اعراب ......☆

اما السفينة فكانت لمسٰكين .أما حرفِ شرط وتفصیل، فا شرطیہ، جملہ السفينة فكانت استینافیہ، لا محل لها من الإعراب۔لمسٰکین جار مجرور متعلق ہوا کانت کی خبر سے، علامتِ جر فتحہ بوجہ غیر منصرف۔

☆......بلاغت......☆

﴿**أما السفينة**﴾ . ﴿**وأما الغلام**﴾ . ﴿**وأما الجدار**﴾ میں لف ونشر مرتب ہے؛

کہ پہلے خرقِ سفینہ ہوا، تو اول اس کی حکمت بتائی، پھر قتلِ غلام ہوا تو اس کی حکمت، اور اس کے بعد اقامتِ جدار کی حکمت بیان کی گئی۔ اور کلام میں لف ونشر مرتب کا ہونا یہ محسناتِ بدیعیہ میں سے ہے۔

﴿**كل سفينة**﴾ میں حذف بالإیجاز ہے، اور وہ ایجاز، حذفِ صفت ہے، یعنی **كل سفينة صالحة**۔ لفظ **صالحة** صفت کو حذف کیا گیا، اس پر لفظ ﴿**أعيبها**﴾ کی دلالت وقرینہ موجود ہے۔

ایجاز حذف: وہ طریقۂ تعبیر ہے جس میں کسی جزوِ کلمہ، کلمہ، ایک جملہ یا زائد از جملہ عبارت کو حذف کر کے مقصود بیان کیا گیا ہو، جیسے **وسئل القرية** . (سورۂ یوسف:۸۲)

فائدہ: حذف خلافِ اصل ہے، لیکن اس کے فوائد بھی بے حد ہیں؛ لہٰذا کلامِ عرب میں بالخصوص کلامِ الٰہی میں حذف بکثرت ہیں۔

حذف کے فوائد :(۱)ایجاز واختصار۔ (۲)احتراز عن العبث۔

(۳)اس بات پر متنبہ کرنا کہ اہلِ زمانہ محذوف کو ذکر کرنے سے عاجز ہیں۔

(۴)محذوف کو ذکر کرنا یہ اصل مقصود کو فوت کرنے والا ہو۔

﴿**فأردت أن أعيبها**﴾ میں **تقديم وتاخير** ہے۔ یہ بتلانے کے لیے کہ فقط غصبِ سفینہ کا ہی خوف نہ تھا، بلکہ غصب کے ساتھ ساتھ مساکین کا بھی خوف تھا۔

﴿**فأردت أن أعيبها**﴾ (آیت :۷۹) ﴿**فأردنا**﴾(آیت :۸۱) ﴿**فأراد ربک**﴾ (آیت :۸۲) میں تعبیر کا فرق ہے، اس میں **تعلیمِ ادب** ہے۔ آیتِ اُولیٰ وثانیہ میں ظاہری شر کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی، اور آیتِ ثالثہ میں خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......بندوں کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ کسی کارِ خیر کی نسبت اللہ جل وعلا کی طرف، اور کارِ شر کی نسبت خود اپنی طرف کرنی چاہیے۔

دنیا میں کوئی بھی اچھا یا برا کام اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادے کے بغیر نہیں ہوتا، خیر وشر سب ان کی مخلوق ہیں، اور ان کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں۔ مگر ادب کا تقاضا یہ ہے کہ شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے، چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جب کشتی

توڑنے کا ذکر کیا، تو چوں کہ وہ کام بظاہر ایک عیب اور برائی تھا، اس لیے اس کے ارادے کی نسبت اپنی طرف کی۔

☆......اس سے یہ قاعدہ بھی معلوم ہوا کہ "الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" سخت ترین ضرر کو ہلکے ضرر سے دور کیا جائے گا۔

☆......سوالات......☆

سوال: مسکین اور فقیر میں کیا فرق ہے؟

جواب: **مسکین** اُس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور **فقیر** وہ شخص ہے جس کے پاس بقدر گذارہ نہ ہو۔ سورۃ البلد آیت: ۱۶/ میں ہے: ﴿أو مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾ (خاک نشیں مسکین یعنی جس کے پاس بچھونا تک نہ ہو، مٹی پر پڑا رہتا ہو)۔

سوال: اس آیت میں کشتی والوں کو کشتی کے باوجود "مسکین" کہا گیا ہے، ایسا کیوں؟

جواب: کشتی والوں کو یا تو ترس کھاتے ہوئے مسکین کہا گیا، علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " آية السفينة للترحُّم "۔ یا کشتی اُن کی ملک نہ ہوگی، بل کہ عاریت ہوگی۔ یا مالک کوئی اور ہوگا، اور یہ لوگ محنت مزدوری کرتے ہوں گے۔

سوال: آیت مذکورہ میں ﴿فاردتُّ﴾ واحد متکلم، اگلی آیت میں ﴿فاردنا﴾ جمع متکلم، اور ایک آیت میں ﴿فاراد﴾ واحد مذکر غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا، ایسا کیوں؟

جواب: (۱) پہلے واقعہ میں خرقِ سفینہ ظاہری شر تھا، اس لیے نسبت اپنی ذات کی طرف کی، اور واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا۔

(۲) اور دوسرے واقعہ میں قتلِ غلام؛ ظاہری شر، اور بدلے میں بہتر اولاد؛ باطنی خیر، دونوں مشترک تھے، اس لیے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا، تاکہ اس میں جتنا ظاہری شر ہے، وہ اپنی طرف، اور جو خیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو جائے۔

(۳) اور تیسرے واقعہ میں اقامتِ جدار (دیوار کھڑی کر کے یتیموں کا مال محفوظ کرنا) سراسر خیر ہی خیر تھا، اس لیے اس کی پوری نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی، اور واحد مذکر غائب کا صیغہ استعمال کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

دوسرا تکوینی حکم اور اُس کی تاویل

آیت: ۸۰، ۸۱:

﴿واما الغلٰم فكان ابواه مؤمنَين فخشِينا ان يرهقهما طغياناً وكفرًاO فاردنا ان يبدلهما ربهما خيرًا منه زكوة واقرب رُحمًاO﴾.

ربط: رہا لڑکا! تو اس کی سرشت وفطرت میں کفر وسرکشی تھی، والدین اس کے نیک اور صالح تھے، حضرت خضر علیہ السلام کو وحی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر، والدین کے لیے فتنہ بنے گا، والدین اپنی طبعی محبت کی وجہ سے بے دینی میں اس کا ساتھ دیں گے، اس لیے حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کا کام تمام کر دیا، اور لڑکے کا مارا جانا والدین کے حق میں رحمت اور اُن کے دین کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا، اور جو صدمہ ان کو پہنچا، حق تعالیٰ نے اس کی تلافی ایسی اولاد سے کر دی جو پاکیزگی میں مقتول لڑکے سے بہتر تھی، اور ماں باپ پر شفقت ومہربانی میں بڑھ کر تھی۔

☆......مفرادتِ لغویہ......☆

فخشينا: فا حرفِ عطف، خشينا فعل ماضی جمع متکلم، مصدر خشْيةٌ از بابِ سمع؛ ڈرنا۔ الخازن میں ہے: فخشينا أي فعلمنا ہمیں معلوم ہوا۔

أن يرهقهما: مضارع منصوب بأن واحد مذکر غائب، هما ضمیر مفعول۔ مصدر إرهاقٌ از بابِ افعال؛ نا قابلِ برداشت کام پر مجبور کرنا، کسی کے لیے کام میں دُشواری پیدا کرنا۔ تقدیرِ کلام یوں ہوگی: فخشينا أن يرهقهما طغيانا وكفرا لو بقي حيًّا.

طغيانًا: مصدر از بابِ سمع۔ ظلم، نافرمانی وسرکشی میں حد سے تجاوز کرنا۔

خيرًا: الخيرُ وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو، مثلاً عقل، عدل وفضل اور تمام مفید چیزیں۔ یہ الشرُّ کی ضد ہے۔

زکوۃ : اس کے اصل معنی ہیں؛ نمو، افزونی جو برکتِ الٰہیہ سے حاصل ہو، اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اُخروی اُمور کے ساتھ بھی۔ کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے، کیوں کہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے، آیت میں زکوۃ کا مطلب ہے کہ آئندہ چل کر وہ لڑکا پاکیزہ اخلاق ہوگا۔

أقرب : اسم تفضیل از بابِ کرم یکرم ، قریب تر۔ زیادہ قریب ہونا۔

رُحمًا : مصدر از باب سمع، شفقت، مہربانی، رحِمه رحمةً ورُحمًا : مہربان ہوا، شفقت کیا۔ اس میں ایک لغت رَحِمًا بھی ہے، معنی ہے؛ عورت کا رحم۔ بطورِ استعارہ رحم کا لفظ قرابت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیوں کہ تمام اقرباء ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔

الرحمة : رحمت وہ رقتِ قلب جو مرحوم پر احسان کی مقتضی ہو۔

☆......بلاغت......☆

﴿وأما الغلام﴾ میں بھی حذف بالإیجاز ہے، لفظ کافر حذف کیا گیا، جس پر قولِ باری تعالیٰ ﴿فکان أبواه مؤمنین﴾ کی دلالت وقرینہ موجود ہے۔

﴿أبواه﴾ میں بطور تغلیب لفظ ﴿أب﴾ کا استعمال کیا گیا، مراد اَب واُم ہیں۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ میں ہمارے لیے جو سب سے بڑا سبق ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ٹھیک حکمتِ خداوندی کے مطابق ہو رہا ہے۔ ہر چیز خدا نے جس مقصد سے پیدا کی ہے وہ اس مقصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے، البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی کام انسان کی مصلحت سے ہم آہنگ نہ ہو، یا اس کے حق میں زیادہ بہتر نہ ہو، مگر مجموعۂ عالَم کے اعتبار سے وہ بھی خیر ہی ہوتا ہے۔ پس ظاہر بین نگاہیں دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتا دیکھتی ہیں، اس سے کبھی غلط نتیجہ اخذ کر لیتی ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے سامنے اللہ کی مصلحتیں نہیں ہوتیں، مثلاً: ظالموں کا پھلنا پھولنا اور

بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش کا ہونا، اور فرماں برداروں پر مصائب کا ہجوم ہونا، بدکاروں کا عیش اُڑانا اور نیکوکاروں کا خستہ حالی میں بسر کرنا؛ یہ سب وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور جو لوگ حقیقتِ حال سے واقف نہیں، وہ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی معاملات میں غور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ذریعے کارخانۂ قدرت پر سے پردہ ہٹا کر، ہم کو ایک جھلک دکھائی ہے، تاکہ ہم جان لیں کہ یہاں شب وروز جو کچھ ہو رہا ہے، وہ عین حکمت ومصلحت کے مطابق ہو رہا ہے، اگرچہ ہماری کوتاہ نظریں اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکیں، مگر ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ باغباں باغ کی مصلحت ملحوظ رکھ کر ہی کام کر رہا ہے۔

☆......لڑکے کے والدین کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام نے احسان کا معاملہ فرمایا تھا، وہ یہ کہ لڑکا ان کے لیے مستقبل میں فتنہ بننے والا تھا، اگر وہ زندہ رہتا، تو ان کو سرکشی وکفر تک پہنچا دیتا، انہوں نے سوچا کہ گھڑی بھر کا رونا، زندگی بھر کے رونے، اور مرنے کے بعد رونے سے بہتر ہے، لڑکے کا بدل ممکن ہے، لیکن ایمان اور حسنِ خاتمہ کا بدل ممکن نہیں۔

☆......عمل کی پاکیزگی زندگی میں بھی نفع پہنچاتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی، جب اللہ تعالیٰ ایک صالح مرد کی اولاد کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتا، تو خود مردِ صالح کو کیوں ضائع کرے گا، اور بے یار ومددگار چھوڑے گا۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿فخشِینا﴾ یہ لفظ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کی طرف؟

جواب: دونوں احتمال ہیں: یعنی حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب کیا جاسکتا ہے۔

سوال: ﴿فخشِینا﴾ یہ لفظ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، تو اعتراض وارد ہوتا ہے

کہ خوف کا اطلاق مخلوق پر ہوسکتا ہے، اللہ پاک تو ڈر و خوف سے پاک ہیں؟

جواب: (۱) مفسرین کرام خشیت کا اطلاق ''علم'' پر کرتے ہیں، کیوں کہ علم کا نتیجہ ہی خشیت ہوتا ہے، اس لحاظ سے خشینا کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم جانتے تھے کہ یہ بچہ جوان ہوکر والدین کو سرکشی میں ڈال دے گا۔

(۲) امام ابن جریر طبری اور صاحب مجمع البحرین کہتے ہیں کہ: فخشینا بمعنی فکرہنا ہے، یعنی ہم نے اس بات کو ناپسند کیا کہ یہ بچہ بڑا ہوکر اپنے ماں باپ کو سرکشی میں مبتلا کردے، لہٰذا ہم نے اُس کی بجائے مومن بچہ عطا کرنے کا فیصلہ کیا۔

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ ''**كل مولود يولد على الفطرة**''، پھر اس معصوم بچہ کو کیوں قتل کیا گیا؟

جواب: ہر بچہ ابتداءً اگرچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، مگر بعض مرتبہ خارجی اثرات کی وجہ سے بعض آدمیوں کی شروع ہی سے بنیاد بُری پڑ جاتی ہے، مگر اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہوتا۔ اس لڑکے کی بابت اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو آگاہ کردیا کہ اس بچہ کی اُفتاد اور بنیاد بُری ہے، بڑا ہوکر خود بھی گم راہ ہوگا، اور ماں باپ کو بھی گم راہی میں مبتلا کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے والدین کی حفاظت مقصود تھی، اس لیے اُن کی راہ سے اس روڑہ کو نکال دیا گیا، اور حضرت خضر علیہ السلام کا اس لڑکے کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی وحی سے تھا۔

سوال: کیا اُس مقتول بچہ کے والدین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے نعم البدل عطا فرمایا تھا؟

جواب: کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نیک لڑکی دی، جو ایک نبی سے منسوب ہوئی، اور ایک نبی اس سے پیدا ہوئے، یا ستر انبیاء اس نسل میں پیدا ہوئے، جن سے مستقل ایک اُمت چلی۔ اور ایک روایت کے مطابق ایک نیک صالح مومن لڑکا عطا کیا گیا۔ **كما في تفسير النسفي : روي أنه وُلدت لهما جارية تزوّجها نبي ،**

فولدت نبيًّا ، أو سبعين نبيًّا . أو : أبدلهما ابنًا مؤمنًا مثلهما .

سوال: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ) جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ لڑکا بڑا ہوکر کافر ہوگا، اور ماں باپ کو بھی گم راہ کرے گا، تو پھر علمِ الٰہی کے مطابق ہونا ضروری تھا، کیوں کہ علمِ الٰہی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہوسکتی، پھر وہ مارا کیسے گیا؟ اور اللہ کا علم غلط کیسے ہوگیا؟ (نعوذ باللہ!)

جواب: اصل جواب سے پہلے چند چیزوں کا سمجھنا ضروری ہے:

(۱) علم معلوم کے تابع ہوتا ہے، اس کا برعکس نہیں ہوتا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا علم حضوری ہے، یعنی وہ وجودِ معلوم کا محتاج نہیں، ازل سے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں۔ اور مخلوقات کا علم کسبی ہے، وہ وجودِ معلومات کا محتاج ہے۔

(۳) مسئلۂ تقدیر کا حاصل یہ ہے کہ بندے پیدا ہوکر جو اچھے یا برے کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ازل سے جانتے ہیں، اور جانتے ہی نہیں، سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھ بھی رکھا ہے۔

اب سوال کا جواب یہ دیا جائے گا کہ...... اللہ تعالیٰ ازل میں صرف یہی نہیں جانتے کہ وہ لڑکا بڑا ہوکر ضرور کافر ہوگا، اور اس کے والدین اس کے فتنہ میں مبتلا ہوں گے، بلکہ علمِ الٰہی میں پوری تفصیل ہے کہ اگر وہ لڑکا بڑا ہوتا، تو کافر ہوتا، اور اس کے والدین کے لیے فتنہ بنتا، مگر وہ بلوغ سے پہلے بچپن ہی میں مرجائے گا، یا مار دیا جائے گا، اس لیے وہ نہ کافر ہوگا، نہ اپنے والدین کے لیے فتنہ ہوگا۔...... پس اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف نہیں ہوا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وہی جانتے ہیں جو ہونے والا ہے۔ اور اللہ کا علم غلط بھی نہیں ہے۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس کے ماں باپ ایمان پر قائم رہیں، اور اس وجہ سے حکمت مقتضی ہوئی کہ پیش آنے والی رُکاوٹ دور کردی جائے، چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کو بھیج کر اس کو قتل کرادیا، پس اس سے بہتر تو یہ تھا کہ اس لڑکے کو پیدا ہی نہ کرتے، یا کرتے تو اس کو اس قدر شریر نہ ہونے دیتے، یا جہاں لاکھوں کافر دنیا میں موجود ہیں، اس کے والدین کو بھی کافر ہوجانے دیتے؟!

جواب: (۱) اہل سنت والجماعت کے ہاں ان تمام سوالوں کا سہل اور بے غبار جواب ہے: ﴿**لا يسئل عما يفعل وهم يسئلون**﴾ اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ کے ذریعے نظامِ

کائنات کو چلا رہا ہے، وہ شہنشاہِ کائنات ہے، وہی بہتر جانتا ہے، کسی بندے کو اس کے احکام کے سامنے دم مارنے یا حکمتیں تلاش کرنے یا معلوم کرنے کا کوئی حق نہیں۔

(۲) تکوینیات کے بارے میں انسان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اس سے تو پردہ اٹھایا کہ اس لڑکے کو مار ڈالنے میں یہ حکمت تھی، مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ اس کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ مثلاً: انسان کے بدن میں کئی جگہ بال اُگتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان کو صاف کیا جائے، اور یہ نظافت کا تقاضا ہے، مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کا کاٹنا ضروری ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا ہی کیوں کیا؟ جواب یہ ہے کہ اس کی حکمت اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ہم صرف اِجمالاً یہ بات جانتے ہیں کہ ان بالوں کو پیدا کرنے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ اسی طرح اس لڑکے کو پیدا کرنے میں بھی کوئی حکمت ہے، جو ہم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بھی اس رازِ سربستہ کو نہیں کھولا، اس لیے عقلِ انسانی کے لیے بجز اعترافِ عجز وقصور کے کوئی راہ نہیں، ہمیں تو بس یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جو چیزیں؛ مہلک، خراب اور بُری سمجھی جاتی ہیں، ان میں بھی مجموعۂ عالَم کے اعتبار سے خیر اور بے شمار فائدے ہیں۔

(۳) صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ " أما الغلام فطُبع كافرًا "۔ اس بچے کی استعداد وصلاحیت اس قسم کی تھی کہ وہ بڑا ہو کر کافر ہی ہوتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت میں بچے کی بہتری اسی میں تھی کہ بچے کو مکلّف ہونے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے، تاکہ یہ کفر وشرک کی سزا سے بچ جائے، اور ماں باپ کے حق میں بھی یہی بہتر تھا، کیوں کہ وہ بچے کے کفر کی وجہ سے خود بھی کفر میں پڑنے والے تھے، مگر اللہ نے انہیں بچالیا۔

سوال: معتزلہ کا یہ ضابطہ ونظریہ کہ " ما هو إلا صلح للعبد يجب على الله "، یعنی بندوں کے لیے جو چیز زیادہ مفید ہو، تو اللہ کے لیے وہ سب کچھ کرنا واجب ہے، کیسا ہے؟

جواب: یہ معتزلہ کا خود تراشیدہ ضابطہ ہے جو کہ ہر اعتبار سے ناقص ونا تمام ہے۔ اصولِ دین کے خلاف ہے، لہٰذا ہم اسے تسلیم ہی نہیں کرتے، اس نوعیت کی باتیں سراسر فساد ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا تکوینی حکم اور اُس کی تاویل

آیت : ۸۲ : ﴿واما الجدار فكان لغلٰمين يتيمَين في المدينة وكان تحته كنزٌ لهما وكان ابوهما صالحًا فاراد ربك ان يبلغا اشدهما ويستخرجا كنزهما رحمةً من ربك وما فعلته عن امري ذٰلك تاويل ما لم تسطع عليه صبرًاO﴾ .

ربط : حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اس دیوار کے نیچے سونے چاندی کا ذخیرہ تھا (ترمذی وحاکم)، جو ان کے باپ سے اُن کو میراث میں پہنچا تھا، اگر دیوار گر پڑتی تو یتیم بچوں کا جو مال وہاں گڑا ہوا تھا، ظاہر ہو جاتا، اور بدنیت لوگ اُٹھا لیتے، بچوں کا باپ چوں کہ نیک آدمی تھا، اس لیے اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کے مال کو اس کی اولاد کے لیے محفوظ رکھا، اور حضرت خضر کو بھیج کر دیوار درست کرادی۔ اور مال کی یہ حفاظت اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے تھی۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

كنز : واحد، جمع كنوزٌ آتی ہے۔

أن يبلغا : مضارع منصوب بأن تثنیہ مذکر غائب، مصدر بلوغ از بابِ نصر؛ پہنچنا۔ در اصل يبلغان تھا، أن کی وجہ سے نونِ اعرابی گر گیا۔

أشدّهما : مضاف مضاف الیہ، الأشَدّ والأشُدّ؛ سن بلوغ، جوانی کی عمر، پورا زور، کہا جاتا ہے: بلغ فلان أشده وہ سن بلوغ کو پہنچا۔ وہ جوانی کی عمر تک پہنچا۔ مادّہ شدد ہے۔

ويستخرجا : مضارع منصوب بأن تثنیہ مذکر غائب، مصدر استخراج از بابِ استفعال ؛ نکالنا۔ دراصل يستخرجان تھا، أن کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا۔

رحمةً من ربك : رحمة یا تو يبلغا کا اور يستخرجا کا مفعول لہ ہے، یا فعل محذوف فعلته کا مفعول بہ ہے۔

تاویل : مصدر از بابِ تفعیل؛ تاویل، مطلب۔ أول سے مشتق ہے، جس کے معنی چیز کے اصل کی طرف رجوع ہونے کے ہیں، اور جس مقام کی طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے اسے مَوئِل (جائے بازگشت) کہا جاتا ہے۔ پس تاویل کسی چیز کو اس غایت کی طرف لوٹانا کے ہیں جو اس سے بلحاظِ علم یا عمل کے مقصود ہوتی ہے۔

لم تسطع : مضارع نفی جحد بلم واحد مذکر حاضر، بمعنی ماضی منفی؛ تو صبر نہ کرسکا۔ **تسطع** دراصل **تسطیع** تھا، **لم** کے آنے کی وجہ سے لام کلمہ مجزوم ہوا، اور اجتماع ساکنین سے ي حرفِ علت گرگیا۔

فائدۃ : **استطاع یستطیع** میں جائز ہے کہ تائے استفعال حذف کردی جائے، قرآن مجید میں **فما اسطاعوا** اور **ما لم تسطع** اسی باب سے ہے)۔

☆...... اعراب ......☆

یستخرجا کنزهما رحمة من ربک .

یستخرجا مضارع منصوب **یبلغا** پر عطف بالواو، علامتِ نصب حذفِ نون، ضمیر الف فاعل، **رحمة** مفعول لہ منصوب، **أراد** اس کا عامل ہے۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿**ما فعلته**﴾ یعنی ؛ **فِعلَ الذي فعلته** . میں نے جو یہ کام کیا۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿**یرید أن ینقضّ**﴾ میں استعارہ ہے، اس لیے کہ لفظ ''ارادہ'' عقلاء کی صفت ہے، اس کی نسبت غیر عاقل جدار (دیوار) کی طرف کی گئی، یہ لطیف استعارہ اور مجازِ بلیغ ہے، شاعر کا قول ہے:

یرید الرمحُ صدر أبي براءٍ ☆ ویرغب عن دماء بني عقیل

☆......پیغام واحکام......☆

☆......علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: معجزاتِ انبیاء اور کراماتِ اولیاء ثابت ہیں، اخبار وآیاتِ متواترہ اس پر دال ہیں، کرامات کا انکار نرا مبتدع، منکر، یا دین سے کنارہ کش فاسق ہی کرسکتا ہے، حضرت مریم علیہا السلام کے حق میں آیاتِ قرآنیہ میں خبر مذکور ہے کہ موسمِ سرما کے پھل موسمِ گرما میں، اور اس کے برعکس پھل دیئے گئے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد آپ نے کھجور کا خشک و بے پھل درخت ہلایا، تو اس پر پھل آگیا، حالاں کہ آپ نبیہ نہیں تھیں، ایک عام نیک وصالح خاتون تھیں۔ اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ پر خرقِ سفینہ، قتلِ غلام، اور اقامتِ جدار والی کرامات ظاہر کی گئیں۔

☆......اشدّ کی ایک منزل تو بلوغت ہے، جب آدمی ذرا سیانا ہوکر شرعی طور پر مکلّف ہوجاتا ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پچیس (۲۵) سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد یتیم کا مال اُس کے سپرد کردینا چاہیے، خواہ وہ بے سمجھ ہی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ چالیس (۴۰) سال کی عمر تک انتظار کرنا چاہیے، کیوں کہ انسان کو عقل اور قوت اس عمر میں جاکر حاصل ہوتی ہے۔

☆......سونا چاندی زمین میں پیدائشی طور پر پایا جائے، یا بعد میں دفن کیا گیا ہو، کنز ہی کہلاتا ہے، پھر جب وہ برآمد ہوجائے، تو اس پر زکوۃ کا خاص حکم لاگو ہوتا ہے، جسے ''خُمس'' (پانچواں حصہ) کہا جاتا ہے، یعنی کل مال کے چار حصے خزانے کے مالک کے ہوں گے، اور پانچواں حصہ بطورِ زکوۃ ادا کیا جائے گا۔

☆......اللہ پاک نے یتیم بچوں کے خزانہ کی حفاظت کا بندوبست اُن کے باپ کی نیکی کی صلہ میں کیا، یہی قانون ہمارے لیے بھی نافذ العمل ہے، اگر کوئی نیک آدمی ہو، تو اس کی اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ نیک آدمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس کے اہلِ خاندان بلکہ اِردگرد کے رہنے والے لوگوں کی بھی حفاظت کرتا ہے، ایک

خارجی اور حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی کسی موقع پر گفت وشنید ہوگئی، حضرت حسن نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن یتیم بچوں کے مال کی حفاظت کیوں کی؟ تو خارجی نے جواب دیا کہ اُن کے باپ کی نیکی کی وجہ سے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اُن یتیموں کے والدین کی نسبت میرے والدین نیکی میں بڑھے ہوئے ہیں، پھر تم اُن کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟ اور ہمارا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ اُس شخص سے کچھ جواب نہ بن پڑا، تو کہنے لگا: تم خاندانِ قریش کے لوگ بڑے جھگڑالو واقع ہوئے ہو۔

☆......سوالات......☆

سوال: حضرت خضر علیہ السلام نے مرمتِ دیوار کی اُجرت کیوں نہیں لی، حالاں کہ اجرت کا استحقاق تھا؟

جواب: حضرت خضر علیہ السلام کا دیوار کو سیدھا کرنا امرِ خداوندی تھا، اور جو کام خدا کے حکم سے کرنا ضروری ہو، اس پر مزدوری لینا جائز نہیں، یہیں سے یہ ضابطہ بنا ہے کہ ''طاعاتِ مقصودہ پر اِجارہ باطل ہے''۔

سوال: ''طاعاتِ مقصودہ'' پر اِجارہ کا شرعی حکم فی زمانہ کیا ہے؟

جواب: طاعاتِ مقصودہ یعنی؛ اذان، اقامت، امامت، تعلیمِ قرآن، حج عن الغیر (حج بدل) وغیرہ پر اُجرت لینا متقدمین حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن متأخرین حنفیہ نے حج عن الغیر کے سوا دیگر اُمور پر اُجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔

سوال: ''طاعاتِ مقصودہ'' سے متعلق متقدمین ومتأخرین میں وجہ اختلاف کیا ہے؟

جواب: (۱) چوں کہ دورِ متقدمین میں ان اعمال کو سرانجام دینے والوں کے لیے بیت المال سے عطیات مقرر ہوتے تھے، جس سے وہ امر معاش سے فارغ البال ہوکر، اُن کی انجام دہی میں منہمک رہتے تھے، جب کہ اس طرح کا اب کوئی انتظام نہیں رہا، اور ساتھ ہی امورِ دینیہ میں بھی کسل وسُستی واقع ہوگئی ہے، لہٰذا اس موقع پر ان امور پر اجرت کے عدمِ

جواز کا قول ان کے اور شعائرِ دین کے اندراس وتضییع کا باعث ہے، اس لیے ضرورۃً اس میں جواز کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے، **كما في مذهب الشافعي رحمه الله** ۔

(۲) نیز واضح رہے کہ اس ضرورت کا مَبنیٰ اختلافِ زمان ہے کہ بسا اوقات اختلافِ زمان کا اثر اختلافِ حکم پر بھی مرتب ہوتا ہے، جس کی نظیر یہ ہے کہ عورتیں شروع زمانہ میں، یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں باجماعت نماز کے لیے مساجد میں شریک ہوا کرتی تھیں، پھر زمانہ بدل جانے پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور میں ان کو اس سے منع فرمادیا تھا۔

سوال: کنز سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس سلسلے میں تین قول ہیں:

(۱) سونے کی ایک تختی تھی جس پر نصیحت کے کچھ جملے لکھے ہوئے تھے۔

(۲) صحیفے تھے جن میں علمِ شریعت تھا۔

(۳) سونا چاندی مدفون تھا۔ یہ قول اظہر وصحیح ہے۔

سوال: بعض گمراہ لوگ ''تفضیلِ ولی علی النبی'' کے قائل ہیں، استدلال میں آیاتِ مذکورہ پیش کرتے ہیں، کہ موسیٰ پیغمبر تھے، پھر بھی آپ نے خضر سے علم حاصل کیا، جو کہ ولی ہیں، ان گمراہ لوگوں کے اس نظریہ کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: (۱) خضر علیہ السلام ولی نہیں، بلکہ نبی ہیں۔ نبی ولی سے افضل ہی ہوتا ہے۔

(۲) اور اگر بعض لوگوں کے زعم کے مطابق خضر کو ولی مان بھی لیں، تو یہ موسیٰ علیہ السلام کے حق میں ابتلا وآزمائش ہوگی، اور اہلِ کتاب کا ردّ بھی ہے کہ وہ موسیٰ سے ''موسیٰ بن عمران'' نہیں، بلکہ ''موسیٰ بن مانان'' مراد لیتے تھے۔ واقعہ کے ذریعے یہ بتایا گیا کہ ولی اور نبی میں فرق ہے، اور تحصیلِ علم نبی کی شان کے خلاف نہیں، بلکہ زیادتیٔ علم مطلوب ومستحسن ہے۔

سوال: حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا خوارج سے مناظرہ ہوا، تو آپ نے

﴿وکان ابوھما صٰلحًا﴾ سے کیا استدلال فرمایا؟

جواب: جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خوارج سے مناظرہ ہوا، تو آپ نے ان سے کہا: اللہ پاک نے دونوں لڑکوں کی حفاظت کس کے سبب فرمائی؟ انہوں نے جواب دیا: اُن کے باپ کی صلاح و نیکی کے سبب، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو میرے باپ اور نانا اُس صالح شخص سے بھی بہتر ہیں، پھر تم کیوں اُن کی مخالفت کرتے ہو، اور ہمارا خیال نہیں رکھتے؟!

سوال: ﴿ما لم تستطع علیه صبرًا﴾ (سورة الكهف : ۷۸) اور ﴿ما لم تسطع علیه صبرًا﴾ (سورة الكهف : ۸۲)...... آیتِ اُولیٰ میں تا علی حالہ باقی ہے، اور آیتِ ثانیہ میں تا کو حذف کر دیا گیا، تو اس میں کیا لطیفہ ہے؟ اس تا کو کیا کہتے ہیں؟

جواب: لطیفہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تینوں کام (خرقِ سفینہ، قتلِ غلام، اقامتِ جدار) سمجھ سے بالاتر تھے، ان کی طبیعت پر بوجھ تھا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ اس لیے حضرت خضر کے کلام میں لفظ تستطع اپنی اصل کے مطابق بولا گیا، جب حضرت موسیٰ کو تفصیل معلوم ہوگئی، تو ان کا دل مطمئن ہوگیا، ان کی طبیعت سے بوجھ اُتر گیا، لہٰذا دوسری آیت میں تا کو حذف کر کے کلام کو آسان کر دیا گیا۔ یہ کلام کا اعجاز ہے کہ ثقلِ نفسی کے زوال کے ساتھ ظاہری مناسبت کی وجہ سے تا کو حذف کر کے کلام میں حسن پیدا کر دیا گیا۔ اس تا کو ''تائے خفت'' کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام سے ہمیں کیا سبق ملا؟

☆...... اِس دور میں سب سے بڑا بُت ''اَنا'' ہے، جس میں ہر فرد اور ہر قوم گرفتار ہے، عہدِ حاضر اسی ''اَنا'' کا عروج ہے، جب تک کوئی فرد کسی اپنے ساتھی کے سامنے جھکنے کی صلاحیت نہ پیدا کرے، یا کسی فردِ کامل کے سامنے ادب واحترام سے پیش آنے کو اپنی سعادت نہ سمجھے، ہرگز ایمانی اور اسلامی زندگی کا ذوق وشوق اس کو نصیب نہیں ہوسکتا، کیوں کہ سپردگی تحصیلِ شوق کا جزوِ اعظم ہے۔

روحانی ذوق وشوق کا عروج عبادت ہے، اس کا نزول عبدیت ہے، گویا انسان کی تمام صلاحیتیں صفاتِ الٰہیہ کے پَرتو سے فیض یاب ہوکر سماجی زندگی کی طرف لوٹتی ہیں، اصطلاحِ تصوف میں اس کو ''بقا باللہ'' کہتے ہیں، اور اصطلاحِ شرع میں عبدیت کا مقام یہی ہے، رسالت کا عرفان اسی منزل میں حاصل ہوسکتا ہے۔ إني عبده ورسوله کو صحیح معنوں میں یہیں پہچان سکتے ہیں۔

☆...... مطلقاً عالم، شیخ یا بزرگ کی ملاقات کے لیے جانا جائز ہے۔

☆...... شیخ عبدالعزیز دباغ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس مقام پر موسیٰ علیہ السلام کی مچھلی گم ہوئی اُس مقام پر اُن کا مطلوب حاصل ہوا، مچھلی پیٹ کا معاملہ تھا، تو جہاں پیٹ کا معاملہ ختم ہوا، وہاں معرفت حاصل ہوگئی۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کے ساتھ پیٹ کا دھندا غالب ہوگا، خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔

☆...... استاد اور شاگرد کے درمیان بعض شرائط پر تعلیم وتعلّم کا انتظام کرنا درست ہے، اُستاد کہے کہ میں اِن شرائط کے تحت پڑھاؤں گا، بہر حال ملاقات کے بعد ان دونوں صاحبان کے درمیان رفاقت اور تعلیم کی شرائط طے ہوگئیں، اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔

☆...... بقول بیضاوی رحمہ اللہ: اس قصہ سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کو اپنے

علم پر غرور نہ کرنا چاہیے، اور جو بات پسند نہ آئے اور صحیح نہ معلوم ہو، اس کے انکار میں عجلت نہ کرے، ممکن ہے اس کی تہہ میں ایک ایسی پوشیدہ حقیقت ہو جس سے یہ شخص ناواقف ہو۔ میں کہتا ہوں جس شخص کی بات کو صحیح نہ سمجھا جا رہا ہو، اگر وہ عالم ہو، دین دار ہو، اور متقی ہو، تب تو اس کے فعل کا فوری انکار کر دینا اور بھی نامناسب ہے، اس سے برابر سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ معلم کا ادب کیا جائے، گفتگو میں تہذیب رکھی جائے۔ قصوروار کو اس کے قصور پر متنبہ کرنا، اور پھر معاف کر دینا چاہیے، اور جب اس سے بار بار قصور سرزد ہو، تو اس سے جدائی اختیار کر لی جائے، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے اس قصہ سے ان تمام اُمور کی تعلیم مستفاد ہو رہی ہے۔

☆...... بقول مفکر اسلام علامہ علی میاں ندوی رحمہ اللہ: اس قصہ سے بہت عملی طریقہ پر اور بڑی واضح اور غیر معمولی شکل میں یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ اس دنیا کے معلومات ومکشوفات سے ماوراء اور بہت سی نامعلوم چیزیں بھی ہیں، اور جن چیزوں سے ایک انسان (خواہ وہ بہت بڑا عالم وباخبر ہو) ناواقف ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں، جو اس کے علم میں ہیں، وہ ہمیشہ اپنے مشاہدہ اور احساس پر رائے قائم کرتا ہے، اور اسی لیے اس سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں، اور ٹھوکریں لگتی ہیں، اگر زندگی کے حقائق اس پر آشکارا ہو جائیں، اور رُموز واَسرار اور باطنی معاملات کا اسے علم ہو جائے، تو اس کے نظریات بڑی حد تک بدل جائیں گے، اور خود اس کو اپنے بہت سے فیصلوں سے ہٹنا پڑے گا۔

☆...... اس کائنات کا احاطہ ناممکن ہے، اس لیے رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے میں عجلت اور اپنے احساسات وخیالات پر اِصرار درست نہیں، یہ زندگی بڑی مبہم، لپٹی ہوئی، اور تہہ در تہہ ہے، کائنات بڑی وسیع اور عظیم ہے، جگہ جگہ اس کا باطن ظاہر سے مختلف، اور آخر اول سے جدا ہے، اس زندگی میں اتنے بڑے بڑے معمے، چیستان اور پیچیدہ سوالات ہیں کہ انسان اپنی ساری ذہانت، علم اور جستجو وآرزو کے باوجود ان کو ابھی تک حل نہیں کر سکا، اس میں

بکثرت ایسی گرہیں، اور گتھیاں ہیں، جن کی عقدہ کشائی سے علم انسانی اپنی ساری وسعت اور ترقی کے باوجود عاجز ہے۔

☆...... روز مرہ کی عام زندگی پر نظر ڈالیے، تو وہ بھی فاش غلطیوں، عاجلانہ فیصلوں، جذباتی اور فوری اِقدامات اور برجستہ اور سرسری افکار وخیالات سے آلودہ نظر آئے گی، اگر اس وسیع وعظیم کائنات کا انتظام علمِ انسانی کے حوالہ کر دیا جائے، اور اس کو مکمل آزادی اور مکمل اختیار دے دیا جائے، تو وہ پوری دنیا میں فساد برپا کرے گا، اور نسل اور زراعت دونوں کی ہلاکت وبربادی کا باعث ہوگا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی نگاہ قاصر اور عمل محدود ہے، جلد بازی اس کے خمیر میں داخل اور بے صبری اس کی سرشت میں پیوست ہے۔ اسی عظیم اور اہم حقیقت کو ثابت وظاہر کرنے کے لیے (جو تمام مذاہب اور ایمان بالغیب کی بنیاد ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کی اس سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب فرمایا، جس کو نہ صرف علم بلکہ خیر وصلاح کا بھی بہت بڑا حصہ ملا تھا۔

☆...... حضرت خضر علیہ السلام بظاہر حقیقت اور واقعہ سے کتنے دور تھے، اور ان کا رویہ اعتدال وتوازُن سے کتنا مختلف تھا، لیکن انجام کار ان کی فہم ورائے کتنی درست اور مطابقِ حقیقت تھی، اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ زندگی رواں دواں ہے، اس کے پاس ہر زمانہ کے لیے نئے سامان اور نئے عجائبات ہیں، وہ ہر روز اپنے نئے راز کھولتی اور نئے اسرار ظاہر کرتی ہے، اس سے یہ بھی آشکارا ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، اور اس کا آخری کنارہ ہماری دست رس سے بہت دور ہے؛ ﴿وفوق کل ذي علمٍ علیم﴾ (اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والی ہستی ہے)۔

☆...... یہ قصہ اپنے ان مضامین ومعانی کے ساتھ جو اس میں وارد ہوئے، اس مادی فلسفہ کو چیلنج کرتا ہے، جس کا کہنا یہ ہے کہ زندگی بس وہی کچھ ہے، جو ہم نے سمجھا ہے، اور کائنات کا پورا علم ہم کو حاصل ہے، اور حقیقت صرف وہی ہے جو آنکھوں سے نظر آئے، زندگی اور

کائنات میں معیار صرف ''ظاہر'' ہے، اور اس پر بے خوف وخطر رائے قائم کی جاسکتی ہے، انسان اس کا حق دار ہے کہ اس دنیا کا انتظام اس کے حوالہ کیا جائے، قانون سازی کا حق اس کو حاصل ہو، اس لیے کہ علم، عقل اور مطالعہ وتحقیق ہر چیز میں وہ کامل ہے، اور حقیقت اور علم کی گہرائیوں اور کائنات کی حقیقتوں تک اس کی رسائی ہو چکی ہو۔ تمام مادی فلسفوں کی ہمیشہ یہی بنیاد اور جدید ومعاصر تمدن بھی اسی فکر وعقیدہ پر قائم ہے، سورۂ کہف (اپنے مضامین وآیات میں) عمومی طور پر اور حضرت خضر وموسیٰ علیہما السلام کا یہ قصہ خصوصی طور پر اس بنیاد پر تیشہ چلاتا ہے۔

☆......عجلت، انکار اور غلطی انسان کے مزاج میں ہے، لیکن بالآخر حقیقت سامنے آکر اپنی بالادستی اور جہانگیری تسلیم کرادیتی ہے۔

۱۲۳

قسمِ خامس (آیت ۸۳ تا ۹۸)

(٤) فتنۂ جاہ ومنصب (سیاست)

واقعۂ ذو القرنین

شاہ ذوالقرنین کا سفر نامۂ مغرب

تین واقعات میں تین اُصول وقوانین

(قانونِ استقلال، قانونِ صبر، قانونِ شکر)

آیت : ۸۳ ، ۸٤ ، ۸۵ ، ٨٦ ، ۸۷ ، ۸۸ :

﴿ویسئلونک عن ذي القرنین قل سأتلوا علیکم منه ذکرًاO انا مکنا له في الارض واتینٰه من کل شيء سبباO فأتبع سبباO حتی اذا بلغ مغرب الشمس وجدها تغرب في عین حمئة ووجد عندها قوما قلنا یٰذا القرنین اما ان تعذب واما ان تتخذ فیهم حُسناO قال اما من ظلم فسوف نعذبه ثم یرد الی ربه فیعذبه عذابا نکراO واما من اٰمن وعمل صالحًا فله جزاء ن الحسنیٰ وسنقول له من امرنا یُسرًاO﴾ .

ربط : قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام کے بعد فوراً قصۂ ذوالقرنین کا بیان فرمایا، جس میں اس کے تین رحلات واسفار کا ذکر ہے؛ سفر مغرب ومشرق، سفر بین السدین اور بنائے سدّ یاجوج وماجوج۔ سورۂ کہف میں بیان کردہ چار قصوں میں سے یہ چوتھا اور آخری قصہ ہے، عقیدہ وایمان کا بیان سب میں مقصود ہے، یہی ان کے مابین ربط بھی ہے، جوسورۂ کریمہ کا اصل ہدف ہے۔

الغرض! ذوالقرنین اپنے پہلے مغربی سفر میں ایک ایسی قوم کے لوگوں کے پاس پہنچے، جو سرکش، فسادی اور بدعقیدہ وبے ایمان اور کافر تھے۔ اللہ پاک نے ذوالقرنین کو اختیار دیا کہ اگر چاہو، تو اس کافرو سرکش قوم کو کفر کی پاداش میں سزادو اور چاہو تو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ ایسے نازک موقع پر ذوالقرنین نے بہترین فیصلہ لیا کہ ظلم وکفر اختیار کرنے والے کو سزادیں گے، اور مومنین صالحین کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ کریں گے۔

☆......پس منظر......☆

حضرت قتادہ کا قول ہے کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

قصۂ اصحابِ کہف، قصۂ موسیٰ وخضر اور قصۂ ذوالقرنین میں مناسبت:

قصۂ موسیٰ وخضر اور قصۂ ذوالقرنین میں مناسبت:

☆......ذوالقرنین ایک عادل اور نیک دل بادشاہ تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے مشرق سے مغرب تک کی حکمرانی اور فرماں روائی عطا کی تھی، اور رُوئے زمین کے تمام بادشاہ اس کے زیرفرمان تھے، ظاہر میں وہ بادشاہ تھا، مگر باطنی طور پر وہ اصحابِ کہف سے زیادہ فقیر اور درویش تھا، بادشاہت اور ولایت، امیری اور فقیری دونوں کا جامع تھا، عجیب بادشاہ کہ اپنی نوع کا مجمع البحرین تھا، جس میں ظاہری وباطنی سلطنت کے دونوں دریا جمع تھے۔

☆......قصۂ موسیٰ وخضر میں طلبِ علم کے لیے سفر کا بیان تھا، اب اس قصۂ ذوالقرنین میں انتظامِ مملکت اور قیامِ معدلت اور مغرورین ومتکبرین اور مفسدین کی سرکوبی کے لیے سفر کا بیان ہے، تاکہ معلوم ہوجائے کہ بادشاہِ کامل وہ ہے، جو خدا کے ماننے والوں کے ساتھ نرمی کرے، اور ظالموں اور مفسدوں کو سزادے۔

قصۂ اصحابِ کہف اور قصۂ ذوالقرنین میں مناسبت:

☆......اصحابِ کہف، کافروظالم فرماں رواسے بھاگ کر پہاڑ کی غار کی جاکر چھپے، اور ذوالقرنین یاجوج وماجوج جیسے ظالموں اور مفسدوں کو پہاڑ کے پیچھے دھکیل کر آہنی دیوار قائم کررہا تھا کہ کوئی کافر وظالم اور فتنہ پرداز ملک میں داخل ہوکر فتنہ وفساد برپا نہ کرسکے۔ اصحابِ کہف کافروں وظالموں سے ڈر کر غار میں جاکر چھپے اور ذوالقرنین جیسا بادشاہ مشرق سے لے کر مغرب تک کافروں اور ظالموں کو دھمکاتا ہوا چلا گیا۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

ذي القرنين : بحالتِ جر۔ مجرور بحرفِ جر (عن) . ملحق بہ مع مذکر سالم یعنی یہ جمع مذکر سالم تو نہیں مگر اس کی طرح اس کا اعراب ہے۔

سأتلوا : س محض تاکید کے لیے ہے، استقبال کے لیے نہیں، کیوں کہ پورا کلام مسلسل نازل ہوا ہے۔

منه : میں دو احتمال ہیں:

(۱) راجح یہ ہے کہ مِن تبعیضیہ ہے اور ضمیر ذوالقرنین کی طرف راجع ہے، اور مضاف محذوف ہے؛ أي ؛ من أخباره . پھر جار مجرور درحقیقت ذكرًا کی صفت ہیں، مگر مقدم ہونے کی وجہ سے ترکیب میں حال واقع ہیں۔

(۲) ضعیف احتمال یہ ہے کہ منه کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اور مِن ابتدائیہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) یہ احوال پڑھ کر سناتا ہوں۔

منه ذكرًا : ذكرًا سأتلوا کا مفعول بہ ہے۔ اور منه پہلی صورت میں بمعنی نبأٌ (خبر) ہے۔ اور دوسری صورت میں بمعنی قرآن ہے۔

مكّنا : از بابِ تفعیل ماضی جمع متکلم، مصدر تمكينٌ؛ قدم جمانا، بااقتدار کرنا۔

سببًا : جمع أسبابٌ. سبب سے مراد؛ رسّی، وسیلہ، تعلّق، راستہ، سامان، علم، روپیہ پیسہ، آلات وغیرہ۔ یعنی ہر وہ چیز جس کے ذریعے انسان مقصود تک پہنچے وہ سب ''سبب'' میں

داخل ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو وہ تمام ضروریات فراہم کردی تھیں، جن کے ذریعے اتنی وسیع سلطنت کا انتظام وانصرام کیا جاسکتا تھا۔

فأتبع : فا حرفِ عطف ہے،أتبع ثلاثی مزید از بابِ افعال مصدر إتباع ؛ پیروی کرنا، لاحق ہونا۔ ثلاثی مجرد از باب سمع۔اس کے معنی میں مبالغہ ہے۔

حمئة : صفتِ مشبہ از حمِئ از بابِ سمع،مصدر حَمْئًا وحَمَأً الماءُ : پانی میں کیچڑ ملی ہوئی ہونا۔

عين حمئة : (عين حمنة) أي حارّة . وفي تفسير الطبري : حمأة : سوداء تغرب فيها الشمس .

إما : إن اور ما سے مرکب ہے،اور یہ حرفِ تفصیل ہے۔

أن تعذِّبَ : میں أن مصدریہ ہے،اور جملہ تعذب بتاویلِ مصدر ہوکر یا تو مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے، أي ؛ إما تعذيبک واقعٌ . یا خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے، أي ؛ إما أمرک تعذيبک . یا فعل محذوف کا مفعول ہے، أي ؛ إما توقعُ تعذيبک .

إما أن تتخذ : میں بھی مذکورہ احتمالات ہیں۔

حُسنًا : کا مضاف محذوف ہے، أي ؛ أمرًا ذا حَسَنٍ . یا مصدر کا حمل مبالغةً ہے۔

أما من ظلم : أما بھی حرفِ تفصیل ہے،مگر اس میں شرط کے معنی ہیں،اس لیے اس کے بعد جواب پر ف کا آنا ضروری ہے۔

فله جزاء ن الحُسنى : له خبر مقدم ہے،اور الحُسنى مبتدا مؤخر،اور جزاءَ حال ہے،یا تمیز، أي ؛ له الحُسنى جزاءً كما يقال : لک هذا الثوب هبةً .

يُسرًا : مضاف محذوف ہے، أي ؛ ذا يُسرٍ ، یا مصدر کا اطلاق مبالغةً ہے۔

☆...... اعراب ......☆

ويسئلونک عن ذي القرنين . واستینافیہ، عن ذي القرنين جار مجرور متعلق

يسئلونک کے،علامتِ جري ما قبل مکسور۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿منه ذکرًا﴾ " منه " میں دو احتمال ہیں:

(۱) " منه " أي ؛ من ذي القرنين . میں ذوالقرنین کا کچھ حال تم کو سناتا ہوں۔

(۲) " منه " أي ؛ من الله . اللہ کی جانب سے دیئے گئے علم وحی کی بنا پر تم کو اس کا کچھ حال بتاتا ہوں۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿مطلع﴾ اور ﴿مغرب﴾ کے مابین طباق ہے۔

☆......﴿واما من اٰمن وعمل صالحًا فله جزاء ن الحسنٰى﴾ اور ﴿اما من ظلم فسوف نعذبه ثم يرد الى ربه فيعذبه عذابا نُكرا﴾ میں مقابلۂ لطیفہ ہے۔

لطیفہ : قرآنِ کریم میں لفظ ''حبط'' جس کی اصل ''حبوط'' ہے،اس کے معنی ہیں؛ جانور کا زہریلا چارہ کھانے کی وجہ سے پیٹ پھول کر اپنی موت مرجانا۔اور یہ لفظ اعمال کا وصف بیان کرنے کے لیے بہت مناسب ہے،کہ کثرتِ اعمال کو دیکھ کر صاحبِ اعمال اُسے صالحہ،ناجحہ اور رابحہ گمان کرتا ہے،پھر دار البوار (جہنم) میں پہنچ جاتا ہے۔

☆......پیغام واحکام......☆

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سورت میں مذکور تین واقعات میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تین بنیادی قوانین بیان فرمائے ہیں:

☆ **قانونِ استقامت**......(۱) اصحابِ کہف کے واقعہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں استقلال کا قانون سمجھایا ہے۔اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے والے اصحابِ کہف اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے،اور نہایت بے سروسامانی کی حالت میں ایک غار میں پناہ گزیں ہوگئے، اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر ایمان دار شخص کو اصحابِ کہف کے واقعہ سے

استقلال کی تعلیم حاصل کر کے ایمان کے سلسلے میں ہمیشہ مستقل مزاج رہنا چاہیے، جس طرح اللہ نے اصحابِ کہف کی حفاظت فرمائی، اسی طرح وہ ہر استقلال اختیار کرنے والے شخص کی مدد فرمائے گا۔

☆ **قانونِ صبر**......(۲) حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں ہمارے لیے صبر کی تلقین ہے، انسان کو چاہیے کہ نا قابلِ فہم اور نا قابلِ برداشت اُمور میں صبر کا دامن تھامے رکھے۔ مذکورہ واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کو بڑی پریشانی اُٹھانا پڑی، انہوں نے ہر چند برداشت کرنے کی کوشش کی، مگر وہ خضر علیہ السلام کی رفاقت کو قائم نہ رکھ سکے، اور صرف تین عجیب وغریب واقعات کی معلومات حاصل ہوسکیں۔ اس میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ ہم صبر کا دامن کبھی نہ چھوڑیں۔

☆ **قانونِ شکر**......(۳) ذوالقرنین کے واقعہ میں ہمیں شکر کی تلقین کی گئی ہے، جس طرح ذوالقرنین نے خدا تعالیٰ کی طرف سے انعامات پا کر اُس کا شکر ادا کیا، اسی طرح ہمیں بھی شکر کا التزام کرنا چاہیے۔

☆......دعوت میں ترغیب وترہیب دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذوالقرنین نے اسی مصلحت سے کفر پر مصر رہنے والوں کے لیے سزا کا اعلان کیا، ورنہ حقیقت میں دین کے معاملے میں کوئی زور وجبر نہیں، مگر ترہیب (ڈرانے) کی حد تک کوئی حرج بھی نہیں۔

☆......اس واقعہ میں سیاسی میدان میں پنجہ آزمائی کرنے والے مسلمانوں کے لیے بڑا سبق ہے کہ؛ اگر اللہ پاک کسی شخص کو ایمان وصلاح، فائق وبرتر قوت، قدرتی وسائل اور انسان کے لیے پیدا کردہ طاقتوں کی تسخیر سے نوازے، تو مفسد وسرکش فاتحین، اور ظالم وجابر بادشاہوں (سیاسی گرگوں، ظالم بھیڑیوں) کے برخلاف، ان وسائل کا استعمال صرف انسانی فلاح، انسانیت کی خدمت، اور صالح تہذیب کے قیام کے لیے کرے، ہمیشہ حق کا حامی، ضعیفوں کا مونس وغم خوار، سرکشوں اور ظالموں کے لیے تازیانۂ عبرت بن کر رہے۔

۱۲۶

☆......سوالات......☆

سوال: ذوالقرنین کا معنی اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب: ذو بمعنی والا، اور قرنین بمعنی؛ دوسینگ۔ ذوالقرنین؛ یعنی دوسینگوں والا۔

اس کی وجہ تسمیہ میں مابین المفسرین کثیر اختلاف ہے، بعض نے اخبارِ قصص کا اعتبار کیا، بعض نے اخبارِ تاریخیہ کا اعتبار کیا، اور بعض نے اشتقاقاتِ لفظیہ کا اعتبار کیا:

(۱) اس بادشاہ نے چوں کہ فارس اور میدیا کی دو سلطنتوں کو جوڑ کر ایک کر دیا تھا، اس لیے ذوالقرنین کہتے ہیں۔

(۲) ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ رُوم وفارس کا فرماں روا تھا۔ قرن کے معنی ہیں؛ سینگ، بطورِ استعارہ حکومت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

(۳) یہ شخص فتوحات کرتا ہوا، اقصائے مغرب ومشرق، دنیا کے دونوں کناروں تک پہنچا، اس لیے ذوالقرنین کہلایا؛ یعنی دنیا کے دو کناروں کا مالک۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ ''قرن'' بمعنی ایک صدی، ذوالقرنین نے لمبی عمر پائی جس کے دوران میں دو صدیاں یا دو نسلیں گزر گئیں، اس لیے اسے ذوالقرنین کا لقب دیا گیا۔

(۵) وہ اپنے تاج میں سُرخاب کے دو پَر، دوسینگوں کی طرح لگایا کرتا تھا، اس لیے اس کا ذوالقرنین لقب پڑ گیا۔

(۶) اُس کے سر پر چوٹ کے دو نشان تھے، اس لیے سینگ سے تشبیہ دے کر ذوالقرنین نام رکھا گیا۔

(۷) اولیائے طریقت کہتے ہیں کہ اس کو علمِ ظاہری اور علمِ باطنی دونوں عطا کیے گئے تھے، اس لیے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔

(۸) بادشاہ کی زُلفیں دراز تھیں، اور ہمیشہ بالوں کو دو حصے کر کے اُن کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا، اس لیے اس کا لقب ذوالقرنین پڑ گیا۔ اس قول کی تائید

حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے، علامہ ابن عاشور لکھتے ہیں: ''قرن'' کا اِطلاق عربی میں چوٹی اور بالوں پر ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث ام عطیہ میں ہے '' **فجعلنا رأسها ثلاثة قرون** ''. ہم نے صاحبزادیٔ رسول کے بالوں کو غسل دیتے وقت تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

سوال: علامہ آلوسی رحمہ اللہ وجہ تسمیہ ذوالقرنین اور اس کی تعیین کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

جواب: علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے گیارہ اقوال نقل کیے ہیں، اور لکھا ہے کہ اگر تلاش کی جائے، تو شاید اس سے بھی زیادہ وجوہِ تسمیہ مل جائیں، اور جتنی وجوہ بیان کی گئی ہیں، وہ بذاتِ خود اس واقعی شخصیت اور حقیقی وجود کو طلسماتی اور توہماتی وجود بتاتی ہیں، اور اس سلسلے میں جتنی بھی روایات ہیں، وہ سب اخبارِ بنی اسرائیل ہیں، جن کا کوئی اعتبار اور وزن نہیں ہے۔ قرآن نے جتنے حقائق بیان کردیے ہیں، اس سے زیادہ ایک لفظ بھی اپنی قطعی صداقت کے ساتھ نہیں آیا ہے، اور نہ آسکتا ہے:

چوں نہ دیدند حقیقت، رہِ افسانہ زدند

سوال: ذوالقرنین کو یہ لقب ''ذوالقرنین'' قرآن نے دیا؟

جواب: یہ لقب قرآنِ کریم کا دیا ہوا نہیں، بلکہ پہلے سے مشہور چلا آرہا تھا، یہودی اس بادشاہ کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے۔

سوال: ذوالقرنین سے مراد کون؟ تعیین کیجیے!

جواب: ذوالقرنین کی تعیین کے بارے میں مختلف نظریات ہیں:

(۱) بعض نے ذوالقرنین سے ''سکندر یونانی'' مراد لیا ہے، جس کا وزیر ارسطاطالیس (ارسطو؛ شاگردِ افلاطون) موجدِ منطق تھا، یہ سکندر ابن فیلقوس/فیلیبوس المقدونی؛ حضرت عیسی علیہ السلام سے تقریبا سوا تین سو سال پہلے گزرا ہے، اس شخص پر ذوالقرنین کا اِطلاق غلط ہے، کیوں کہ یہ مشرک تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوا،

اور کافر ومشرک تھا۔

(۲) قرآن میں مذکور سکندر ذوالقرنین؛ مومن، نیک وصالح اور شاکر تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے قریب پیدا ہوا تھا، جسے سکندرِ اول بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اس کے وزیر باتدبیر یا امیرِ لشکر تھے۔ اور اس ذوالقرنین کا زمانۂ سلطنت نمرود کے بعد ہے۔ معالم العرفان اور معارف القرآن کاندھلوی میں اسی قول کے راجح ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

(۳) ذوالقرنین سے مراد ایرانی سلطنت کا بانی ''کَی خسروٗ'' یا ''سائرس'' ہے، جس نے فارس اور میدیا کی دو سلطنتوں کو یکجا کر دیا تھا۔

(۴) بعض مفسرین ''فریدون/اُفریدون بن اُثفیان بن جمشید'' بادشاہ مراد لیتے ہیں، جس کا ذکر فارسی تاریخ میں ملتا ہے۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ ''ذو'' کا لقب عام طور پر یمن کی قوم ''تبع/حمیر'' کے ساتھ لگتا ہے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ اسی قوم کا کوئی بادشاہ ہو، اور اس سے مراد؛ تبّع اُبوکرب ہو۔

صفوۃ التفاسیر میں ہے: راجح قول یہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کے بادشاہوں میں سے ایک نیک صالح مسلم، منصف وعادل بادشاہ گزرا ہے، جسے علم وحکمت عطا ہوا تھا، اسے ذو القرنین کہا جاتا ہے، اس لیے کہ مشارق ومغاربِ ارض کا وہ مالک وبادشاہ تھا۔

قال الشاعر :

قد كان ذو القرنين قبلي مسلمًا ☆ ملكًا علا في الأرض غير مفنَّد

بلغ المشارق والمغارب يبتغي ☆ أسباب مُلكٍ من كريم سيد

(۶) علامہ ابن عاشور نے قولِ اول؛ اِسکندر/سکندر مقدونی۔ قولِ ثانی: ملکِ حمیر/یمن۔ تیسرا قول؛ اُفریدون۔ بیان کرنے کے بعد فرمایا: '' **هذه أوضح الأقوال ، وما دونها لا ينبغي التعويل عليه ولا تصحيح روايته** '' (یہی تین قول زیادہ واضح ہیں اور بقیہ

اقوال غیر معتبر ہیں)۔

سوال: ذوالقرنین کی تعیین ومراد کے بارے میں مختلف اقوال بیان کیے گئے ،متأخرین مفسرین کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: (۱) علامہ ابن عاشور فرماتے ہیں کہ: قرآنِ کریم نے ذوالقرنین کی کچھ صفات (جن کا تذکرہ اگلے سوال وجواب میں ہے) ایسی بیان کی ہے، جن سے ذوالقرنین کی تعیین آسان ہوجاتی ہے۔اور اِسکندر مقدونی، ملکِ یمن، دورِ ابراہیم والا اسکندر اول وغیرہ اقوال کی نفی ہوجاتی ہے۔علامہ کے مطابق ذوالقرنین ملوک وشاہانِ چین میں سے ہی کوئی مَلِک وبادشاہ ہے۔

(۲) مؤرخین میں ذوالقرنین کی تعیین میں سخت اختلاف ہے، کیوں کہ ذوالقرنین لقب والے کئی بادشاہ گزرے ہیں، قرینِ صواب یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا وہ بادشاہ ہے، جسے یہودی خورُس، یونانی سائرُس، فارسی گورش، یا کی ارش، اور عرب کَیْ خُسرو کہتے ہیں، جس کا انتقال ۵۳۹ھ قبل مسیح میں ہوا ہے۔

دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد مشہور تاریخی فاتح اِسکندر یونانی (متوفی ۳۲۳ قبل مسیح) ہے۔

اور ابن کثیر رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ ذوالقرنین اور اِسکندر مقدونی کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے۔واللہ اعلم بالصواب!

سوال: علامہ ابن عاشور کے مطابق ذوالقرنین شاہانِ چین میں سے کوئی بادشاہ ہے، اس قول کی صحت کی کیا کیا وجوہات انہوں نے بیان کی ہیں؟

جواب: (۱) بلادِ چین کے باشندے قدیم زمانے سے اہلِ صنعت وتدبیر مانے جاتے ہیں۔

(۲) اکثر وبیشتر شاہانِ چین مملکتی تدابیر میں ماہر اور اہلِ عدل گزرے ہیں۔

(۳) اُن کی عادات میں سے لمبے بالوں کا دو چوٹیوں میں رکھنا بھی ہے (ذوالقرنین بمعنی

لمبے بالوں اور دو چوٹیوں والا)۔

(۴) فی الحال جو عظیم دیوارِ چین ہے، پورے عالَم میں اُس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے، وہ دیوار- چین اور منگولیا کے درمیان واقع ہے۔

(۵) حدیث کی پیشن گوئی کے مطابق عرب کی عظیم سلطنتِ بغداد منگولیوں کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئی۔ان سب وجوہات سے پتہ چلا کہ یاجوج وماجوج منگول ہیں، اور قرآن میں مذکور دیوار، وہ دیوارِ چین ہے، جسے ایک چینی بادشاہ (تسِينْشِي هوَانْفتي) یا (تسِينْ شِي هوَانْقْ تِي) نے بنایا ہے۔

علامہ کاندھلوی رحمہ اللہ نے فغفور نامی چینی بادشاہ کا تذکرہ بعض مؤرخین کے حوالہ سے کیا، اور آخر میں فرمایا: اس کو ذوالقرنین قرار دینا قطعاً غلط ہے۔

اس سلسلے میں مزید تحقیق کے لیے آگے کا عنوان ”**دیوارِ ذوالقرنین اور دنیا کی پانچ بڑی دیواروں کا ذکر**“ دیکھیں!

سوال: ذوالقرنین کی خاص صفات وحالات اور کارنامے بیان کریں؟!

جواب: ذوالقرنین: (۱) ملکِ صالح وعادل تھا۔ (۲) ملہم من اللہ تھا۔ (۳) اُس کی سلطنت مشرق ومغرب، شمال وجنوب میں (دُور دَراز تک) پھیلی ہوئی تھی۔ (۴) جہتِ مغرب میں عینِ حمئہ تک علاقوں کو فتح کرتے ہوئے پہنچا تھا۔ (۵) یاجوج وماجوج کے علاقوں تک بھی گیا تھا، اور یہ علاقہ مشرق ومغرب کے مابین وسط میں تھا۔ (۶) یاجوج وماجوج اُس ذوالقرنین کی رعایا پر ظلم وستم ڈھاتے تھے۔ (۷) تو اُس نے یاجوج وماجوج اور شکایت کنندہ قوم کے مابین دیوار قائم کی۔ (۸) اُس کے ساتھ اہلِ صناعت، ماہرینِ صنعتِ حدید، ماہر انجینئرز، اور معماروں کی ایک جماعت تھی۔ (۹) واقعۂ ذوالقرنین کی خبر اجمالی ہے، جو سببِ نزول سے معلوم ہوئی (قرآن نے تفصیلات بیان نہیں کی ہے)۔

سوال: کیا ذوالقرنین نبی تھے؟

جواب: بعض مفسرین نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ نبی تھے، مگر اکثر مفسرین نے انہیں نبی کی بجائے؛ نیک اور صالح انسان کہا ہے۔

ذوالقرنین ایک نیک نہاد بادشاہ تھے، نبی یا رسول نہیں تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہی مروی ہے کہ **لم یکن نبیا و لا ملکا** (ذوالقرنین نہ تو نبی تھے اور نہ فرشتہ)۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی توثیق کی ہے، اور لکھا ہے کہ یہی اکثر علماء کی رائے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی بات مروی ہے کہ ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو پسند فرمایا، اور قرآن میں اُن کی تعریف کی، اور وہ فاتح و کامیاب بادشاہ تھے۔

سوال: کیا ذوالقرنین فرشتہ تھا، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے؟

جواب: ذوالقرنین فرشتہ تو نہ تھا، بلکہ فرشتہ صفت انسان تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی قوت اور قدرت کا ایک نمونہ بنایا تھا۔

سوال: پوری دنیا پر حکومت کرنے والے کتنے بادشاہ گزرے ہیں؟

جواب: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں چار بادشاہ ایسے گزرے ہیں، جنہیں مجموعی طور پر ساری دنیا پر تسلّط حاصل رہا ہے، ان میں سے دو بادشاہ کافر، اور دو ایمان دار تھے، پہلا بادشاہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا ''نمروذ'' تھا۔ دوسرا ''بخت نصر'' تھا، جس نے یہودیوں پر غلبہ حاصل کیا تھا، یہ دونوں کافر تھے۔ اور ایمان دار بادشاہوں میں ایک سکندر ذو القرنین ہیں، جن کا ذکر اس سورت میں ہو رہا ہے۔ اور دوسرے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں، جن کی حکومت مثالی تھی۔

علامہ کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلے چار بادشاہ اممِ سابقہ میں سے تھے، اور پانچویں بادشاہ امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) میں سے ہوں گے، مراد حضرت مہدی علیہ السلام ہیں۔

سوال: ﴿**قل سأتلوا علیکم منه ذکرًا**﴾ (آپ کہیے: میں ابھی تم کو اس کا کچھ حال سناتا ہوں)، تو قصۂ ذوالقرنین کو بالتفصیل بیان کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: قرآنِ کریم میں قصۂ ذوالقرنین تاریخی انداز پر بیان نہیں کیا گیا، تفصیل وار سوانحِ حیات بیان کرنا مؤرخ کا کام ہے، اور قرآن کریم کوئی تاریخی کتاب نہیں، وہ تو ایک ہدایت نامہ ہے، اس لیے واقعہ کے جو اجزا مقصد ہدایت سے ہم آہنگ ہوں گے وہی بیان کیے جائیں گے۔ دوسری غیر ضروری باتیں نظر انداز کر دی جائیں گی۔ اور جو باتیں قرآن نے چھوڑ دی ہیں، ان کو جزم و یقین کے ساتھ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔

سوال: ﴿**من کل شيء سببًا**﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ذوالقرنین کو دے دی گئی تھی؟

جواب: **کل شيء** سے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز مراد نہیں، بلکہ وہ تمام اشیا مراد ہیں، جو اُس زمانے کی ضروریاتِ مملکت کے لیے مطلوب تھیں۔

سوال: ﴿**فأتبع سببا**﴾ ﴿**ثم اتبع سببا O**﴾ میں اسلوبِ تعبیر مختلف کیوں ہے؟

جواب: فا مفید ترتیب وتعقیب ہے۔ اور ثم مفید ترتیب وتراخی ہے۔ یعنی ذوالقرنین نے پہلے اسباب و وسائل اختیار کیے، جب اللہ پاک نے اسباب وسائل مہیا فرما دیئے، تو پھر تمکین وقدرت کے بعد فوراً سفر پر نکل کھڑے ہوئے، اس لیے فائے تعقیب کا استعمال ہوا۔ پھر مغربِ شمس، مطلعِ شمس، اور بین السدّین کا سفر وقفہ وقفہ و تاخیر سے پیش آیا، اس لیے ثم تراخی فی الزمن کا استعمال کیا گیا۔

سوال: ﴿**عین حمئة**﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿**عین حمئة**﴾ یعنی سیاہ پانی کا چشمہ۔ مراد ایسی جھیل ہے جس کے نیچے سیاہ کیچڑ ہو، جس کی وجہ سے پانی کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا ہو۔

سوال: ﴿مغرب الشمس﴾ سے کون سی جگہ مراد ہے؟

جواب: مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ مقام بحرِ ایجین (Aegean Sea) ہے، جو ترکی کی مغربی جانب میں واقع ہے۔ اس سمندر کا تعلق بحرِ اسود (Black Sea) سے ہے۔ آبنائے باسفورس (جو ترکی میں واقع ہے) نے بحرِ اسود کو بحرِ مَرْ مَرَہ سے ملایا ہے، اور آبنائے دردنیل نے بحرِ مَرمرہ کو بحرِ ایجین سے ملایا ہے، اس وجہ سے ان سمندروں کا پانی سیاہ نظر آتا ہے۔ اور بحرِ ایجین نے چھوٹے چھوٹے جزیروں والی جھیلوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ واللہ اعلم!

سوال: ذوالقرنین نے یہ سفر کیوں کیا تھا؟

جواب: قرآنِ کریم نے مقصدِ سفر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، اس لیے کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی، ممکن ہے کشور کُشائی اور ممالک فتح کرنے کے لیے کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے کیا ہو۔

سوال: ذوالقرنین کی دعوت کا نتیجہ کیا رہا؟

جواب: قرآن کریم نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، ممکن ہے سب لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ گمراہی پر مصر رہے ہوں۔ واللہ اعلم!

سوال: ﴿وجدها تغرب في عين حمئة﴾ کہا گیا، جب کہ سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا، یا ایک سو پچاس گنا، یا ایک سو بیس گنا بڑا ہے، تو زمین کے ایک چشمے میں ایسی وسعت کہاں کہ سورج اس میں غروب ہو جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا قول ﴿وجدها﴾ کا مطلب ہے ﴿وجدها في زعمه وظنه﴾ یعنی درحقیقت سورج اس میں غروب نہیں ہو رہا تھا، بلکہ ذوالقرنین کی نظر اور دانست میں ایسا لگ رہا تھا، جیسا کہ سمندر میں سفر کرنے والا اگر سمندر کے وسط میں جائے، اور آس پاس کے ساحل نظروں سے اوجھل ہو جائیں، تو سورج کو سمندر سے طلوع اور سمندر ہی میں غروب

ہوتا دیکھے گا۔ اسی طرح ذوالقرنین چلتے چلتے مغرب تک پہنچ گئے، وہاں ایک عظیم چشمہ پایا، اور دیکھا گویا سورج اس میں غروب ہو رہا ہے۔

سوال: ذوالقرنین علی اختلاف الاقوال نبی، مردِ صالح یا حکیم ہیں، ایسے عظیم آدمی پر سورج کے غروب ہونے کا معاملہ کیسے مشتبہ ہوا؟ حتیٰ کہ عقلاً ایک محال و مستحیل چیز کا گمان کرنے لگے؟

جواب: (۱) انبیاء، اولیاء اور دانا لوگوں کے گمان بھی کبھی غلط ہوتے ہیں، اگرچہ انبیاء گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تینوں واقعات میں حضرت خضر پر نکیر فرمائی۔

(۲) اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہیں، بڑے سے بڑے جسم کو چھوٹا کر سکتے ہیں، اور سورج کے عظیم جسم کو چھوٹا کر کے زمین کو وسعت دینے پر قادر ہیں، یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سورج کو سُکیڑ کر زمین میں غروب کر دیں، اور ہمیں اس کا اِدراک نہ ہو۔

سوال: ﴿قلنا يذا القرنين﴾ یہ آیت ذوالقرنین کے نبی ہونے پر دلالت کر رہی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب کیا!؟

جواب: جو لوگ ان کی نبوت کے قائل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ خطاب اس وقت کے نبی کے واسطے سے کیا، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿يا بني اسرائيل﴾، بنی اسرائیل کو یہ خطاب وقت کے نبی کی وساطت سے ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شاہ ذوالقرنین کا سفرنامۂ مشرق

آیت: ٨٩، ٩٠، ٩١:

﴿ثم اتبع سببا O حتی اذا بلغ مطلع الشمس وجدها تطلع علی قوم لم نجعل لهم من دونها سِترًا O كذلك وقد احطنا بما لديه خُبرًا O﴾ .

ربط: ذوالقرنین مغربی سفر سے لوٹنے کے بعد پایۂ تخت سے جانبِ مشرق ایک دوسرے سفر پر روانہ ہوئے، اور مشرقی کنارے؛ طلوعِ آفتاب کی جگہ ایسے قبائل کے پاس پہنچے، جن کے پاس دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی بھی سامان؛ مکان، خیمہ، لباس وغیرہ نہیں تھا۔ وہ لوگ تمدن وتہذیب سے نا آشنا تھے، وہ لوگ بالکل فطری زندگی گزارتے تھے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

مطلع: ظرفِ مکان، مفرد، طلوع ہونے کی جگہ، جمع **مطالع** آتی ہے، مصدر طلوع ومطلع از بابِ نصر؛ نکلنا، چمک جانا، اُبھرنا، خواہ سورج کا نکلنا ہو یا صبح کا یا کسی آدمی اور چیز کا نکلنا، جیسے **طلوع الشمس**؛ سورج کا نکلنا۔ **مطلع الفجر**؛ فجر کا نکلنا۔

الشمس: مؤنث سماعی ہے۔

وجد: بمعنی **رأى** ہے، یعنی محسوس کیا۔

لم نجعل: صفت ہے **قومٌ** کی۔ مضارع مجزوم منفی بہ لم، جمع متکلم۔ مصدر **جعلٌ** از بابِ فتح؛ بنانا، پیدا کرنا۔

سِترًا: اسم مفرد، حجاب، پردہ، جمع **سُتور وأستارٌ** آتی ہے۔

كذلك: مبتدا محذوف کی خبر ہے، **أي؛ الأمر كذلك .**

(ک تشبیہ۔ ذا اشاریہ۔ لام برائے بُعد اور کاف خطابی سے مرکب ہے، جیسے **﴿كذلك يبين الله آياته﴾ أي: يبين الله آياته بيانًا مثل ذلك**) .

خُبرًا: مصدر از بابِ کَرُمَ، **خُبرًا الشيء وبه:** حقیقتِ حال سے واقف ہونا۔

☆...... اعراب ......☆

حتى إذا بلغ مغرب الشمس . حتی حرفِ ابتدا، إذا ظرفِ زمان، بلغ فعل بافاعل، **مغرب الشمس** مضاف مضاف الیہ مجرور ہوکر مفعول فیہ منصوب۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿مطلع الشمس﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ذوالقرنین اقصائے مشرق تک پہنچے، یعنی مشرق کی جانب وہ یہاں تک پہنچے کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے علاوہ کوئی شہری آبادی نہ تھی، آگے سلسلۂ کوہ تھا، جن کے پیچھے سے سورج نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

سوال: بعض کج فہموں اور کور مغزوں کو خواہ مخواہ یہ اشکال ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ریل، ہوائی جہاز وغیرہ ٹیکنالوجی نہیں تھی، پھر ذوالقرنین کے لیے تین سمتوں (مشرق، مغرب، اور شمال) کا سفر کیسے ممکن ہوسکا؟

جواب: اس زمانہ میں تیز ترین؛ ریل/ٹرین، بلیٹ ٹرین، ہوائی جہاز، اُڑن طشتری وغیرہ عجیب عجیب سواریاں خدا کی قدرت سے انسان کے لیے مہیا ہوگئیں، تو کیا عجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے مقبول بندے ذوالقرنین کے لیے اس سے بڑھ کر عجیب عجیب سامان مہیا کردیئے ہوں، جو کسی صنعت وکاریگری کے محتاج نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسباب پر قادر ہے، زمین کو ذوالقرنین کے لیے لپیٹ دیا ہوگا (طی الارض کے بہت سے واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں)، دَم کے دَم میں ہزاروں میل طے کرلیتا ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شاہ ذوالقرنین کا تیسرا سفر (شمال یا مشرق کی طرف)

فتنۂ یاجوج وماجوج

آیت : ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۵ ، ۹۶ ، ۹۷ ، ۹۸ :

﴿ثم اتبع سبباO حتى اذا بلغ بين السّدّين وجد من دونهما قومًا لا يكادون يفقهون قولاO قالوا يٰذا القرنين ان يأجوج ومأجوج مفسدون في الارض فهل نجعل لک خرجا على ان تجعل بيننا وبينهم سدًّاO قال ما مكني فيه ربي خير فاعينوني بقوة اجعل بينكم وبينهم ردماO اٰتوني زُبَرَ الحديد حتى اذا ساوٰى بين الصدفين قال انفخوا حتى اذا جعله نارًا قال اٰتوني افرغ عليه قِطرًاO فما اسطاعوا ان يظهروه وما استطاعوا له نقبًا O قال هذا رحمة من ربي فاذا جاء وعد ربي جعله دكاء وكان وعد ربي حقًّاO﴾ .

ربط : مشرق ومغرب کے سفروں سے فارغ ہوکر ذوالقرنین نے ایک اور سفر کیا۔اور دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے، جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی، ذوالقرنین اوران کے لشکر کے لیے اس قوم کی زبان اجنبی تھی، بدقت اُن کی زبان سمجھ میں آئی، انہوں نے ذوالقرنین سے یاجوج ماجوج کی شکایت کی کہ وہ لوٹ مار اور فساد مچاتے رہتے ہیں، بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے اوران کے درمیان روک وبند بنادیں، ہم آپ کی مالی مدد بھی کردیں گے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے مالی مدد کی بجائے ان سے جسمانی وافرادی مدد لی، اور لوہے کی بڑی بڑی چادریں اوپر نیچے تہہ بہ تہہ رکھ کر پہاڑوں کے درمیان کے دَرّے کو پاٹ دیا، پھر اُن چادروں کو آگ سے گرم کرکے اُن پر پگھلا ہوا تانبہ ڈالا، تاکہ وہ چادروں کی درمیانی درازوں میں جاکر بیٹھ جائے، اوراس طرح یہ دیوار نہایت مضبوط بن گئی، کہ یاجوج ماجوج نہ اُس پر چڑھنے کی طاقت رکھتے تھے، اور نہ اُس میں سوراخ بناسکتے تھے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

السدين : سدٌّ کا تثنیہ، دراصل مصدر از بابِ نصر ہے، جس کے معنی ہیں: رخنہ کو استوار کرنا اور خلل کو بند کرنا۔ چوں کہ دیوار، پہاڑ اور بند میں یہ صفت موجود ہے، اس لیے سب کو سدٌّ کہتے ہیں۔ بين السدين مفعول بہ ہے بلغ کا۔ لأنه من الظروف المتصرفة کیوں کہ بين ، بان كذا کا مصدر ہے۔

السَّدَّان/ الصَّدَفان : جبلان بيننا وبين يأجوج ومأجوج ، بين أذربيجان وأرمينية ، وقيل : هما من وراء بلاد التُّرك . (سدان/صدفان سے مراد دو پہاڑ جو ہمارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان بطور حد فاصل کے ہیں، ان کا محل وقوع آذربائیجان اور آرمینیہ کے درمیان ہے۔ اور ایک قول کے مطابق: یہ دونوں پہاڑ بلادِ ترک کے پچھلی جانب میں واقع ہیں)۔

يأجوج ومأجوج : (۱) عجمیت وعلمیت کی بنا پر غیر منصرف ہیں۔ دو عجمی قبیلوں کا نام ہے، جو یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔

(۲) یا تعریف وتانیث کی بنا پر غیر منصرف ہیں، اور عربی ہیں۔ مادہ: أجّ بمعنی: أسرع . پس يأجوج بروزن يفعول ہے مثل يربوع کے۔ اور مأجوج بروزن مفعول ہے۔ سرعتِ سیر کی بنا پر یاجوج ماجوج کہا جاتا ہے۔ (قولِ اول راجح ہے)۔

☆......تورات کتابِ پیدائش میں یافث کے ایک بیٹے کا نام موغوغ آیا ہے، عربی زبان میں غین کا تلفظ گ کی آواز سے ہوتا ہے، اسی لیے موغوغ کو ماگوگ کہتے تھے، اور عربی میں گ کو ج سے بدل دیتے ہیں، اس لیے گوگ سے جوج ہوگیا۔ تو گویا یاجوج ماجوج اصل میں یاگوگ ماگوگ تھا۔

خَرْجًا : محصول، باج، ٹیکس، جمع أخراج ، بعض حضرات نے خَرْج اور خَرَاج میں یہ فرق کیا ہے کہ خَرْج : وہ مال ہے جو انسانوں کے عوض میں لیا جائے، اور خَراج عام ٹیکس ہے۔

مكني : دراصل مكن ني تھا۔ **مكن** : ماضی واحد مذکر غائب،مصدر از **تمكين**: با اقتدار اور بااختیار بنانا،اور ني میں ن وقایہ اور ي ضمیر متکلم مفعول بہ، پھر لام کلمہ کے نون کو ساکن کر کے نون وقایہ میں ادغام کر دیا ہے۔

خيرٌ : کا استعمال دو طرح ہوتا ہے،ایک بطورِ اسم جیسے **يدعون إلى الخير**. دوسرے اسم تفضیل کے طور پر، جیسے **خير الزاد التقوى**. اس آیت میں اسم بھی ہوسکتا ہے اور اسم تفضیل بھی۔ پہلی صورت میں ترجمہ ہوگا: ''بہت کچھ ہے'' اور دوسری صورت میں ''بہتر ہے''، أي : **خير مما تريدون ان تبذلوه** .

فأعينوني : فا حرفِ عطف۔ **أعان يعين إعانة** از بابِ افعال فعل امر جمع مذکر حاضر، ن وقایہ ي ضمیر متکلم مفعول بہ۔ میری مدد کرو۔

اَجعلْ : مضارع مجزوم بجوابِ امر واحد متکلم۔

ردمًا : موٹی اور مضبوط دیوار،سد محکم۔ **ردمٌ** مصدر از بابِ ضرب؛ رخنہ و پھٹن کو پتھروں سے بند کرنا،مگر یہاں بمعنی اسم مفعول ہے۔

آتوني : آتوا فعل امر ن وقایہ، ي ضمیر واحد متکلم۔مصدر **ايتاءٌ** از بابِ افعال؛ دینا، عطا کرنا۔

زبر الحديد : **زبرٌ** جمع اور **زُبرةٌ** مفرد ہے،جیسے **غُرَفٌ** جمع اور **غُرفةٌ** مفرد ہے۔ **زبرة**: لوہے کا تختہ،لوہے کا بڑا ٹکڑا۔

ساوى : **يساوي مساواة** از بابِ **مفاعلة**، برابر کرنا، برابر ہونا۔ فاعل ضمیر مستتر، **بين الصدفين** مفعول بہ ہے۔

الصدفين : صدف– پہاڑ کی پھانک، کنارۂ کوہ، جہاں جا کر پہاڑ کا اوپر کا سرا تمام ہوتا ہے۔

انفخوا : فعل امر جمع مذکر حاضر،از بابِ نصر،مصدر **نفخٌ** ؛ پھونک مارنا۔

افرغ : مضارع واحد متکلم،مصدر **إفراغٌ** از بابِ افعال؛ ڈالنا،اُنڈیلنا۔ **افراغ** اور

آتوني کا مفعول **قطرًا** محذوف ہے **لدلالة الثاني عليه** .

قِطرًا : اس کا ترجمہ عام طور پر پگھلا ہوا تانبا کیا جاتا ہے،مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے پیتل ترجمہ کیا ہے۔

فما اسطاعوا أن يظهروه : بتاویلِ مصدر ہوکر **ما استطاعوا** کا مفعول ہے، اور **اسطاعوا** دراصل **استطاعوا** تھا، ت اور ط دو قریب المخرج حرف جمع ہوئے، تو ت کو حذف کر دیا۔ **استطاعة** مصدر از بابِ استفعال؛ طاقت رکھنا، سکنا۔ یعنی اُن چیزوں کا بتمام وکمال پایا جانا استطاعت کہلاتا ہے،جن کی وجہ سے فعل سرزد ہوتا ہے۔ **ظهر** : از بابِ فتح ؛ چڑھنا۔

نَقبًا : **النقب** اسم منصوب،از بابِ سمع؛ معنی دیوار یا چمڑے میں سوراخ کرنے کے ہیں، اور ثقب کے معنی لکڑی سوراخ کرنے کے ہیں، محاورہ ہے: **نقب البيطار سرة الدابة** . بیطار نے جانور کی ناف میں منقب نشتر کے ساتھ سوراخ کر دیا۔ **منقب** یعنی سوراخ کرنے کی جگہ۔ **نقب الحائط** : دیوار میں نقب لگائی گئی۔ (**المنقبة** : دراصل پہاڑ کے درہ کو کہتے ہیں۔اور بطورِ استعارہ شریفانہ کارنامہ کو منقبت کہا جاتا ہے، یا تو اس لیے کہ اس کا اچھا اثر باقی رہ جاتا ہے،اور یا اس لیے کہ وہ بھی اس کی رفعت کے لیے بمنزلہ منہاج کے ہے)۔

دكّاء : جمع **دكّاواتٌ** معنی؛ ہموار، برابر۔ **دكَّ** از بابِ نصر؛ ریزہ ریزہ کرنا۔

☆...... اعراب ......☆

ان يأجوج ومأجوج مفسدون في الارض . إن حرفِ مشبہ بالفعل، **يأجوج ومأجوج** إن کا اسم منصوب،اور **مفسدون في الأرض** إن کی خبر مرفوع۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿**جعله نارًا**﴾ أي ؛ **جعل ذلك الحديد نارًا**. جب لوہا بالکل آگ ہو گیا۔

☆﴿**افرغ عليه قطرا**﴾ أي ؛ **على السداد الردم** . اس بندھ، دیوار پر پگھلا ہوا

تانبا اُنڈیل دوں گا۔

☆......﴿یظھروہ﴾ أي ؛ **یظھروا الردم** . یاجوج ماجوج اس بندھ پر چڑھ کر نہ آ سکتے تھے۔

☆......﴿له نقبا﴾ " له " أي ؛ **للردم** . بندھ میں سوراخ کرنا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔

☆......﴿جعله دکاء﴾ أي ؛ **جعل السداد الردم** . اس دیوار و بندھ کو ڈھادے گا۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿جعله نارًا﴾ میں **تشبیه بلیغ** ہے۔یعنی حرات اور شدتِ احمرار میں لوہا آگ کی طرح ہوگیا۔اداتِ تشبیہ اور وجہ شبہ کو حذف کر دیا گیا،تو وہ بلیغ ہوگیا۔

☆......﴿فما اسطاعوا ان یظھروہ﴾ میں **اسطاعوا** دراصل **استطاعوا** تھا، تائے خفت کو حذف کر کے کلام میں حسن پیدا کر دیا گیا۔

☆......﴿اتونی افرغ علیه قطرا﴾ قرآن مجید میں بعض مقامات پر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر کے لطافت پیدا کر دی گئی ہے،ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے:﴿اتونی افرغ علیه قطرا﴾. تقدیر کلام یوں ہے:﴿اتونی قطرا افرغ علیه﴾ مگر مقدم کو مؤخر کرنے کی وجہ سے کلام میں روانی آ گئی۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......اس قصہ سے ذوالقرنین کی ولایت (ولی ہونے) کا بھی پتہ چلتا ہے،اور کرامات کے ثبوت پر مزید دلائل مہیا ہوتے ہیں۔من جملہ کرامات کے ایک یہ بھی ہے کہ اتنی عظیم مقدار میں تانبا پگھل گیا، جیسے داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو نرم کر دیا گیا تھا،اور سلیمان علیہ السلام کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا گیا تھا۔واللہ اعلم بالصواب!

☆......﴿فھل نجعل لک خرجًا﴾ سے حسنِ ادب معلوم ہوا کہ سامنے والے کو کسی

کام کے کرنے پر برضا و رغبت آمادہ کس طرح کیا جائے، زبردستی کسی پر کام پورا کرنے کو لازم کر دینا سوئے ادب ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: ﴿لا یکادون یفقھون قولا﴾ سے معلوم ہوا کہ اُن کی بات سمجھ نہیں پاتے تھے، پھر بات کیسے ممکن ہوئی؟

جواب: اُن سے جو گفتگو آگے ہوئی، وہ یا تو کسی ترجمان کے ذریعے ہوئی ہوگی، یا اشاروں سے، ترجمان سے ہونا زیادہ واضح ہے۔

سوال: یاجوج ماجوج کون تھے؟ اُن کا تعارُف بیان کریں!

جواب: جمہور علمائے تفسیر وحدیث کے مطابق: یاجوج وماجوج بنی نوعِ انسان کی دو قوموں یا دو قبیلوں کا نام ہے، اولادِ آدم وحوا میں سے یافث بن نوح کی نسل سے ہیں، جو ترک کا جداعلیٰ ہے، اور ترک اس خاندان کی ایک شاخ ہے، جو سد ذوالقرنین کے اس طرف ترک کر دیئے گئے تھے، یعنی چھوڑ دیئے گئے تھے، گویا کہ لفظ ترک؛ متروک سے مشتق ہے، تھوڑے تھوڑے وقفوں سے وہ پہاڑوں کے درمیانی درّے سے اس علاقے میں آ کر قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیتے تھے۔ابھی وہ سد ذوالقرنین کے پیچھے بند ہیں، قیامت سے پہلے اس سے باہر نہیں آ سکتے، جس طرح دجالِ اکبر ایک جزیرہ میں محبوس ومقید ہے، اخیر زمانہ میں نزولِ عیسیٰ کے بعد اس کا خروج ہوگا، اسی طرح یاجوج ماجوج بھی پس دیوارِ آہنی محبوس ہیں، نزولِ عیسیٰ کے بعد، خروجِ دجال کے بعد قومِ یاجوج ماجوج بھی خروج ہوگا۔

سوال: محدثین، مفسرین ومؤرخین کے مطابق یاجوج ماجوج کس کی اولاد میں ہیں؟

جواب: یاجوج ماجوج کے بارے میں تمام صحیح روایات، محدثین، مفسرین اور مؤرخین متفق ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے صاحب زادے؛ یافث کی اولاد ہیں۔

سوال: بعض لوگ یاجوج ماجوج کو عجیب الخلقت مانتے ہیں، اُن کا یہ خیال درست ہے؟

جواب: اکثر علماء کی رائے ہے کہ وہ عام انسانوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اور حضرت نوح علیہ السلام کی ذرّیت میں سے ہیں۔ وہ کوئی عجیب الخلقت، عجوبۂ روزگار، یا برزخی مخلوق نہیں ہے۔

سوال: ﴿جعله دكاء﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوار قیامت تک نہیں رہے گی؟

جواب: قرآنِ کریم سے یہ بات یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتی کہ یہ دیوار تا قیامت قائم رہے گی، بلکہ اس کا قیامت سے پہلے ٹوٹنا بھی ممکن ہے، چنانچہ بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ دیوار رُوس کے علاقے داغستان میں دربند کے مقام پر بنائی گئی تھی، اور اب وہ ٹوٹ چکی ہے۔ یاجوج ماجوج کے مختلف ریلے تاریخ کے مختلف زمانوں میں متمدن آبادیوں پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں، اور پھر وہ ان متمدن علاقوں میں پہنچ کر خود بھی متمدن ہوتے رہے ہیں۔ البتہ اُن کا آخری ریلا قیامت سے کچھ پہلے نکلے گا۔

سوال: وہ پہاڑ کون سے تھے جن کے درمیان ذوالقرنین نے یہ دیوار بنائی تھی؟

جواب: قرآنِ کریم اس کے جواب سے خاموش ہے، البتہ مؤرخین کا بیان ہے کہ ایران سے جانبِ شمال بحر کاسپین (Caspian Sea) یعنی بحر قزوین (خزر) اور بحر اسود کے درمیان جو سلسلۂ کوہ ہے، جس کو جبال کاکیشیا (Caucasus) یا جبالِ قَو قاز/قَفقاز/قَفقاس اور تَفْلیس بھی کہتے ہیں۔ اِن پہاڑوں میں ایک درّہ (گھاٹی) دَرّہ دَارْ یال کے نام سے ہے۔ ذوالقرنین نے وہاں دیوار بنا کر اس درّے کو مسدود کر دیا تھا۔ اور وہ ترک قبائل تھے جن کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا۔

سوال: آج کل سائنس دان اور ماہرینِ انکشافات اور فضلائے جغرافیہ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ ہم نے تمام زمین کو چھان ڈالا، مگر ہم کو کہیں اس دیوار کا پتہ نہ ملا، اور نہ کہیں یاجوج ماجوج کا پتہ لگا؟

جواب: اس شبہ کے جواب میں ہمارے ان مصنفین نے جو مغربی علوم وتحقیقات سے

۱۳۵

مرعوب ہیں، اس دیوار کا پتہ بتلانے کی کوشش کی ہے، اور اٹکل کے تیر چلائے ہیں، مگر خود ان کو اپنے لکھے ہوئے پر یقین واطمینان نہیں۔ لیکن اس شبہ اور وسوسہ کا صحیح جواب وہ ہے جو علامہ آلوسی اور علامہ حسین طرابلسی رحمہما اللہ نے دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

قرآن اور حدیث نے جس چیز کی خبر دی ہے وہ عقلاً اور عادتاً محال نہیں، بلکہ قدرتِ خداوندی کے تحت داخل ہے، اور جو اُمور عقلاً ممکن اور جائز الوقوع ہوں، اور نصوصِ شرعیہ سے ان کا وجود اور وقوع ثابت ہو، ان کی تصدیق فرض اور لازم ہے، اس لیے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج وماجوج سد ذوالقرنین کو توڑ کر نکلیں گے۔ فضلائے جغرافیہ اور ماہرینِ انکشافات کا یہ دعویٰ کہ ہم پوری زمین سے اچھی طرح واقف ہیں، اور ہو چکے ہیں، دعویٰ بلا دلیل ہے، جو قابلِ تسلیم نہیں۔ مثلاً اگر کسی کو باوجود تلاشِ کامل کے زید نہ ملے، تو یہ زید کے معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ نیز کسی چیز کا نہ پانا اس چیز کے عدم کی دلیل، بلکہ نہ ملنے کی وجہ سے کسی چیز کے وجود کا انکار کر دینا جہالت اور کوتاہ نظری کی قطعی دلیل ہے۔

نوٹ: آگے مذکور (ص/۲۷۰ تا ۲۸۳) یاجوج وماجوج اور دیوارِ ذوالقرنین سے متعلق تفاصیل لفظ بلفظ مساہمین کے لیے یاد کرنا ضروری نہیں، صرف خلاصہ ذہن نشیں کرلیں!

یاجوج ماجوج سے متعلق اسرائیلی روایات یعنی؛ بے اصل وبے دلیل باتیں اور اٹکل کے تیر

یاجوج ماجوج کے بارے میں مفسرین نے بہت ہی عجیب وغریب اور حیرت ناک واقعات بیان کیے ہیں، جو نہ عقل میں آتے ہیں، اور نہ تجربات ومشاہدات اس کی شہادت دیتے ہیں، اور نہ نقلِ صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے، مثلاً:

☆......یاجوج وماجوج بالشت، ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک ہاتھ کا قد رکھتے ہیں، اور بعض غیر معمولی طویل القامت ہیں۔

☆......ان کے کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک کو اوڑھتے ہیں، اور دوسرے کو بچھاتے ہیں۔

☆......ان کی غذا کے لیے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں پھینک دیتی ہیں، جن کے سر اور دُم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس رات دن اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے، تب اس فاصلہ کو طے کرسکتا ہے۔

☆......وہ ایک برزخی مخلوق ہیں، جو آدم علیہ السلام کی صُلب سے تو ہیں، مگر حضرت حواء رضی اللہ عنہا کے بطن سے نہیں ہیں، کیوں کہ وہ آدم علیہ السلام کے ایسے نطفے سے پیدا ہوئے ہیں، جو احتلام کی حالت میں نکلا تھا، اور مٹی میں رَل مِل گیا تھا۔

(یہ روایت گھڑنے والے بدبختوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ انبیائے کرام کو احتلام یعنی بدخوابی نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ شیطانی وسوسہ اندازی سے ہوتی ہے، اور انبیائے کرام شیطانی وسوسہ اندازی سے محفوظ ہیں۔ بقول ابن کثیر یہ قول انتہائی غریب قول ہے، نہ عقل اسے تسلیم کرتی ہے، نہ نقل سے اس کی تائید ہوتی ہے، اہل کتاب کے پاس اس طرح کے بے سروپا قصوں اور کہانیوں کا بڑا ذخیرہ ہے)۔

☆......یاجوج ماجوج ایک امت ہے، ان کی ہر امت میں چار لاکھ امتیں ہیں، ان میں

کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا، جب تک وہ ایک ہزار اولاد کو اپنے نطفے سے نہیں پیدا کرلیتا ہے، پوری امت مسلح رہتی ہے۔

☆......ان کی تین قسمیں ہیں: ان کی ایک صنف ''ارز'' کی طرح ہے۔''ارز'' ملکِ شام میں ایک درخت ہوتا ہے، اس کی لمبائی ایک سو بیس (۱۲۰) ہاتھ ہوتی ہے۔ اُن کے لیے نہ پہاڑ رُکاوٹ بنتا ہے، نہ کوئی ہتھیار ان پر کام کرتا ہے۔

☆......ان کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے کان اتنے لمبے چوڑے ہوتے ہیں کہ ایک کان بچھا لیتے ہیں، اور دوسرے کان کو اوڑھ لیتے ہیں، ان کی راہ میں ہاتھی آجائے، یا کوئی وحشی جانور، اونٹ یا سور؛ کسی کو نہیں چھوڑتے، سب کو کھا جاتے ہیں، اور ان میں جو مرجاتا ہے اس کو بھی چٹ کرجاتے ہیں۔ اُن کی فوج کا اگلا حصہ شام میں ہوتا ہے، اور پچھلا حصہ بُحیرۂ طبریہ [☆] یا مشرق کی نہروں سے پانی پیتا رہتا ہے۔

[☆] (بُحیرۂ طبریہ اسرائیل کے شمال مشرق میں اُردن کی سرحد کے قریب واقع ہے، اس کی لمبائی ۲۳ رکلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۱۳ رکلومیٹر ہے۔ اور انتہائی گہرائی ۱۵۷ ر فٹ ہے، اس کا کل رقبہ ۱۶۶ ر مربع کلومیٹر ہے)۔

☆......یاجوج ماجوج کی تین صنفیں ہیں: ایک صنف ''ارز'' کی طرح ہے۔ دوسری صنف چار ہاتھ لمبی ہوتی ہے اور چار ہاتھ چوڑی ہوتی ہے۔ تیسری صنف ان لوگوں کی ہے جو ایک کان کو بچھاتے ہیں، اور دوسرے کان کو لحاف کی طرح اوڑھ لیتے ہیں، ان کی خوراک عورتوں کا خونِ نفاس ہے۔

☆......یاجوج ماجوج کا قد ایک بالشت اور دو بالشت ہوتا ہے، ان میں جو سب سے لمبے قد والے ہیں، ان کے قد تین بالشت ہوتے ہیں، یہ سب اولادِ آدم یعنی انسانوں میں سے ہیں، کوئی دوسری مخلوق نہیں ہیں۔

☆......یاجوج ماجوج کے تین فرقے ہیں: تاویل۔تاویس۔اورمنسک۔

☆......یاجوج ماجوج قوم کا نام نہیں، بلکہ مقام کا نام ہے۔

اسرائیلی روایات کی حقیقت:

(اس قسم کی تمام باتیں قطعاً بے دلیل، بے اصل اوراٹکل کے تیر ہیں، اسلامی روایات سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔معجم البلدان؛ یاقوتِ حموی، البدایہ والنہایہ؛ ابن کثیر، فتح الباری؛ ابن حجر، اور قصص القرآن؛ سیوہاروی میں ان روایات کی تغلیط کی گئی ہے۔اسی طرح ابن جریر طبری اور قرطبی نے بھی اپنی تفسیروں میں اس طرح کی کئی روایتیں ذکر کی ہیں، ان تمام روایتوں میں یاجوج وماجوج کی محیر العقول خصوصیات بیان کی گئی ہیں، یہ قطعاً اسلام دشمن بددینوں اور افترا پردازوں کا گڑھا ہوا افسانہ ہے۔ان بدبختوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کرکے اپنی بدترین جسارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

نیز سمجھنے کے لیے واضح بات یہ ہے کہ جب یاجوج وماجوج بنی آدم اور ذریتِ نوح ہیں، تو پھر وہ دوسری ذریت سے اتنے مختلف کیسے ہوسکتے ہیں، جتنا ان مذکورہ بالا بے اصل روایات میں دکھایا گیا ہے)۔

بعض روشن خیال متجددین کا یاجوج ماجوج کے بارے میں خیال:

☆......اس زمانہ کے بعض روشن خیال مصنفین ومتجددین یہ خیال کرتے ہیں کہ یاجوج ماجوج سے چینی، یا روسی، یا دوسری وحشی قومیں مراد ہیں، جو کہ منگولیا اور منچوریا، یا کوریا کے قریب آباد ہیں، یا وہ تاتاری اور چنگیزی لوگ مراد ہیں جنھوں نے خلافتِ بغداد (بنوعباس) کو درہم برہم کیا، یا وہ وحشی قومیں مراد ہیں، جو آرمینیہ کے پہاڑوں کے قریب رہتی ہیں، ان مصنفین کا خیال یہ ہے کہ پہلے زمانے میں ان وحشی اور درندہ صفت قوموں کو یاجوج ماجوج کہا جاتا ہے، مگر اب وہ تعلیم یافتہ اور متمدن ہوگئے ہیں، اور اب وہ یاجوج وماجوج نہیں

رہے، اور نہ وہ اب کسی دیوار کے پیچھے بند ہیں، وہ آہنی دیوار یا تو ختم ہوگئی ہے، یا ان یاجوج وماجوج نے اپنے خروج کے لیے کوئی دوسرا راستہ نکال لیا ہے، اور اب باقاعدہ پاسپورٹ لے کر ہمارے ملکوں میں آجارہے ہیں، یہ سب خرافات ہے، قرآن اور احادیث میں یاجوج وماجوج کی جن صفات کا ذکر ہے، وہ صفات اِن قوموں پر منطبق نہیں ہوتیں۔

از روئے قرآنِ کریم وحدیث شریف؛ یاجوج وماجوج اس دیوار کے پیچھے بند ہیں، وقتِ معین سے پہلے ہمارے ملکوں میں نہیں آسکتے، اور جو وحشی ہمارے ملکوں میں آتے جاتے ہیں، وہ اصل میں یاجوج وماجوج نہیں، اور جو اصلی اور واقعی یاجوج ماجوج ہیں، وہ دیوار کے پیچھے بند ہیں، اور یہ متمدنین جن کو یاجوج وماجوج خیال کرتے ہیں، وہ یہ یاجوج ماجوج نہیں، جن کی قرآن وحدیث میں خبر دی گئی ہے، تاتاریوں اور وحشیوں کو یاجوج وماجوج سمجھ لینا ایک خام خیال ہے، جس کی کوئی سند نہیں۔

مرزائے قادیان کا ہذیان:

☆......مرزائی یہ کہتے ہیں کہ یاجوج وماجوج سے انگریز اور رُوس مراد ہیں، اور جب ان کا خروج ہوچکا، تو اس کے لیے مسیح کی آمد ضروری ہے، اور وہ مسیحِ موعود؛ مرزا غلام احمد قادیانی ہے۔تھوڑی دیر کے لیے اگر مرزائیوں کے اس ہذیان وبکواس اور دل خراش سماعت کو بادلِ نخواستہ برداشت کرلیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ اور صریحہ سے یہ ثابت ہے کہ یاجوج وماجوج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے دفعۃً ہلاک ہوجائیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ ان کی گردنوں میں دفعۃً کوئی طاعونی کیڑا نمودار ہوگا، جس سے سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے، اور ایک ہی رات میں مرجائیں گے، اور تمام دنیا متعفن اور بدبودار ہوجائے گی، اس وقت اللہ تعالیٰ بڑی لمبی گردن والے پرندے بھیجے گا، جو ان کی لاشوں کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے، اور بعد ازاں ایک بارش ہوگی، جس سے زمین دُھل

جائے گی، یہ مضمون بے شمار حدیثوں سے ثابت ہے۔ مرزائی بتلائیں کہ اگر یاجوج وماجوج سے انگریز اور رُوس مراد ہیں، اور مرزا صاحب مسیحِ موعود ہیں، تو مرزا صاحب نے انگریز اور رُوس کے لیے کب بددعا کی، اور کس شہر میں انگریز اور رُوسی لوگ مرزا صاحب کی بددعا سے ایک رات میں ہلاک ہوئے، اور صبح ہوتے ہی سب کے سب مردہ پائے گئے، اور کس مہینہ اور کس سال میں لمبی گردن والے پرندوں نے ان کی لاشوں کو کون سے سمندر میں لے جاکر ڈالا؟! مرزا قادیان تو یاجوج وماجوج (عیسائی اقوام) کی عروج اور ترقی کے لیے دعا ہی کرتا ہوا مر گیا، اور اپنے مریدوں کو ان کی وفاداری اور دعا کی وصیت کرگیا۔ مرزا کہتا ہے: ”**لکل دجال عیسٰی**“- اور حیرت کا مقام ہے کہ مرزا- بااقبال (عیسائی) قوموں کو دجال بتاتا ہے، اور بجائے ان کے مقابلہ اور مقاتلہ کے، ان کی دعا گوئی اور خوشامد میں مصروف ہے۔

یاجوج وماجوج کے بارے میں دورِ جدید کے مفسرین کی آراء:

☆ ......حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علامہ کشمیری رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں: ” أما الروس فهم من ذرية ياجوج “ روس والے یاجوج کی نسل میں ہیں۔

اور اسی کے ساتھ بعض مواقع پر شاہ صاحب یہ بھی فرماتے تھے: ” **إن ياجوج وماجوج لا يبعد أن يكونوا أهل روسيا وبريطانيا** “ ...... یاجوج وماجوج اگر روس اور برطانیہ والے ہوں، تو اس دعوے کو بعید از واقعات نہیں ٹھرایا جا سکتا ہے۔

آگے علامہ مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے ”المسیح الدجال“ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے ذات کے اصل ضرورت اس کی ہے کہ ان ”دجالی صفات“ کا پتہ چلایا جائے، جن کی وجہ سے ”دجال“ دجال بن جائے گا، اور اسی طرح یہ ڈھونڈنا کہ دنیا کی کن قوموں کو یاجوج وماجوج قرار دینا چاہیے، ایک غیر ضروری تاریخی مسئلہ سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بل کہ اس سلسلے میں بھی بجائے ذات کے ہمیں ان

۱۳۸

صفات ہی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے، جس کی وجہ سے مذاہب وادیان میں یاجوج وماجوج سے چوکنا رہنے پر اصرار کیا گیا ہے۔

☆ ......مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یاجوج ماجوج کے متعلق اسرائیلی روایات اور تاریخی کہانیوں میں بہت بے سروپا اور عجیب وغریب باتیں مشہور ہیں، جن مفسرین نے انہیں نقل کیا ہے، انہوں نے بھی ان پر اعتماد نہیں کیا ہے، اور صرف انہیں تفصیلات کو صحیح تسلیم کیا ہے، جو قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں آئی ہیں، اتنا یقینی ہے کہ وہ سب اولادِ آدم میں سے ہیں، اور یافث بن نوح کی اولاد میں ہیں، اور عام انسانوں جیسے ہیں، ان کا خروج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوگا۔ یاجوج ماجوج نام، صرف ان وحشی اور غیر متمدن خونخوار ظالم لوگوں کا ہے، جو تمدن سے ناآشنا ہیں۔

☆ ......علامہ عبدالماجد دریا آبادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یاجوج ماجوج بظاہر یہ وہ منگولی قبیلے معلوم ہوتے ہیں، جو پہاڑوں کی دوسری طرف آباد تھے، وہ کبھی کبھی موقعہ پاکر یلغار کرتے ہوئے ترکوں کے درمیان گھس آتے تھے، یاجوج ماجوج کا اشتقاق اہلِ سنت نے مادّہ ”أجّ“ سے کیا ہے، جس کے معنی آگ کے شعلہ مارنے اور پانی کے تموّج وتلاطُم کے ہیں، ان کے یہ نام اُن کی شدتِ شورش کی بنا پر پڑے تھے۔ بعض نے اسے عجمی نام کہا ہے۔

☆ ......یاجوج ماجوج بن یافث بن نوح۔ عام طور پر ان لوگوں کی سکونت ایشیائے کوچک اور آرمینیہ میں سمجھی گئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی قومیں ہیں جو سیتھین کہلاتی ہیں۔ بہر حال بائبل اور اس کی شرح سے قرآنی یاجوج ماجوج پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی ہے، قرآنی اشاروں سے تو بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی شورہ پشت اور شورش پسند پہاڑی قبیلے تھے، اور جو آبادیاں ان کی تاخت کی زد میں تھیں، انہوں نے ذوالقرنین سے عرض کیا کہ ہم ان سے سخت پریشان ہیں، کہیں تو ہم چندہ فراہم کردیں اور آپ ہمارے اور ان کے

درمیان ایک ایسی حد فاصل قرار دے دیں، جسے توڑ کر وہ ہم پر حملہ آور نہ ہوسکیں۔

☆......مفتی سعید صاحب پالن پوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

دنیا کی موجودہ اقوام میں سے یاجوج ماجوج کون ہیں؟ اس کا جواب بھی یقین کے ساتھ نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ یاجوج ماجوج بہت قدیم نام ہیں، اور مرورِ ایام کے ساتھ نام بدل جاتے ہیں۔ آج دنیا میں کوئی قوم ان ناموں سے موسوم نہیں، اس لیے اس کی تعیین دشوار ہے۔ علمائے کرام کی ایک رائے یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج منگولیا (تاتار/تتار/مغول) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا ہے، جو یورپ، امریکہ اور رُوس کی اقوام کے منبع ومنشا ہیں، ان کے دو بڑے قبیلے: موگ اور یوچی کہلاتے تھے، جو عربی زبان میں یاجوج و ماجوج بن گئے ہیں۔ واللہ اعلم!

☆......یاجوج و ماجوج کے بارے اس قدر بے سروپا باتیں مشہورنے کی وجہ یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا تذکرہ یہودیوں کی کتابوں (کتاب پیدائش، حزقیل) میں بھی ہے۔ اس وجہ سے یہودیوں نے حسبِ فطرت یاجوج و ماجوج کے بارے میں بعید از عقل کہانیاں تصنیف کرلیں، اور کعب احبار کے ذریعے جو یہودی النسل تھے، اور ان کے قصوں کے بڑے عالم تھے، وہ سب کہانیاں مسلمانوں میں پھیل گئیں۔

☆......حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حضرت کعب احبار اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے تھے، یا اس لیے کہ اس رطب و یابس میں سے جو دُور از کار باتیں ہوں، وہ ردّ کردی جائیں، اور جن سے قرآن اور احادیثِ نبویہ کی تائید ہوتی ہو، ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے، مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس پورے طُومار کو اس طرح نقل کرنا شروع کردیا، جس طرح حدیثی روایات کو نقل کیا جاتا ہے۔

☆......یاجوج و ماجوج کا خروج وعروج بھی، دجال کے ظہور کی طرح علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۹۶ رمیں ہے: ﴿حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وهم

من كل حدب ينسلونO واقترب الوعد الحق﴾ (یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے، اور وہ ہر بلندی سے پھسلتے آئیں گے اور سچا وعدہ نزدیک آپہنچے گا الخ)۔ مطلب یہ ہے کہ نفخ صور سے پہلے قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ظاہر ہوگی کہ یاجوج وماجوج کے تمام قبیلے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے، اور دنیا میں عام غارت گری شروع کردیں گے، اور اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے۔ غرض آیت میں فتح سے مراد عروج اور ان کا یک بارگی دھاوا بولنا ہے، دیوار توڑ کر نکلنا مراد نہیں، کیوں کہ اس آیت میں دیوار کا کوئی تذکرہ نہیں۔

☆......یاجوج وماجوج کے بارے میں ایک مشہور حدیث (منقول عن ابی ہریرہ) یہ ہے کہ وہ روزانہ سد ذوالقرنین کو کھودتے ہیں" ليحفرون السد "۔ شام کو جب اتنی پتلی رہ جاتی ہے کہ سورج کی کرنیں نظر آنے کے قریب ہوجاتی ہے، تو ان کا سردار کہتا ہے اب کام ختم کرو، کل تم اس کو کھود ڈالیں گے، مگر جب اگلے روز کام پر واپس آتے ہیں، تو دیوار کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ومستحکم پاتے ہیں، پھر وہ کھودنا شروع کرتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا، تاآنکہ مقررہ مدت آجائے، اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہو کہ وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں، تو ان کا سردار کہے گا: اب واپس چلو، کل اِن شاءاللہ اس کو کھود ڈالیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن ان کو دیوار ویسی ہی ملے گی، اور وہ اس کو کھود ڈالیں گے، اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ (مذکورہ حدیث باعتبار سند اگرچہ عمدہ ہے، مگر ابن کثیر نے اس پر سخت تنقید کی ہے، وہ کہتے ہیں:" إسناده جيد ولكن متنه في رفعه نكارة "کہ سند اگرچہ عمدہ ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس حدیث کی نسبت غلط ہے۔ نیز اس قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے بھی مروی ہے، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اکثر کعب احبار کے پاس بیٹھتے تھے، اس لیے ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے یہ مضمون کعب احبار سے سنا ہو، اور ایک کہانی کے طور پر بیان کیا ہو، مگر نیچے کسی راوی نے غلط فہمی سے اس کو مرفوع کردیا ہو)۔

یاجوج ماجوج کے بارے میں چند صحیح روایات

☆(۱)......(عن أم حبیبة عن زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہن): ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا تھا، اور زبانِ مبارک پر یہ کلمات تھے: " **لا اله إلا الله ، ویلٌ للعرب من شرٍّ قد اقترب ، فُتح الیوم من ردم یأجوج ومأجوج مثل هذه ، وحلّق تسعین** " (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، عرب کے لیے خرابی ہے، اس شر سے جو قریب آ چکا ہے، آج سد یاجوج وماجوج اتنی کھول دی گئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوے (۹۰) کا حلقہ بنایا، یعنی انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ملا کر حلقہ بنا کر دکھلایا)۔ اس حدیث شریف میں مذکور واقعہ خواب کا واقعہ ہے، یعنی خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظر دیکھا ہے، اور خواب اکثر تمثیلی رنگ میں نظر آتا ہے، اور اس کی تعبیر ہوتی ہے، چنانچہ اس خواب کی تعبیر آپ نے یہ بیان فرمائی کہ عرب کے لیے شرور وفتن کے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ غرض اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ واقعۃً دیوار میں اتنا سوراخ اس روز ہو گیا تھا، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالفقار تلوار کے بارے میں جنگ احد کے موقع پر خواب دیکھا تھا کہ آپ نے اس کو ہلایا، تو اس کی دھار جھڑ گئی، اور یہ بات خواب میں آپ کو ناگوار ہوئی، بیدار ہونے کے بعد آپ نے اس کی تعبیر اُس شکست سے بیان فرمائی، جو جنگ احد میں پیش آئی، ذوالفقار کی دھار حقیقت میں جھڑی نہیں تھی۔

☆(۲)......(عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے، کہ آپ اپنی ذریت میں سے جہنم کی کھیپ نکالیں، آدم علیہ السلام تناسُب دریافت کریں گے، ارشاد ہوگا کہ ہزار (۱۰۰۰) میں سے نوسو ننانوے (۹۹۹) جہنم کے لیے علیحدہ کریں، اور ایک جنت

کے لیے۔ یہ ارشاد سن کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے کہ ہزار میں سے ایک جنتی ہوگا، تو کس کا نمبر آئے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غم نہ کرو، تم میں سے ایک ہوگا، اور یاجوج وماجوج میں سے ایک ہزار ہوں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یاجوج وماجوج کی تعداد انسانی آبادی میں سب سے زیادہ ہے۔ (ابن کثیر رحمہ اللہ)

☆(۳)......(عن نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ): جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتلِ دجال سے فارغ ہو جائیں گے، تو حق تعالیٰ کا حکم آئے گا کہ میں اپنے بندوں میں سے اپنے بندے بھیج رہا ہوں، جن سے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں، آپ مسلمانوں کو جمع کر کے کوہِ طور پر چلے جائیں، پھر حق تعالیٰ یاجوج وماجوج کو بھیجیں گے، وہ سرعتِ سیر کے سبب ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے دکھائی دیں گے، ان میں سے پہلے لوگ بُحیرۂ طبریہ سے گزریں گے، اور اس کا سب پانی پی کر ایسا کر دیں گے، کہ جب ان میں سے دوسرے لوگ اس بُحیرہ سے گزریں گے، تو کہیں گے کہ یہاں کبھی پانی رہا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک وبا بھیجیں گے، جس سے سب یاجوج وماجوج مر جائیں گے۔

اس روایت کے ایک طریق میں یہ بھی ہے کہ بُحیرۂ طبریہ سے گزرنے کے بعد یاجوج وماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل الخمر پر چڑھ جائیں گے، اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا، آؤ اب ہم آسمان والوں کا خاتمہ کریں، اور وہ آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے، حق تعالیٰ کے حکم سے وہ تیر خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے (تاکہ وہ احمق خوش ہوں کہ انہوں نے آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا)۔ سچ ہے: چیونٹی کی جب موت آتی ہے، تو اس کے پَر لگتے ہیں اور وہ آسمان پر اُڑنے کی کوشش کرتی ہے۔

دیوارِ ذوالقرنین اور دنیا کی پانچ بڑی دیواروں کا ذکر

قرآن کریم نے دیوارِ ذوالقرنین کا ذکر کیا، مگر اس کا موقع اور محل نہیں بتایا کہ وہ کس جگہ بنی تھی۔ مؤرخین اور جغرافیہ نویسوں نے تاریخی واقعات کے ذیل میں دنیا کی چند بڑی بڑی دیواروں کا ذکر کیا ہے، اور اپنے خیالات اور گمان اور تخمینہ سے اس کو دیوارِ ذوالقرنین قرار دیا، مولانا عبدالحق صاحب دہلوی رحمہ اللہ مصنف تفسیر حقانی نے اپنی تفسیر میں اس پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس سلسلے میں پانچ دیواروں کا ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، جس کو تفصیل درکار ہو، وہ اصل تفسیر حقانی کی مراجعت کرے۔

(۱)......دیوارِ چین:

☆......جس کو بقول مؤرخین ”فغفور چین“ نے حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام سے تخمیناً دو سو پینتیس (۲۳۵) برس پہلے بنایا تھا، جس کی لمبائی کا اندازہ بارہ سو (۱۲۰۰) میل سے پندرہ سو (۱۵۰۰) میل تک کیا گیا ہے، جس کے پیچھے کچھ وحشی قومیں آباد تھیں، جو چین کے ملک پر تاخت وتاراج کیا کرتی تھیں، ان کو یاجوج وماجوج سے تعبیر کرتے تھے، چوں کہ یہ دیوار اینٹ اور پتھر کی بنی ہوئی ہے اور ایک کافر کی بنائی ہوئی ہے، جو حضرت مسیح بن مریم سے بہت پہلے گزرا ہے، اس لیے یہ دیوار سدّ ذوالقرنین نہیں ہوسکتی، کیوں کہ وہ دیوار آہنی تھی، نیز ذوالقرنین حضرت مسیح سے دو ہزار (۲۰۰۰) برس پہلے گزرا ہے، اور وہ مردِ مومن تھا، کافر نہ تھا، اور فغفور باخدا وموحد نہ تھا، اس کو ذوالقرنین قرار دینا قطعاً غلط ہے۔

(۲)......دیوارِ سمرقند:

☆......وہ دیوار جو سمرقند کے قریب ہے، یہ ایک مستحکم دیوار ہے، جو لوہے کی چادروں اور اینٹوں سے بنائی گئی ہے، نہایت مستحکم اور بلند ہے، اور اس میں ایک دروازہ بھی ہے، جس پر قفل لگا ہوا ہے۔ خلیفہ معتصم نے خواب میں اس دیوار کو ٹوٹا ہوا دیکھا، تب اس کی تحقیق کے لیے پچاس آدمیوں کو روانہ کیا، وہ اس دیوار کو دیکھ کر آئے، اور آکر اس کا حال بیان کیا، یہ

دیوار جبل الطی کا درّہ بند کرنے کے لیے بنائی گئی تھی، بعض لوگ اس دیوار کو سد ذوالقرنین کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس دیوار کو یمن کے کسی حمیری بادشاہ نے بنایا تھا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ حمیری بادشاہ ذوالقرنین تھا، اور تبّع یمانی اس کی اولاد میں سے تھا، جس پر اس کو فخر تھا، لہٰذا بعض علماء کا خیال ہے کہ یہی دیوارِ ذوالقرنین ہے۔ واللہ اعلم!

(۳)......دیوارِ آذربائیجان:

☆......جو آذربائیجان کے سرے پر بُحیرۂ طبرستان کے کنارے جبلِ قبق کے گھاٹ کو بند کرنے اور غیر قوموں کی آمد کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی، یہ دیوار آذربائیجان اور آرمینیہ کے دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، یہ دیوار پتھر اور سیسے سے بنائی گئی ہے، جس کی بلندی تین سو گز ہے، اس دیوار کو نوشیرواں نے بنایا، یہ دیوار اب تک قائم ہے، بعض علماء نے اسی دیوار کو سد ذوالقرنین بتلایا ہے۔

(۴)......دیوارِ تبّت:

☆......یہ دیوار تبّت کے شمالی پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، یہ جگہ خراسان کا اخیر کنارہ ہے، یہاں ایک کنارہ ہے جس سے تُرک دھاوا کیا کرتے تھے، فضل بن یحییٰ برمکی نے دروازہ لگا کر اس کو بند کردیا، یہ دیوار بالاتفاق وہ دیوار نہیں، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، کیوں کہ یہ دیوار نزولِ قرآن کے بعد بنائی گئی۔

(۵)......دیوارِ ایشیائے کوچک:

☆......دنیا کی پانچویں بڑی دیوار وہ ہے کہ جو بُحیرۂ رُوم کے مشرقی کنارہ پر ایشیائے کوچک کے جزائر میں سے کسی جزیرہ میں واقع ہے، یہ معلوم نہیں کہ یہ دیوار کب بنی اور اب تک قائم ہے یا نہیں، یہ دیوار بھی بالاتفاق وہ دیوار نہیں، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے۔

غرض یہ کہ یہ سب تاریخی قصے ہیں جو ہرگز قابلِ اعتماد واعتبار نہیں۔

بہر حال یہ دنیا کی پانچ مشہور دیواریں ہیں، جن کا تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں ذکر ہے، اور مصنفین نے اپنے اپنے خیال اور تخمینہ سے سدِ ذوالقرنین کے مصداق بتلانے کی بڑی کوشش کی ہے، کسی نے کسی دیوار کو، اور کسی نے کسی دیوار کو۔ مگر سوائے اپنی خیالی قیاس آرائیوں کے، دلیل کسی کے پاس نہیں۔ ظن اور تخمینہ اہلِ عقل کے نزدیک تسلی بخش نہیں۔

﴿ان الظنّ لا يُغني من الحق شيئًا﴾

دیوارِ ذوالقرنین کے قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے اوصاف:

(۱) بانی دیوار خدا کا مقبول وبرگزیدہ بندہ ہے۔

(۲) بانی دیوار جلیل القدر بادشاہ، فرماں روائے مشرق ومغرب ہے، تائیدِ ربانی اور تمکینِ یزدانی کی سعادت اُسے حاصل ہے۔ فتح وکامرانی کا جھنڈا اُس کے آگے آگے ہے۔ کسی میں اس کے مقابلے کی تاب نہیں، شاہانِ عالَم اس کی عظمت وہیبت کے سامنے دَم بخود ہیں۔

(۳) دیوار آہنی ہے، پگھلے ہوئے تانبے سے تیار ہوئی ہے، اینٹ اور پتھر سے نہیں بنائی گئی۔

(۴) دیوار کے دونوں سرے دو پہاڑوں سے ملے ہوئے ہیں، دیوار بہت بلند و مستحکم ہے، بطورِ خرقِ عادت اور بطریقِ کرامت تیار ہوئی ہے۔

(۵) یاجوج وماجوج اس دیوار کے پیچھے بند ہیں، نہ وہ اس پر چڑھ سکتے ہیں، اور نہ سیڑھی لگا کر اس پر سے اُتر سکتے ہیں، نہ اس میں قیامت سے پہلے کوئی سوراخ کر سکتے ہیں۔

(۶) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اُس دیوار میں کچھ سوراخ ہو چکا ہے۔

(۷) یاجوج ماجوج روز اُس دیوار کو چھیلتے ہیں، وہ دوبارہ ویسی ہی ہوجاتی ہے، اور قیامت کے قریب اس کو توڑ سکیں گے۔

(۸) یاجوج ماجوج باوجود انسان ہونے کے، عام انسانوں سے قوت میں بہت زیادہ

ہیں۔ اور عددی کثرت میں تو اس قدر زیادہ ہیں کہ ان میں اور عام بنی آدم میں وہ نسبت ہے، جو ایک اور ہزار میں ہے، اور سب کافرو جہنمی ہیں۔

(۹) خروجِ یاجوج ماجوج نزولِ عیسیٰ کے بعد ہوگا۔

(۱۰) دعائے عیسیٰ سے یاجوج ماجوج غیر معمولی موت مر جائیں گے۔ اُن کی گردنوں میں نَغَفْ (طاعونی کیڑا) پیدا ہوگا، جس سے وہ سب ہلاک ہو جائیں گے۔

اِن دس اوصاف میں سے اول کے پانچ اوصاف قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، اور اخیر کے پانچ اوصاف احادیثِ صحیحہ مشہورہ میں مذکور ہیں۔

مؤرخین نے جن پانچ دیواروں کا تذکرہ کیا ان میں سے کسی میں یہ اوصاف مجموعی طور پر نہیں پائے جاتے ہیں، اس لیے اُن کے خیالات غیر معتبر ہیں، ان میں سے کوئی دیوار، دیوارِ ذوالقرنین کا مقصداق نہیں ہے، احادیثِ صحیحہ وصریحہ کا انکار گمراہی ہے، اور ان میں تاویل کرنا الحاد اور بے دینی ہے، لہٰذا ہم اس دیوار کی صحیح اور واقعی جگہ کی تعیین کو اللہ کے علم کے حوالہ اور سپرد کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال!

قصۂ ذوالقرنین سے ہمیں کیا سبق ملا؟

واقعۂ ذوالقرنین میں خاص کر دو باتیں نمایاں ہیں:

☆(۱)......ذوالقرنین جب پہلی مُہم سَر کرتے ہوئے دنیا کے مغربی کنارے پر پہنچے، تو وہاں ان کو ایک قوم ملی، جو کافر تھی۔ ذوالقرنین نے ان کو اسلام کی دعوت دی، اس قوم کا مفصل حال ذکر کرنے سے مقصود شرک کی برائی اور توحید کی تلقین ہے۔

☆(۲)......تیسرے سفر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ذوالقرنین کا یہ قول ﴿**فاذا جاء وعد ربي جعله دكاء**﴾ نقل کیا ہے کہ: ایک دن میری بنائی ہوئی یہ آہنی دیوار بھی پیوند خاک ہوجائے گی، اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی اور مضبوط سے مضبوط عمارت بھی ایک دن ختم ہوجانے والی ہے، ہمیشہ باقی رہنے والی چیزیں آخرت کی چیزیں ہیں، آخرت کا عیش ہی حقیقی عیش ہے، اس لیے اسی کی فکر کرنی چاہیے۔ کاش یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آجائے، اور ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹ جائے۔

☆......حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین کو یہ شوق ہوا تھا کہ دیکھیں دنیا کہاں تک بَستی ہے، مشرق اور مغرب تک پہنچا، مگر اللہ تعالیٰ کے ملک کی حد نہ پاسکا۔ پتہ چلا کہ انسان کو کسی بھی چیز کی تلاش وجستجو اور تتبُّع، حقیقت تک پہنچا ہی دیتی ہے، جیسا کہ ذوالقرنین کو آخر کار یہ حقیقت معلوم ہوہی گئی کہ اللہ کی ملکیت اور اس کا علم لامحدود ہے۔

☆......آج کے دور میں لالچی وحریص سیاسی سکندروں (وُزراء، بادشاہوں اور حکمرانوں) کو قصۂ ذوالقرنین سے سبق حاصل کرنا چاہیے، کہ پشتہ کی تعمیر کے لیے جائز مالی امداد کو قبول نہیں کیا، اس کے برخلاف یہ سیاسی گرگے؛ اپنی رعایا وعوام سے رشوت خوری کا معاملہ کرتے ہیں، جب کہ عوامی رفاہی یا ذاتی کام جو ان پر واجب ہوتے ہیں، یا انہی ترقیاتی ورفاہی کاموں کے لیے قوم انہیں منتخب کر کے اپنا نمائندہ تسلیم کر کے عہدے پر براجمان کرواتی ہے۔

☆......حکیم ودانا مؤمن کی بصیرت اور دینی سمجھ اس قصہ سے واضح اور آشکارا ہوتی ہے کہ؛ یہ وہ موقع تھا جہاں اس طاقت ور بادشاہ کے دل میں جو قوموں کا فاتح اور جہانگیر وجہاں کشاں تھا، ایمان نے جوش مارا، نہ اُن کے دل میں خود پسندی کی کوئی لہر پیدا ہوئی، نہ غفلت یا تکبر کا سایہ اُن پر پڑسکا، انہوں نے ﴿**انما اوتيته على علم عندي**﴾ نہیں کہا، بلکہ اس کام کا انتساب اللہ تعالیٰ کی طرف کیا، اور اس دھوکہ میں بھی نہیں پڑے کہ اُن کا یہ کارنامہ لافانی اور یہ پُشتہ ناقابلِ تسخیر ہے، بلکہ اسے اپنے رب کی مہربانی سے تعبیر کیا۔

☆......اس قصہ سے بااقتدار وباخبر انسان کا کردار معلوم ہوتا ہے، کہ جو قطعی طاقتوں اور مادی وسائل کو مسخر کرلیتا ہے، اور اسباب وذرائع کی زمام اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے، اس کی فتوحات اور کارناموں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوجاتا ہے، لیکن اپنی مادی قوت اور اقتدار وسلطنت کے انتہائی عروج اور وسعت کے موقع پر بھی وہ اپنے رب کو نہیں بھولتا، اس کے سامنے اس کا سر ہمیشہ خم اور گردن جھکی رہتی ہے، آخرت اس کے مدنظر ہوتی ہے، اور اس کے لیے وہ ہر وقت کوشاں اور لرزاں وترساں رہتا ہے، اپنے ضعف وناتوانی کا اقرار کرتا ہے، انسانیت اور کم زور اقوام کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتا ہے، حق کی حمایت کرتا ہے، اور اپنی ساری قوت وصلاحیت، سعی وجد وجہد، اور ذرائع ووسائل، انسانیت کی خدمت، صالح سوسائٹی کی تعمیر، اعلائے کلمۃ اللہ اور انسانوں کو اندھیروں سے روشنی میں لانے اور مادیت کی بندگی میں داخل کرنے پر صرف کرتا ہے، یہ وہ کردار ہے، جس کی نمائندگی سلیمان بن داود علیہما السلام اپنے عہد میں، ذوالقرنین اپنے زمانہ میں، خلفائے راشدین اپنے دور میں، اور ائمہ اسلام مختلف زمانوں اور ملکوں میں برابر کرتے رہے۔

☆......یہ قصہ مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو مغربی تہذیب سے بیزاری ودُوری اختیار کرنے کا سبق دیتا ہے، اس لیے کہ مغربی تہذیب جو دین سے باغی اور ایمان بالغیب کی منکر ہے، جو اپنی قوت وصنعت کے سوا اور کسی چیز پر یقین نہیں رکھتی، اپنی مصلحت وغرض کے سوا

کسی اور چیز کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتی، اس کے بڑے مراکز- امریکہ، یورپ، اور رُوس (وبرطانیہ) کبھی اعلان کے ساتھ اور کبھی بغیر اعلان کے؛ غیبی حقائق، روحانیت، اخلاق اور آسمانی نظام سے مستقل برسرِ پیکار ہیں، اور حالتِ جنگ میں ہیں، اور اب وہ زمانہ قریب ہے کہ جب یہ تہذیب، مادیت اور صنعتی ترقی نقطۂ اختتام پر پہنچ جائے گی، اور اس کا وہ سب سے بڑا نمائندہ اور ذمہ دار ظاہر ہوگا، جس کو نبوت کی زبان میں دجال کہا گیا ہے، اور جو ایک طرف مادی اور صنعتی عروج اور دوسری طرف کفر، مادیت واِلحاد کی دعوت، طبعی قوتوں کی پرستش، اور اس کے مسخر کرنے والوں کی غلامی وبندگی کے بالکل آخری اور انتہائی نقطہ پر ہوگا، اور عہد آخر کا سب سے بڑا فتنہ، دنیا کی سب سے بڑی مصیبت، اور اس مادی تہذیب کا نقطۂ عروج یا نقطۂ اختتام ہوگا، جو کئی سو برس پہلے یورپ میں ظاہر ہوئی تھی۔

☆......اس قصہ کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک خط فاصل کو بیان کردیا، جس سے ہم صالح وپاک باز اور باخبر وبااختیار بادشاہ؛ یعنی حضرت مہدی علیہ السلام- اور ایک فتنہ انگیز اور عالم آشوب شخصیت؛ یعنی دجّال میں امتیاز وفرق کرسکتے ہیں، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور تمام انبیاء نے اپنی امتوں کو بار بار متنبہ کیا ہے، بہت اہتمام کے ساتھ اس کی تشریح، وضاحت اور تاکید کی ہے۔

وہ حد فاصل اور سرحدی خط یہ ہے کہ حضرت سلیمان اور ذوالقرنین (نیز اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس طرح کے جتنے نمونے انفرادی یا اجتماعی شکل میں سامنے آئے) ان کے اندر فائق قوت، ملکی وسعت واستحکام، غیر معمولی اور حیرت انگیز حکمت وفراست، بہترین اور اعلیٰ مقاصد، دعوت الی اللہ اور اپنے علم وحکمت اور قوت وصلاحیت کو ہدایت، بنی نوعِ انسان کی فلاح، اور عدل وانصاف کے لیے استعمال کرنے کی خواہش اور صلاحیت کا بہترین اجتماع تھا، اس کے برعکس دجال کی پہچان، علامت اور خصوصیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بتائی وہ ''کفر'' ہے، جو اپنے وسیع تر معانی پر مشتمل ہے۔ وہ بہت داعی

اور گرم جوش، چست وچالاک اور مذاہب واخلاق کے مقابلہ میں کفر اور بغاوت کا علم بردار ہوگا۔ اس کا معاملہ اتنا آگے بڑھے گا اور اس کی دعوت اتنی عام ہوگی کہ کوئی گھر اور خاندان اس سے محفوظ نہ رہے گا، نہ عورتیں اور نہ لڑکیاں اس کے اثر وسحر سے آزاد رہ سکیں گی، گھر کا بڑا اور ذمہ دار اپنے گھر والوں، اپنی عورتوں اور لڑکیوں پر کوئی کنٹرول قائم نہ رکھ سکے گا، اور سب شترِ بے مہار ہوجائیں گے، سوسائٹی کا فساد اور اخلاقی انحطاط وزوال عروج کو پہنچ جائے گا۔

☆......اس قصہ میں مصلحین ومفسدین کی ایک سچی تصویر دکھائی گئی ہے، مصلحین میں ذو القرنین (وحضرت سلیمان شامل ہیں)، اور مفسدین میں یاجوج ماجوج اور انہی کی طرح فاسد مزاج وطبیعت رکھنے والی یورپی اقوام اور خاص کر قومِ یہود، جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں خرابی نہ پھیلاؤ، اور بدعملیوں سے باز آجاو، تو کہتے ہیں کہ ہمارے کام، خرابی کے باعث کیسے ہوسکتے ہیں، ہم ہی تو سنوارنے والے (مصلحین) ہیں۔ اس قصہ کے ذریعہ یہود کی عالمی سرگرمیوں پر بھی زد پڑتی ہے، جس نے عقل وحکمت، صنعت وسائنس، سیاست، حکومتوں کے انقلاب اور بغاوتوں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، اور اپنی غیر معمولی ذکاوت اور فکری وعملی صلاحیتوں کو صرف تخریبی اور منفی مقاصد، انتشار پیدا کرنے اور انارکی پھیلانے، طاقت کے لیے کشمکش، اور ایک نسل یعنی مقدس نسل اسرائیل کی برتری اور صرف ایک قوم؛ یعنی اللہ کی ''پسندیدہ امت'' کی سیادت پر مرکوز کریں۔

کامیاب قائدورہبر، ناظم ومہتمم، مدیرومعتمد، متولی وسرپرست کے لیے رہنما اُصول واقعۂ ذوالقرنین کی روشنی میں

قصۂ ذوالقرنین جوقرآنِ کریم کے صرف ایک صفحہ پر مشتمل ہے، مگراس میں بیس سے بھی زائد صفاتِ فنیہ واخلاقیہ، ایک کامیاب قائدورہبر کی بیان کی گئی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

☆......**التمکین :**

تمامِ قیادت کے لیے پہلی ضروری چیز ہے تمکین وقدرت اور استعداد وصلاحیت، تاکہ اہدافِ مطلوبہ کی تحقیق ممکن الحصول اورآسان ہو۔﴿**انا مکنا له في الارض**﴾۔

☆......**العلم :**

علم ایک وسیلہ وسبب ہے، جس کے ذریعے انسان اپنی مراد ومقصود تک پہنچتا ہے، اورتحقیقِ اہداف وتحصیلِ نتائج میں کامیاب ہوتا ہے۔لہٰذا کسی بھی قائد ورہبر کا علم میں ذی استعداد وباصلاحیت ہوناضروری ہے، نیز طلبِ علم میں جہد مسلسل اورعملِ پیہم کی ضرورت ہے، کیوں کہ علم سے انسان کواپنے حقوق ومطالبات کاعلم ہوتاہے۔﴿**واتیناه من کل شيء سببًا**﴾۔

☆......**الأخذ بأسباب العلم :**

صرف علم، صلاحیت واستعداد ہی کافی نہیں، بلکہ علم کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے، جب قائد وعالم اپنے علم پرعمل کرے گا، تو مقتدیٰ وعوام بھی اس کی پیروی کریں گے۔ ﴿**فأتبع سببًا**﴾۔

☆......**المرجعیة :**

قائدورہبراپنی عوام ورعایا کو، مدیرومہتمم اپنے طلبا کو، شترِ بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دے، کہ وہ خواہشات کی پیروی کرتے رہیں، اورمن مانی ومن چاہی زندگی گزاریں، بلکہ اُن کے حال احوال دریافت کرتے رہا کرے، اُن سے رجوع ہوتے رہیں، یعنی اچھے اورنیک کاموں پر

اُن کوثواب، بشارت وترغیب سنائیں، اور برے وگناہ کے کاموں پرتخویف وترہیب اور عذاب سے کام لیں۔﴿**إما تعذب وإما ان تتخذ فیهم حسنا**﴾۔

☆......**العدل :**

اپنی رعایا کے درمیان عدل وانصاف قائم کرے، کہ عدل وانصاف عوام میں راحت وطمانینت کی ضامن ہے۔ظالموں کو بروقت عقوبت وسزادے، بے گناہ کے ساتھ عفوودرگزر کا معاملہ کرے، تاکہ قائدورہبر کی عدل پسندی وعدل گستری کی بناپر، مظلوموں کے دل میں اپنے قائد سے محبت پیدا ہو۔﴿**أما من ظلم فسوف نعذبه**﴾۔

☆......**التحفیز لإجادة العمل :**

اپنے زیرنگرانی بہتر کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے، انہیں شکریہ وسپاس نامہ سے نوازے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مزید محنت ولگن سے بہترین کام کرنے پرآمادہ ہوں گے۔ ﴿**فله جزاء ن الحسنى وسنقول له من أمرنا یسرا**﴾۔

☆...... **الحرکة :**

ایک کامیاب رہبرورہنما کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی ماتحت رعایا اورمتعلقہ مقامات میں گھوم پھر کر، گشت لگا کررعایا کی خبرگیری اورمقامات کے کیف واحوال سے واقف رہے۔ کسی بھی وقت اُن سے بے خبر وناواقف نہ رہے۔اس انتظار میں نہ رہے کہ خودعوام ورعایا اپنے احوال میرے سامنے پیش کریں گی، بلکہ ازخود بنفس نفیس اُن کے پاس جاکران کے حال واحوال پرمطلع ہونے کی کوشش کرے۔﴿**حتی اذا بلغ مغرب الشمس. حتی اذا بلغ مطلع الشمس**﴾۔

☆......**التواصل والاستماع للشکوی :**

عوام ورعایا کواپنے شکوے شکایات، حاجات وضروریات، براہِ راست؛ پیش کرنے کی اجازت دے، اُن کے ساتھ اُن کے درجات کے مطابق اتصال ورابطہ رکھے، سائل ومسئول

عنہ سے ازخود تحقیق وتفتیش کرنے کی کوشش کرے، اُن کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے، اور اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔﴿قالوا یا ذا القرنین . قال ما مکنی فیه ربی﴾۔

☆......غلق باب الكسب غير المشروع :

غیر مشروع طریقۂ کسب کا سہارا نہ لے، یعنی قائد ورہنما کو یہ حق نہیں ہے کہ جس کام کا وہ مکلّف ہے، اُس پر اُجرت لے۔ اسی طرح کسی منصب پر فائز رہتے ہوئے اپنے ماتحتوں اور زیرنگیں لوگوں سے ہدیہ وعطیہ قبول نہ کرے۔﴿قال ما مکنی فیه ربی خیر فاعینونی بقوة﴾۔

☆......الإحساس بالمسؤولية :

قائد ورہنما کو اپنے مسئولین (زیرنگرانی لوگوں) کی خیر خبر لیتے رہنا ضروری ہے، تاکہ عوام ورعایا کی مصلحتوں کے مطابق فیصلہ لینے میں آسانی ہو۔﴿قال ما مکنی فیه ربی خیر فاعینونی بقوة﴾۔

☆......العفة وطهارة اليد :

صحیح قائد ورہنما وہی ہے جو ترقیاتی ورفاہی کاموں کے نام پر اپنی عوام کا استحصال واستیصال نہ کرے۔﴿قال ما مکنی فیه ربی خیر فاعینونی بقوة﴾۔

☆......نصرة المظلوم :

مظلوم کی مدد کرنا اُس سے کچھ لیے بغیر یہ صحیح قائد ورہنما پر ضروری ہے۔﴿فاعینونی بقوة اجعل بینکم وبینهم ردمًا﴾۔

☆......العمل الجماعي :

قائد ورہبر اپنی قوم سے اجتماعی طور پر کام لے، کہ اجتماعی طور پر کارِ خیر کی انجام دہی میں خیر وبرکت ہوتی ہے۔﴿فاعینونی بقوة﴾۔

☆......التوظيف الأمثل للطاقات البشرية :

اپنی رعایا وقوم میں جو شخص وفرد جس کام میں فنی مہارت رکھتا ہو، اُسے اُسی کام پر مامور

ومقرر کرے، یعنی طاقاتِ بشریہ کا لحاظ کرے، جیسا کہ ذوالقرنین نے افرادی وعملی قوت وطاقت کی مدد مانگی، اور مالی وعلمی امداد لینے سے انکار کیا۔﴿فاعینونی بقوة .... اتونی زبر الحدید﴾۔

☆......وضوح التعليمات والأوامر الصادرة من القيادة :

عوام ورعایا سے جو کام مطلوب ومقصود ہو، اور جس کام کی وہ طاقت رکھتے ہوں، اس کی برسرِ عام وضاحت کردے، اور وہ کام اُن کے سپرد کردے۔﴿اتونی .. انفخوا﴾۔

☆......استغلال المواد المتاحة :

رعایا کو جو کچھ وسائل حاصل شدہ ہیں، اُن کو کام میں لانا۔ جیسا کہ ذوالقرنین نے اُس قوم کے پاس موجودہ وسائل یعنی لوہا، تانبا وغیرہ کو پشتہ کی تعمیر لیے منگوایا۔﴿اتونی زبر الحدید .... اتونی افرغ علیه قطرًا﴾۔

☆......التعليم والتوجيه :

مثالی قائد ذوالقرنین نے اپنی رعایا کو مضبوط ومستحکم دیوار اور پشتہ بنانے کی کیفیت وتوجیہ بھی بتلادی۔﴿حتی اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتی اذا جعله نارا قال اتونی افرغ علیه قطرا﴾۔

☆......التعليم بالعمل :

پوری رعایا کو اپنے ساتھ عمل میں شریک کیا، تاکہ علم وعمل میں مطابقت ہوجائے، یعنی دیوار کے سلسلے میں جو کچھ تعلیم اُن کو دی تھی، اُس پر حسی طور پر عمل درآمد کرکے بھی بتلادیا۔﴿قال انفخوا حتی اذا جعله نارا قال اتونی افرغ علیه قطرا﴾۔

☆......استخدام القوة في التعمير والإصلاح :

تعمیر واصلاح میں رعایا کی قوت وطاقت کو کام میں لانا چاہیے۔ اکیلے اپنے بل بوتے پر کسی کام کے کرنے میں خلل واقع ہوسکتا ہے۔

☆......تحقيق المطلوب بأيسر الطرق وأقل خسارة ممكنة :

مطلوب کو آسان طریقہ سے حل کرنا، اور حتی الامکان کم خسارہ کا ارتکاب کرنا ایک صحیح قائد ورہنما کی خاصیت ہوتی ہے۔جیسا کہ ذوالقرنین اگر چاہتے تو براہِ راست یاجوج وماجوج سے قتال کرکے اُنہیں قرارِواقعی سزا دے سکتے تھے،مگر آپ نے اُن کے شر کو احسن طریق سے دفع کیا۔جانوں کے بڑے اور برے خسارہ سے بچ کر مالوں کا چھوٹا خسارہ برداشت کیا۔

کسی نے سچ کہا ہے: **الناس علی دین ملوکھم** ''رعایا اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتی ہے''۔ذوالقرنین امن پسند تھے،تو ان کی رعایا جس نے یاجوج ماجوج کی شکایت کی تھی وہ بھی امن پسند تھی، کیوں کہ انہوں نے شکایت کے موقع پر اُن سے قتل وقتال کی بات نہیں کی، بلکہ حد فاصل یعنی دیوار کے قیام کا مطالبہ کیا،اور ذوالقرنین کی طبیعت بھی یہی تھی، لہٰذا انہوں نے بھی دیوارِ آہنی کے قیام کا فیصلہ کیا۔

☆......التواضع ورد الفضل للّٰه :

کارِ خیر کی توفیق من جانب اللہ ہوا کرتی ہے، اور ایک بہترین،مثالی کامیاب قائد کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہر کارِ خیر کی نسبت اللہ کے فضل کی طرف کرتا ہے،جیسا کہ ذو القرنین نے کہا کہ اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال نہ ہوتی،تو میں اس دیوارِ آہنی کی تعمیر میں کامیاب نہ ہو پاتا۔﴿**قال ھذا رحمة من ربي**﴾۔

اللہ اگر توفیق نہ دے سب کے بس کی بات نہیں!

فیضانِ محبت عام تو ہے،عرفانِ محبت عام نہیں!

☆......سبحان اللہ!......الحمدللہ!......اللہ اکبر!......☆

☆...... **القرآن الكريم خير معلم** ......☆

تینوں واقعات میں نصیحت :

قصۂ اصحابِ کہف،قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام اور قصۂ ذوالقرنین سے مجموعی طور پر چند سبق مستفاد ہوتے ہیں:

☆......خود پسندی،فخر وغرور، اپنے معلومات وتحقیقات اور کسی خاص دور کے انسانی علم کے ذخیرہ پر حسد سے بڑھا ہوا اعتماد، اور اس کے سوا ہر چیز سے انکار، یہ تکبر،خودرائی،خود ستائی،فکر کی تنگی اور نظر کی پستی وہ ابتدائی ''جرثومہ'' یا مادہ ہے،جس نے مادیت کو اپنے سارے معانی ومقاصد کے ساتھ، یا یوں کہیے کہ اپنے تمام شرور ومفاسد کے ساتھ وجود بخشا ہے، یہ وہ بگڑی ہوئی انسانی نفسیات ہے، جس نے کبھی ظلم وسرکشی پر آمادہ کیا ہے، کبھی الوہیت وربوبیت کے دعوی پر اُکسایا ہے،اسی نے ان لوگوں پر ظلم کروایا ہے،جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح معرفت اور دُور رَس وعمیق نظر سے نوازا ہے،جیسا کہ اصحابِ کہف کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے۔

اور صرف حاضر وموجود پر ایمان، متاعِ عارضی اور سرابِ زندگی سے عشق، دنیا میں ہمیشہ رہنے وآرام کے سامان باقی رہنے کا یقین، نیز ہر اُس شخص کی تحقیر پر آمادہ کیا ہے، جو اس سامانِ ظاہری میں تہی دست وکم مایہ تھا،جیسا کہ دو باغ والے کے قصہ میں گزرا ہے۔کبھی یہ محدود علم انسانی ہر اس چیز پر استعجاب وحیرت پیدا کرتا ہے، جو پہلی نظر میں غلط یا عقل کے معیار اور مشاہدۂ احساس کی میزان کے خلاف معلوم ہوتی ہے،جیسا کہ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کبھی یہ محدود، عاجز اور قاصر نگاہ خطا کر جاتی ہے، اور دُور کو قریب، اور مجاز کو حقیقت سمجھ لیتی ہے، جس طرح ذوالقرنین کو یہ محسوس ہوا کہ سورج ایک گدلے چشمے میں ڈوب رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

قسمِ سادس (آیت ۹۹/تا ۱۱۰)

خروجِ یاجوج وماجوج

نفخۂ ثانیہ برائے جمع درمیدانِ حشر

آیت : ۹۹ ، ۱۰۰ ، ۱۰۱ : ﴿وترکنا بعضهم یومئذ یموج في بعض ونفخ في الصور فجمعنٰهم جمعًاO وعرضنا جهنم للكٰفرين عرضاO الذين كانت اعينهم في غطآء عن ذكري وكانوا لا يستطيعون سَمعًاO﴾ .

ربط : گزشتہ آیات میں ذوالقرنین نے دیوار کی تعمیر مکمل ہونے پر قیامت کا جو حوالہ دیا، اُسی حوالہ کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہاں قیامت کے کچھ حالات بیان فرمائے ہیں، کہ قیامت کے روز ہم جہنم کافروں (چاہے یاجوج ماجوج ہوں یا دیگر کفار) کے سامنے کردیں گے، اس دن وہ یقین کرلیں گے اللہ کا وعدہ برحق ہے۔

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

ترکنا : بمعنی جعلنا . بعضهم مفعولِ اول ہے، اور ضمیر کا مرجع یاجوج وماجوج ہیں، اور یومئذ یموج سے متعلق ہے۔

یموج : از بابِ نصر فعل مضارع واحد مذکر غائب، مصدر موجٌ ؛ لہریں مارنا، یعنی کثرت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے، جس کی لہریں اُٹھ رہی ہیں، اور پچھلی لہر اگلی لہر میں گھسی جارہی ہے، اور جملہ یموج مفعول ثانی ہے ترکنا کا۔ (اُردو میں کہا جاتا ہے: انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر)۔

الصور : القرن یُنفخ فیه . صور ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔

عرضنا : ماضی جمع متکلم، مصدر عرضٌ از بابِ ضرب؛ روبرو لانا، پیش کرنا، لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہے۔

جهنم : دوزخ، آگ کا ایک نام جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے۔ غیر منصرف ہے۔

غطاء : ڈھکنا، یعنی وہ سرپوش جو طباق کی قسم میں سے ہو، کپڑے وغیرہ کا نہ ہو، اور مرادی معنی ہیں؛ غفلت۔ غطاء مصدر بحالت جر ہے۔

کانوا : کا عطف کانت پر ہے۔ پھر جملہ صلہ ہے اور موصول صلہ مل کر الکافرون کی صفت ہیں، یعنی یہ لوگ کافر یاجوج وماجوج میں سے تھے۔

☆...... اعراب ......☆

ونفخ في الصور فجمعنٰهم جمعًا . نفخ ماضی مبنی مجہول، في الصور جار مجرور ہوکر نائب فاعل، فا عاطفہ تعقیبیہ جمعًا مفعول مطلق منصوب۔

☆......ضمائر......☆

☆......﴿بعضهم﴾ " هم " میں دو احتمال ہیں:

(۱) بعض الناس . قیامت کے دن لوگ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں گے۔

(۲) بعضَ یأجوج ومأجوج . وعدہ کے وقت ہم یاجوج ماجوج کو چھوڑ دیں گے۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿یموج في بعض﴾ میں **استعاره تبعيه** ہے۔ یاجوج وماجوج اپنی کثرت اور ایک دوسرے میں گھس جانے کی وجہ سے، سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کی طرح نظر آئیں گے۔ لفظِ ''یموج'' یہاں مستعار لیا گیا۔

☆......﴿کانت أعینهم في غطاء عن ذکري﴾ میں **استعاره تمثيليه** ہے۔ یعنی وہ دیکھتے تو ہیں، مگر عبرت حاصل نہیں کرتے، ان کے سامنے کائنات میں موجود قدرتی نشانیاں پیش کی جاتی ہیں، پھر بھی ایمان نہیں لاتے، اُن کی آنکھیں حقیقۃً غطاء وحجاب میں نہیں، بلکہ یہ بطریقِ تمثیل ہے۔

☆……پیغام واحکام……☆

☆……علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿هذا رحمة من ربي﴾ یہ ذو القرنین کا اپنا قول ہے، اور کوئی قرینہ سیاق وسباق میں ایسا موجود نہیں جس سے دیوار کے ٹوٹنے کو علامتِ قیامت میں شمار کیا جائے۔ اور شاید ذوالقرنین کو یہ پتہ بھی نہ ہو کہ اشراطِ ساعۃ میں خروجِ یاجوج وماجوج بھی ہے۔ انہوں نے ﴿وعد ربي﴾ سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ جانا مراد لیا ہے۔ پس اس صورت میں ارشادِ باری ﴿وتركنا بعضهم يومئذ يموج في بعض﴾ استمرارِ تجدُّدی پر دلالت کرتا ہے، یعنی برابر ایسا ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوں، یہاں تک کہ قیامت کا وقت آجائے۔ ہاں وہ ارشاد جو سورۃ الانبیاء میں آیا ہے ﴿حتى اذا فتحت ياجوج وماجوج الخ﴾ تو یہ بات بلاشبہ علاماتِ قیامت میں سے ہے، مگر اس میں دیوار کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ پس اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سورۃ الانبیاء کی آیت میں فتح سے عروج وخروج مراد ہے۔ دیوار کا ٹوٹنا اور یاجوج ماجوج کا نکلنا مراد نہیں، کیوں کہ اُس آیت میں دیوار کا ذکر نہیں۔

☆……سوالات……☆

سوال: ﴿وتركنا بعضهم يومئذ يموج في بعض﴾ کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یعنی اِس جانب کا راستہ بند ہوجانے، اور ذوالقرنین کے آہنی مضبوط دیوار بنادینے کے بعد وہ قومیں آپس ہی میں جنگ وپیکار میں مشغول ہوگئیں، اور وہ قومیں اتنی کثیر تعداد میں تھیں کہ جب ان کی باہم جنگ ہوتی، تو ایسا محسوس ہوتا جیسے سمندر موجیں مار رہا ہے۔

سوال: خروجِ یاجوج وماجوج کے متعلق علامہ کشمیری رحمہ اللہ کا کیا خیال ہے؟

جواب: خروجِ یاجوج وماجوج کا واقعہ دفعۃً پیش آنے والا ایک واقعہ نہیں، بلکہ "لهم خروج مرة بعد مرة" ان کے خروج کا یہ واقعہ یکے بعد دیگرے پیش آتا رہے گا۔

سوال: ﴿ونفخ في الصور﴾ سے کون سا نفخ مراد ہے؟

جواب: نفخۂ ثانیہ مراد ہے۔ جس پر قرینہ ﴿فجمعناهم﴾ موجود ہے۔ ایک قول نفخۂ اُولیٰ کا بھی ہے، مگر وہ ضعیف ہے۔

جنت اللہ کی خوشنودی کا گھر ہے……مومن اور نیک لوگوں کی میراث ہے

دنیا کے پرستاروں، منکرینِ آخرت اور اہلِ غفلت پر نکیر

خدا کے بجائے بندوں پر اعتماد

آیت: ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸:

﴿أفحسب الذين كفروا ان يتخذوا عبادي من دوني اولياء انا اعتدنا جهنم للكٰفرين نُزُلاO قل هل نُنَبِّئُكم بالاخسرين اعمالاO الذين ضل سعيهم في الحيٰوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صُنعًاO اولٰئك الذين كفروا باٰيٰت ربهم ولقائه فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيٰمة وزناO ذلك جزآؤهم جهنم بما كفروا واتخذوا اٰيٰتي ورسلي هزوًاO ان الذين امنوا وعملوا الصّٰلحٰت كانت لهم جنّٰت الفردوس نُزلاO خٰلدين فيها لا يبغون عنها حِولاO﴾.

ربط: ☆……سورت کا آغاز توحید ورسالت اور تذکیرِ آخرت سے ہوا تھا، اب سورت کو انہی تین مضامین پر ختم کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ازراہِ تمرُّد وسرکشی احکامِ خداوندی کے قبول کرنے سے اعراض کیا تھا، ان پر تہدید فرماتے ہیں، اور قرآن کریم کی حقانیت بیان فرماتے ہیں کہ وہ خدا کے بے شمار علوم پر مشتمل ہے۔

☆……ان آیتوں میں کافروں کا انجام تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور ان کے مقابلہ میں مؤمنین کا بہترین انجام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کا خاص اسلوب ہے کہ جب وہ ایک فریق کا تذکرہ کرتا ہے، تو دوسرے فریق کا تذکرہ بھی ضرور کرتا ہے، تاکہ ترغیب وترہیب اور اِنذار وتبشیر کے دونوں پہلو ایک ساتھ ہوجائیں۔ کافروں کے بارے میں دو باتیں مذکور ہیں کہ آخرت میں ان کا کوئی والی وارث نہ ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ ان کے نیک

اعمال کا بدلہ انہیں کیوں نہیں ملے گا؟!

☆......مفرداتِ لغویہ......☆

أفحسب : از بابِ حسِب صرف یہی ایک صیغہ مستعمل ہے، اور از بابِ سمِع بھی آتا ہے، اور یہی زیادہ فصیح ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے: **یحسَب أن ماله أخلده** .

(سورة الهمزة : ۳)

الذین کفروا : **حسب** کا فاعل ہے، اور **أن یتخذوا** مفعول بہ قائمِ مقام دو مفعولوں کے ہے۔ **عبادي** : مفعولِ اول ہے **یتخذوا** کا اور **اولیاء** مفعول ثانی ہے۔ اور **من دوني** حال ہے **عبادي** کا۔

نُزلا : مفعول ثانی ہے۔ **النزل** : اسم، کھانا جو مہمان کے سامنے پیش کیا جائے، مہمان کے قیام کی جگہ، جمع **أنزالٌ** . مصدر **نزول ومنزل** از بابِ ضرب؛ اترنا، سفر کرنا۔

ننبئکم : مضارع جمع متکلم، کُم ضمیر مفعول، مصدر **تنبئة** از بابِ تفعیل؛ بتانا، خبردار کرنا، آگاہی دینا، جتانا۔

بالأخسرین : **با** حرفِ جر۔ **أخسرین** اسم تفضیل بحالتِ جر جمع مذکر، مصدر **خسارة وخُسران** از بابِ سمع؛ ٹوٹے اور گھاٹے میں پڑنا۔

أعمالا : تمیز ہے اور اس کو جمع یا تو **مُشاکلةً** لایا گیا ہے، یا انواعِ اعمال کو شامل ہونے کی وجہ سے جمع لایا گیا ہے، کیوں کہ تمیز میں اصل مفرد ہونا ہے، اور **الذین** مع صلہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، اور **الأخسرین** کی صفت، بدل اور عطف بیان بھی ہو سکتے ہیں۔

ضلّ : ماضی واحد مذکر غائب، مصدر **ضلال** از بابِ ضرب وسمع؛ بھٹکنا، راہ سے دور پڑ جانا، ہلاک ہو جانا۔

یحسنون : مضارع جمع مذکر غائب، مصدر **إحسان** از بابِ افعال؛ خوبی پیدا کرنا، کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینا۔

صُنعًا : مصدر از بابِ فتح، اچھا کام کرنا، بنانا، کاریگری، امام راغب نے لکھا ہے: **صنع** کے معنی ہیں اِجادتِ فعل؛ یعنی کام عمدگی کے ساتھ کرنا، پس ہر **صنع فعل** ہے، اور ہر **فعل صنع** نہیں ہے۔ اس میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔ نیز **فعل** کی نسبت حیوانات کی طرف بھی ہوتی ہے، لیکن **صنع** کی نسبت حیوانات کی طرف نہیں ہوتی ہے۔

لا نقیم : مضارع منفی بلا، جمع متکلم، مصدر **إقامة** از بابِ افعال؛ قائم کرنا۔

ذلک جزآؤهم : **ذلک** مبتدا ہے، اور **جزاؤهم** اس سے بدلِ اشتمال یا بدلِ کل، اور **جهنم** خبر ہے۔ **ذلک** مذکر اس لیے ہے کہ خبر حقیقت میں بدل کی ہے۔

جنّٰت الفردوس : ٹھنڈی چھاؤں کے باغات۔

جنة : بہشت، باغ، **جنٌّ** سے مشتق ہے؛ درختوں والا ہر وہ باغ جس کے درخت زمین کو چھپالیں، جنت کہلاتا ہے۔ جنت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے، یا اس لیے کہ جنت کی نعمتیں ہماری آنکھوں سے مستور ہیں۔

فردوس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ یہ عربی لفظ ہے یا فارسی یا قبطی؟ فارسی میں **فردوس** اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درخت پھیلتے جائیں، اور قبطی میں انگور کی ٹٹیوں کو کہتے ہیں۔ جمع **فرادیس** آتی ہے۔ **نزلا** : **کانت** کی خبر بھی ہو سکتا ہے، اس وقت **لهم** محذوف سے متعلق ہو کر حال ہو جائے گا۔ اور اگر **لهم** خبر مقدم ہو تو **نزلا** حال ہوگا۔

لا یبغون : مضارع منفی بلا، جمع مذکر غائب، مصدر **بغي** از بابِ ضرب؛ چاہنا، طلب کرنا۔

حِولا : مصدر از بابِ نصر؛ پلٹنا، جگہ بدلنا (تبدیلی)۔ **تحوّل الرجل** : ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا۔

☆......اعراب......☆

خٰلدین فیها لا یبغون عنها حِولا .

خٰلدین لهم کی **هم** ضمیر سے حالِ منصوب، علامتِ نصب ي ماقبل مکسور، **فیها** متعلق

خالدین کے، لا یبغون فعل بافاعل، عنھا حولا مفعول بہ سے متعلق۔

☆......بلاغت......☆

☆......﴿یحسبون انھم یحسنون﴾ میں جناسِ ناقص تصحیف وخط ہے۔صیغوں کی شکلوں اور بعض حروف میں تغیُّر کی بناپر،اوراس کو جناسِ تصحیف بھی کہا جاتا ہے۔

جناسِ ناقص/تصحیف/خط : وہ جناسِ غیر تام ہے،جس میں دو لفظ خط ورسم میں متفق ہوں، اور لفظوں میں مختلف ہوں، اس طور پر کہ اگر نقطوں کو ختم کیا جائے، یا بدل دیا جائے،تو ایک کلمہ دوسرے جیسا ہی ہو جائے،جیسے مذکورہ مثال میں۔

نیز اس آیت میں جناسِ مُحرَّف بھی ہے۔

جناسِ مُحرَّف : وہ جناسِ غیر تام ہے،جس میں دولفظ ہیئتوں یعنی حرکات وسکنات میں مختلف ہوں،جیسے یحسبون اور یحسنون۔(گویا تصحیف وتحریف دونوں مذکورہ فرمانِ باری تعالیٰ میں ایک ساتھ جمع ہوگئیں ہے)۔

☆......﴿أفحسب الذین کفروا﴾ استفہام برائے توبیخ وتقریع ہے۔

توبیخ وتقریع : یعنی ڈانٹ ڈپٹ اور اظہارِ ناراضگی کرنا۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......خالقِ عالم حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی یاد اور ذکر سے کلی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے، وہ یہ کہ انسان جب اپنے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے،اس سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے، جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے،تو پھر وہ اِلحاد کی اندھیر نگری میں جا گرتا ہے،عموماً الحاد کی زندگی کے نیچے کچھ اس قسم کی شعوری وغیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان سراسر محتاج، بلکہ سراسر فقر،مجسم بھیک اور صرف سوال کے سوا کچھ

اور نہیں۔اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی (خدائی) امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کرسکتا، کھانے پینے اور پہننے حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی غریب آدمی کی زندگی کا کھلا ہوا خاصہ ہے۔اس کے باوجود وہ مطلق العنان اور آزاد رہنے کے لیے خدا سے بھاگتے ہیں،اور باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے مشرکوں کے نادیدہ وخود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انہوں نے ہر ضرورت اور حاجت کے لیے فنی خلاّق یا ٹیکنیکل ایکسپرٹوں اور لیڈروں (رہنماؤں) کا وہ طبقہ کھڑا کرلیا ہے،جس کی تعلیم وتربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں۔

☆......سوالات......☆

سوال: أخسرین اور خاسرین میں کیا فرق ہے؟

جواب: (ا)لغت میں لفظ''اخسر''باعتبارِ خسارہ وگھاٹا کے،لفظ''خاسر''سے بڑھا ہوا ہے۔

أخسر اسم تفضیل ہے،جس میں اشتراک ہوتا ہے،یعنی خسارے میں تو سب ہی شریک ہیں،البتہ بعض لوگ دیگر بعض لوگوں سے زیادہ خسارہ اُٹھانے والے ہیں۔

(۲)خاسرین : اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔کام کرنے والے پر دلالت کرتا ہے۔اسمِ فاعل بطریقِ حدوث متصف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

أخسرین : اسم تفضیل: جو بہ نسبت دوسرے کے زیادتیٔ معنیٔ فاعلیت پر دلالت کرے۔ اسم تفضیل میں زیادتی فی حد غیر ذاتہ؛یعنی دوسرے کے اعتبار سے مقصود ہوتی ہے۔

سوال: کفار بھی تو دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں،غریبوں کی مدد کرتے ہیں، رفاہی ادارے قائم کرتے ہیں،عدل وانصاف برتتے ہیں،مہربانی اور رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور بعض لوگ تو ایسے خیراتی کام کرتے ہیں،جن سے ایک دنیا فائدہ اُٹھاتی ہے،تو کیا ان کو ان کے کاموں کا آخرت میں کچھ بھی صلہ نہ ملے گا؟

جواب: ان کے لیے آخرت میں کوئی صلہ نہیں،اس کی دو وجہیں ہیں:

(ا) کفار کے سارے مقاصد دنیا تک محدود ہیں،ان کو نتائجِ اعمال اسی دنیا میں مطلوب ہیں،اس لیے ان کے اعمال اسی دنیائے فانی کے ساتھ فنا ہو جائیں گے۔آخرت میں کام

آنے والے اعمال تو بس وہی ہیں جو اللہ کی خوشنودی کے لیے کیے گئے ہیں، اور کافر چوں کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان نہیں رکھتا، نہ آخرت کا اسے یقین ہے، اس لیے اس کے اعمال آخرت میں بے کار ہوں گے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ آخرت میں اجر پانے کے لیے ایمان شرط ہے، اور کفار چوں کہ ایمان نہیں رکھتے، اس لیے آخرت میں ان کے لیے کوئی صلہ نہیں۔

سوال: ﴿**بالأخسرين اعمالا**﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: (۱) بقول حضرت ابن عباس اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما: اَخسرین سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، جو اپنے گروہ کو حق پر سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی شریعت منسوخ ہو چکی۔

(۲) بعض کے نزدیک وہ تارک الدنیا خانقاہ نشین راہب مراد ہیں، جو اپنے خیال میں آخرت کے طالب اور لذائذ دنیا سے روگرداں ہیں، حالانکہ وہ شریعتِ اسلامیہ کے منکر ہیں، اُن کی یہ ساری کوششیں سراب اور ناکارہ ثابت ہوں گی۔

(۳) بقول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ: حروراء والے یعنی خارجی مراد ہیں۔ یہ وہ فرقہ ہے جس نے سب سے پہلے صحابۂ کرام اور رفقائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف بغاوت کی، اور بغاوت کو حق سمجھا۔

سوال: ﴿**فحبطت اعمالهم**﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: کافر کی حسنات و نیکیاں مراد ہیں، جو اُس ابدی زندگی میں کسی کام کی نہیں، اب محض کفریات و سیئات رہ جاتی ہیں، سیئات کے بالمقابل حسنات کا وجود ہی نہیں، تو ضائع و اکارت کردیے جائیں گے، پھر تولنے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔

سوال: ﴿**فلا نقيم لهم يوم القيامة وزنا**﴾ سے کیا مراد ہے؟

جواب: (۱) قیامت کے دن بعض بڑے موٹے آدمی ایسے آئیں گے کہ مچھر کے پر کے برابر بھی اللہ کے نزدیک ان کا وزن نہ ہوگا، اس کی تصدیق کے لیے پڑھو ﴿**فلا نقيم لهم يوم القيامة وزنا**﴾۔

(۲) بعض طاقت ور، مضبوط، پرخور آدمیوں کو قیامت کے دن میزان کے پلڑے میں رکھا

جائے گا، لیکن اس کا وزن جَو برابر بھی نہ ہوگا، فرشتہ ایسے ستر ہزار آدمیوں کو ایک ہی دھکا دے کر پھینک دے گا۔

(۳) قیامت کے دن لوگ اپنے اعمال لے کر آئیں گے، جو ان کی نظر میں اتنے بڑے ہوں گے، جیسے تہامہ کے پہاڑ، لیکن تولنے کے بعد ان کا کوئی وزن ہی نہ ہوگا۔

سوال: کیا میدانِ محشر میں ہر شخص کے اعمال کا وزن ہوگا؟

جواب: ہر شخص کے اعمال کا وزن ہونا ضروری نہیں، نہ ہر مومن کے اعمال کا، نہ ہر کافر کے اعمال کا، جو لوگ بلا حساب کے جنت میں چلے جائیں گے، ان کے اعمال کا وزن بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح کچھ لوگ بلا حساب دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے، تو ان کے اعمال کا بھی وزن نہ ہوگا۔

سوال: ﴿**فلا نقيم لهم يوم القيامة وزنا**﴾ اور ﴿**وأما من خفت موازينه**﴾ دونوں آیتوں میں تعارض ہے، ایک میں وزنِ اعمال کی نفی اور دوسری میں اثبات ہے؟

جواب: پہلی آیت کفار کے متعلق ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال کی ہمارے یہاں کچھ قدر و منزلت نہ ہوگی۔ جب کہ دوسری آیت ان مؤمنین کے متعلق ہے جن کی سیئات (برائیاں) ان کی حسنات (نیکیوں) سے زیادہ ہوں۔ ان سیئات کی پاداش میں وہ جہنم میں داخل ہوں گے، مگر ہمیشہ اس میں نہیں رہیں گے، سزا بھگتنے کے بعد اس سے خلاصی پا کر جنت میں داخل ہوں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہ رہا۔

سوال: جنات الفردوس سے کیا مراد ہے؟

جواب: جنات الفردوس نیکوکار مومنین کا مسکن ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اللہ سے مانگا کرو، تو فردوس ملنے کی دعا کیا کرو، کیوں کہ وہ جنت کے وسط میں ہے، اور دوسری جنتوں سے اعلیٰ ہے، اس کے اُوپر رحمٰن کا عرش ہے، اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔

اور فردوس والے عرش کی چرچراہٹ سنتے ہیں؛ یعنی عرش و فردوس کے درمیان کوئی دوسری جنت حائل نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شرکِ جلی وشرکِ خفی سے ہوشیار......قبولیتِ عبادت کی شرطیں

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارُف

آیت : ۱۰۹ ، ۱۱۰ :

﴿قل لو كان البحر مدادًا لكلمٰت ربي لنفد البحر قبل ان تنفد كلمٰت ربي ولو جئنا بمثله مددًاO قل انما انا بشر مثلكم يوحٰى الي انما الٰهكم الٰه واحد فمن كان يرجواْ لقآء ربه فليعمل عملا صٰلحا ولا يشرك بعبادة ربهٖ احداO﴾

ربط : یہ دونوں آیتیں سورت کی آخری موعظتیں ہیں، ان دو آیتوں میں دو اہم باتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے علوم غیر متناہی ہیں۔ ان کے کلمات بے نہایت ہیں، اور ان کی باتیں بے پایاں ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر ہیں، البتہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وحی سے سرفراز فرمایا ہے۔

یہ دو باتیں اس سورت کے خاتمہ میں اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ اس سورت میں قریش کے تین سوالات کے جوابات نازل کیے گئے ہیں، یہ جوابات کچھ بہت زیادہ مفصل نہیں دیئے گئے، بلکہ روح کے بارے میں تو بہت ہی مختصر جواب دیا ہے، اس لیے اب بطورِ تنبیہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جہاں تک مخاطبین کے فہم کی رسائی تھی قرآن کریم کے موضوع کو ملحوظ رکھ کر جوابات دیئے گئے ہیں، اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات بس اتنی ہی ہیں، اس کے علوم بے پایاں و بے انتہا ہیں۔

☆......نیز اس موقع پر ایک بات اور پیش آئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ فرمایا تھا، مگر پندرہ (۱۵) دن تک وحی نہیں آئی، جس سے

مکہ والوں کو آوازیں کسنے کا موقع مل گیا، اس لیے اعلان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہیں، سب باتوں کا ان کو علم نہیں، جو باتیں ان کی طرف وحی کی جاتی ہیں، وہی بتاتے ہیں، پھر حکیمانہ اسلوب سے بات کا رخ پھیر دیا ہے کہ آپ پر سب سے اہم وحی ''توحید'' کی آئی ہے، کیوں کہ آخرت کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے۔

☆......اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو آخرت کے ذکر، اس کی اہمیت کے اظہار، اور اس کی دعوت وتبلیغ کو زندگی کی اساس اور ہر عمل کی بنیاد بنانے کی دعوت پر ختم کیا، یہاں بھی خاتمہ آغاز کے ساتھ مربوط اور اس روح کے ساتھ ہم آہنگ وہم رنگ ہے، جو پوری سورۃ میں جاری وساری ہے۔

☆......پس منظر آیت : ۱۰۹......☆

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے کہا: ﴿وما اوتيتم من العلم الا قليلا﴾ تو یہود نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ ہمیں تورات دی گئی ہے، اور جسے تورات دی گئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) یہود نے ایک مرتبہ مسلمانوں سے کہا کہ تم قرآن میں پڑھتے ہو: ﴿ومن يؤت الحكمة فقد اوتي خيرًا كثيرًا﴾ یعنی جس کو حکمت دی گئی تو اس کو خیر کثیر دی گئی۔ نیز تم یہ بھی پڑھتے ہو ﴿وما اوتيتم من العلم الا قليلا﴾ تم کو جو علم دیا گیا وہ قلیل ہے۔ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں، کیوں کہ آپ خود اس بات کے مقر ہیں کہ ہم کو توریت دی گئی، جو کتابِ حکمت ہے، اور حکمت خیرِ کثیر ہے، تو پھر یہ کیسے کہا گیا کہ تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مطلب یہ ہے کہ توریت اگرچہ خیر کثیر ہے، لیکن اللہ کے کلماتِ حکمت کے مقابلے میں قلیل ہے، تمام مخلوقات کا علم اللہ تعالیٰ کے دریائے علم کے سامنے ایک قطرہ ہے، بلکہ یہ بھی نہیں، اللہ کا علم قدیم اور غیر متناہی ہے، اور مخلوق کا علم حادث

وتناہی۔

علم ہااز بحرعلمش قطرۂ ☆ ایں چوں خورشیداست وآنہاذرّۂ

گرکسے درعلم صدلقماں بود ☆ پیش علم کاملش ناداں بود

☆......پس منظر آیت : ۱۱۰......☆

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت؛ جندب بن زہیر العامری کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں اللہ کے لیے عمل کرتا ہوں، جب مجھے اس کا پتہ چلتا ہے، تو میں خوش ہوتا ہوں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور صرف پاکیزہ چیزوں کو قبول کرتا ہے۔ وہ شرک آمیز باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

(۲) حضرت مجاہد کا قول ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں خیرات کرتا ہوں، صلہ رحمی کرتا ہوں، اور یہ دونوں کام محض اللہ تعالیٰ کی خاطر کرتا ہوں، تاکہ میرے ان کاموں کا تذکرہ یعنی شہرت ہو، اور اس کے لیے میری تعریف کی جائے، میں اس سے خوش ہوتا ہوں، اور مجھے یہ بہت پسند ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ نہ کہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

☆......مفردات لغویہ......☆

البحر : جمع بحار، **البحر** سے مراد جنس ہے، جو قلیل وکثیر سب پر صادق آتی ہے، کوئی معین سمندر مراد نہیں۔

مِدادًا : اسم، روشنائی، چراغ کا تیل، ہر چیز کی زیادتی، جنت کے حوض کے متعلق حدیث میں آیا ہے: **میزابان مدادهما الجنة**۔ (دو نالے اُس میں آ کر کھلتے ہیں، جن میں پیہم افزونی جنت سے ہوتی ہے، یعنی جن کا سرچشمہ جنت میں ہے)۔ آیت میں اول الذکر معنی مراد ہے۔ مثال وطریقہ اور تعداد وغیرہ کے لیے بھی مستعمل ہے، جیسے **هم على مدادٍ واحدٍ**؛ وہ

ایک مثال پر ہیں۔ **سبحان الله مداد كلماته**؛ اللہ کے لیے پاکی ہے ان کی باتوں کی تعداد کے مطابق یعنی غیر متناہی۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔

لكلمٰت ربي : مضاف محذوف ہے، أي؛ **لكتابة كلمٰت ربي** .

لنفد : قرآنِ کریم میں لفظ" **نفد**"،مع مشتقات پانچ جگہ مستعمل ہے: " **نفد ، ينفد ، تنفد ، نفدت ، نفاد** " . ان سب کا معنی ایک ہی ہے، اور وہ ہے: ختم ہوجانا۔ فنا ہوجانا۔ کسی چیز کا کچھ بھی باقی نہ بچنا۔

أن تنفد : بتاویلِ مصدر ہوکر قبل کا مضاف الیہ ہے۔ مضارع منصوب بأن۔ واحد مؤنث غائب، مصدر **نفد** از بابِ سمع۔

مَددًا : تمیز ہے۔ **مدد** کے معنی ہیں زیادتیٔ کمک کے۔ مگر آیت میں عام زیادتی مراد نہیں، بلکہ روشنائی کی افزونی اور ایسی زیادتی مراد ہے جو کسی پانی کے سرچشمے اور سوت سے پیہم ہوتی رہے۔

إنما : إنّ حرفِ مشبہ بالفعل اور **ما** کافہ ہے۔ **ما** نے **إنّ** کا لفظی عمل روک دیا ہے، اور پورا کلمہ **إنما** حصر کے لیے ہے۔

أنما : أنّ حرفِ مشبہ بالفعل اور **ما** کافہ ہے۔ اس **ما** نے بھی **أن** کا لفظی عمل روک دیا ہے، اور یہ بھی کلمۂ حصر ہے۔ دونوں (إنما أنما) کا معنوی عمل باقی ہے۔

أن اور إن میں فرق: دونوں میں فرق یہ ہے کہ **إن** کا کام تاکیدِ جملہ ہے، اور **أن** تاکیدِ جملہ کے ساتھ مابعد کو بتاویلِ مفرد بھی کرتا ہے۔ ابن ہشام نحوی فرماتے ہیں: اصح یہ ہے کہ أن مفتوحہ إن مکسورہ کی فرع ہے، اور اسی وجہ سے زمخشری کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ أنما مفتوحہ إنما مکسورہ کی طرح مفیدِ حصر ہے۔ اور یہ دونوں کلماتِ حصر اس آیت میں جمع ہیں۔ پہلا کلمہ صفت کو موصوف پر منحصر کرنے کے لیے ہے، اور دوسرا برعکس۔ **إنما أنا بشر**

مثلکم میں مخاطبین جیسی بشریت (صفت) مقصور ہے۔ اور أنا (موصوف) مقصور علیہ ہے۔ اور أنما الٰھکم اللہ واحد میں معبودِ برحق (موصوف) مقصور ہے، اور وحدانیت (صفت) مقصور علیہ ہے۔ پس پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ میں بس تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں، اللہ کی ساری باتیں نہیں جانتا، جیسا کہ تم نہیں جانتے، صرف وہی باتیں جانتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہیں، اور دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ معبودِ برحق میں صرف وحدانیت کی صفت ہے، تعدد کی صفت نہیں ہے، جیسا کہ مشرکین کا خیال ہے۔ مثلکم صفت ہے بشرٌ کی، اور أنما الھکم بتاویلِ مفرد ہوکر یوحیٰ کا نائب فاعل ہے۔

فلیعمل : فا جزائیہ ہے۔ **لیعمل** : فعل امر واحد مذکر غائب، مصدر **عمل** از بابِ سمع؛ عمل کرنا۔

ربہ : رب مضاف ہ ضمیر مضاف الیہ، مصدر رب از بابِ نصر؛ تربیت. پھر مبالغہ کے لیے **عدل** کی طرح بطورِ وصف استعمال کیا جانے لگا۔ بقول امام راغب؛ رب مصدر ہے جو فاعل کے معنی کے لیے مستعار ہے۔

اور تربیت کی تعریف امام صاحب موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے: " هو انشاء الشيء حالا فحالا إلى حد التمام "؛ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشو ونما دینا کہ وہ حدِ کمال تک پہنچ جائے۔

☆......اعراب......☆

قل لو کان البحر مدادًا لکلمٰت ربي . قل فعل امر مجزوم، لو حرفِ شرط غیر جازم، کان فعل ناقص، البحر کان کا اسم مرفوع، مدادا کان کی خبر منصوب، لکلمات متعلق بصفت، ربي مضاف الیہ مجرور، علامتِ جر کسرۂ مقدرہ ماقبلِ ي۔

☆......پیغام واحکام......☆

☆......آخرت کی کام یابی خالص توحید اور عملِ صالح پر موقوف ہے پس جو شخص اللہ تعالیٰ

سے ملاقات کا خواہش مند ہے، اُسے چاہیے کہ عملِ صالح کرے اور عبادتوں کو شائبہ شرک سے بھی بچائے، کام یابی کی یہی کنجی ہے۔

☆......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، یعنی اپنی نوع کے اعتبار سے انسان ہیں، اور وہ بھی ''تم ہی جیسے''، یعنی ماہیت اور لوازمِ ماہیت میں آپ بھی جملہ انسانوں کی طرح ہیں، البتہ اوصاف وکمالات میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپ کے بشر ہونے سے خود بشریت رشکِ ملائکہ بن گئی ہے، لہٰذا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر اور انسان نہیں مانتا اور بلا تاویل صاف انکار کرتا ہے، وہ کافر ہے، کیوں کہ وہ قرآنِ کریم کی صریح نص کا منکر ہے۔

☆......آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر، یا بھائی، یا باوا، یا انسان، یا آدمی کہہ کر پکارنا، یا اپنے جیسا کہنا، یا ماننا، تو یہ کچھ لوگوں کا بزرگوں پر کیچڑ اُچھالنے کے لیے کھڑا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود نہیں، تو پکارنے کا کیا سوال ہے؟! رہا اپنے جیسا کہنا، یا ماننا، تو وہ اگر مسئلہ کی وضاحت کے لیے ہے، تو ضروری ہے، خود قرآنِ کریم میں یہ بات پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے، تاکہ امت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بندگی کے مقام سے آگے نہ بڑھادے۔ اور توہین کے لیے کہنے کی کسی امتی سے اُمید نہیں کی جاسکتی۔

☆......جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نوع کے اعتبار سے بشر ہیں، صفتِ ہدایت اور کمالِ رسالت کے اعتبار سے مینارۂ نور ہیں۔ اسی نور کی روشنی میں انسانیت کو خدا تعالیٰ کا راستہ ملتا ہے، اور یہ نور ابد تک درخشندہ وتابندہ رہے گا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت نور بھی ہیں اور بشر بھی۔ نور وبشر کو دو خانوں میں بانٹ کر ایک کی نفی کرنا اور دوسرے کا اثبات کرنا صحیح نہیں۔ قرآنِ کریم میں بشر کا اطلاق تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صاف اور صریح موجود ہے، مگر نور کا اطلاق قطعی نہیں۔

☆......سیرت کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا، کیوں کہ نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ نیز زمین محلِ کثافت ہے، اس لیے اس پر آپ کا سایہ پڑنا آپ کی

شان کے خلاف ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں۔

☆......شرک مطلقاً ممنوع ہے، چاہے شرکِ اکبر یا شرکِ اصغر۔ کوئی بھی عمل جو دنیوی غرض کے لیے کیا گیا ہو، شہرت و وجاہت اس سے مقصود ہو، اور لوگوں کو دکھلانے اور سنانے کے لیے کیا گیا ہو، وہ مقبول نہیں۔ نیت کا کھوٹ عمل کو ضائع کر دیتا ہے، بلکہ وہ عمل آخرت میں وبالِ جان بن جائے گا۔

☆......اخلاص وریا کے اعتبار سے عمل کی چار صورتیں ہیں:

(۱) شروع سے اخیر تک عمل محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، اور عمل پورا ہونے کے بعد بھی کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ یہ عمل کا نہایت اعلیٰ درجہ ہے۔ ایسا شخص عرش کے سایہ میں ہوگا۔

(۲) شروع سے اخیر تک عمل محض ریا ونمود کے لیے ہو، یعنی دنیوی اغراض کے لیے، یا لوگوں کی تعریفیں وصول کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔ ایسا عمل بے کار و بے فائدہ ہے۔ ایسا عمل انسان کے لیے آخرت میں وبالِ جان بن جائے گا۔

(۳) شروع میں اخلاص ہو، مگر پورا ہونے سے پہلے اس میں ریا ونمود شامل ہو گیا ہو۔ یہ ریا بھی عمل کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس کو شرکِ خفی یا شرکِ اصغر بھی کہتے ہیں۔

(۴) شروع تا اخیر عمل اخلاص پر مبنی ہو، کسی کے سامنے ظاہر نہ کیا، نہ اس کے اظہار کی خواہش کی، مگر کسی وجہ سے خود بخود اس عمل کی شہرت ہوگئی، لوگ تعریفیں کرنے لگے، اور وہ اچھی معلوم ہونے لگیں۔ یہ بات عمل کے لیے مضر نہیں۔ **تلک عاجلُ بُشری المؤمن** یہ مومن کے لیے نقد بشارت ہے۔

☆......شرکِ خفی یعنی اعمالِ صالحہ میں ریا ونمود بہت خطرناک چیز ہے، اس سے حتی الامکان بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

☆......مسند دارمی میں ہے کہ زرّ بن حُبیش نے حضرت عبدہ کو بتلایا کہ جو آدمی سورۂ کہف کی آخری آیتیں ﴿**قل لو کان البحر مدادًا لکلمٰت ربي**﴾ سے آخر سورت تک پڑھ

کر سوئے، وہ جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرے گا، بیدار ہوگا۔ عبدہ کہتے ہیں: ہم نے اس کا تجربہ کیا بالکل ایسا ہی پایا۔

☆......**نذر و نیاز میں شرک:** اصحابِ کہف کا ذکر شروع سورۃ میں ہوا کہ انہوں نے اللہ کی رحمت کے بھروسے پر غار میں پناہ لی، مگر اب لوگ انہی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے لگے ہیں، بعض علاقوں میں مشرک لوگ اصحابِ کہف کے نام کی نیاز دیتے ہیں، سات روٹیاں اصحابِ کہف کی اور آٹھویں اُن کے کتے کی مشہور ہیں، جو نیاز میں دی جاتی ہیں۔ اگر ایصالِ ثواب مقصود ہو، تو پھر تو کوئی حرج نہیں، اور اگر ان کو حاجت روا سمجھ کر نیاز دی جاتی ہے، تو یہی شرک بن جاتا ہے، کیوں کہ اللہ کے مقرب ترین بندے بھی کوئی اختیار نہیں رکھتے، اور نہ وہ کسی کی مشکل کشائی کر سکتے ہیں، یہ تو محض وسوسہ اندازی اور گمراہی ہے۔

☆......قبولیتِ عبادت کی دو شرطیں ہیں:

(۱) اخلاص، جس کے لیے توحید خالص کا ہونا ضروری ہے، اور توحید خالص شرک کی جمیع اقسام سے مکمل برأت پر ہوتی ہے۔

(۲) عمل مسنون طریقہ پر کیا جاوے، ورنہ من مانی سے کیا گیا عمل مردود و نامقبول ہوتا ہے۔

☆......سوالات......☆

سوال: آیتِ مذکورہ ﴿**انما انا بشر مثلکم**﴾ اور سورۂ مائدہ کی آیت ﴿**قد جاء کم من اللّٰہ نورٌ و کتٰب مبین**﴾ میں تعارض معلوم ہوتا ہے، کہ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہا گیا اور دوسری جگہ نور؟

جواب: آیتِ مائدہ میں نور سے قرآنِ کریم، اسلام اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تینوں کو مراد لیا گیا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صرف قرآنِ کریم مراد لیا ہے، اور یہی رائے صاحبِ کشاف

علامہ جاراللہ زمخشری رحمہ اللہ کی ہے، راجح تفسیر یہی ہے۔

سوال: علامہ ابن کثیر اور علامہ جاراللہ زمخشری رحمہما اللہ کی تفسیر راجح ہے، اس پر کیا قرینہ ہے؟

جواب: اس پر دو قرینے موجود ہیں:

(۱) پہلا یہ کہ "بہ" میں مفرد کی ضمیر آئی ہے، اگر نور و کتابِ مبین دو چیزیں ہوتیں، تو ضمیر تثنیہ آتی۔

(۲) دوسرا یہ کہ قرآنِ کریم میں کسی جگہ نبی کو نور نہیں کہا گیا، البتہ کتبِ سماوی توریت وانجیل کو سورۂ مائدہ آیت ۴۴ و ۴۶ میں نور کہا گیا ہے، پس اس آیت میں بھی نور کا اطلاق قرآنِ کریم پر کیا گیا ہے، اور عطف تفسیری ہے، اور عطف کے لیے فی الجملہ مغایرت یعنی وصف کے اعتبار سے مغایرت کافی ہے۔

سوال: ایک حدیث ہے "أول ما خلق اللّٰه نوري" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور پیدا کیا؟

جواب: اس حدیث کی سند کا کوئی پتہ نہیں۔ اور جن کتبِ حدیث کے حوالہ سے یہ منقول ہے، مثلاً: مواہبِ لدنیہ، مصنف عبدالرزاق، شرح الزرقانی؛ ان میں یہ حدیث موجود ہے ہی نہیں، صرف کشف الخفاء میں موجود ہے، وہ بھی ناقص، پوری حدیث پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قطعاً موضوع روایت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

سوال: ﴿ولا یشرک﴾ آخر آیت میں شرک کی ممانعت کی گئی ہے، وہ عام ہے یا خاص؛ یعنی شرکِ جلی مراد ہے، یا شرکِ خفی؟

جواب: ممانعتِ شرک عام ہے، شرکِ جلی (اکبر) اور شرکِ خفی (اصغر) سب کو شامل ہے۔

سوال: شرکِ جلی و شرکِ خفی کسے کہتے ہیں؟

جواب: شرکِ جلی؛ یعنی وہ شرک جو مشرکین کرتے ہیں۔ اور شرکِ خفی؛ یعنی وہ شرک

۱۵۷

جسے ریاء و نمود کہا جاتا ہے۔ جس طرح شرکِ جلی سے عمل باطل ہوجاتا ہے، ایسے ہی شرکِ خفی یعنی ریاکاری بھی عمل کا ناس کردیتی ہے۔

سوال: پہلی اور آخری آیت میں مناسبت و لطیفہ کیا ہے؟

جواب: پہلی آیت میں حمد و توحیدِ باری تعالیٰ کا اقرار و اثبات؛ یعنی اعلانِ توحید ہے۔ اور آخری آیت میں تثبیت (مضبوطی و پختگی) توحید ہے۔ یہ محسناتِ معنویہ میں سے ہے، بلاغت کی اصطلاح میں اس کو استِطْراد کہتے ہیں۔

سوال: استِطْرَاد کی تعریف کیا ہے؟

جواب: متکلم کا ایک غرض سے - جس کو وہ بیان کررہا تھا - دوسری غرض کی طرف نکل جانا، دونوں غرضوں کے مابین مناسبت کی وجہ سے، پھر پہلی غرض کی طرف عود کرنا۔

اللهم إني أعوذ بك من أن أشرك بك شيئًا وأنا أعلم به واستغفرك

ولا حول ولا قوة إلا بالله

نعوذ بالله من الرياء في العمل

ونعتصم به من وقوع الزلل

آمين يا رب العالمين !

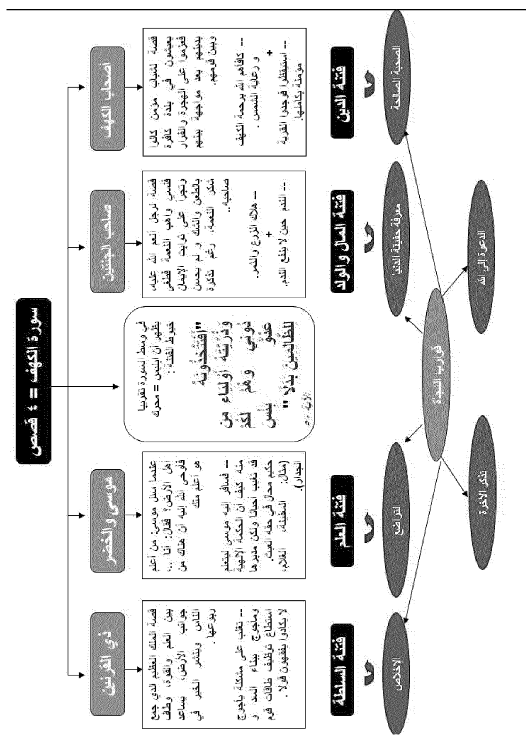
سورة الكهف = ٤ قصص
أصحاب الكهف
صاحب الجنتين
موسى والخضر
ذي القرنين
فتنة الدين
فتنة المال والولد
فتنة العلم
فتنة السلطة
قوارب النجاة
الصحبة الصالحة
معرفة حقيقة الدنيا
التواضع
الإخلاص
الدعوة إلى الله
تذكر الآخرة

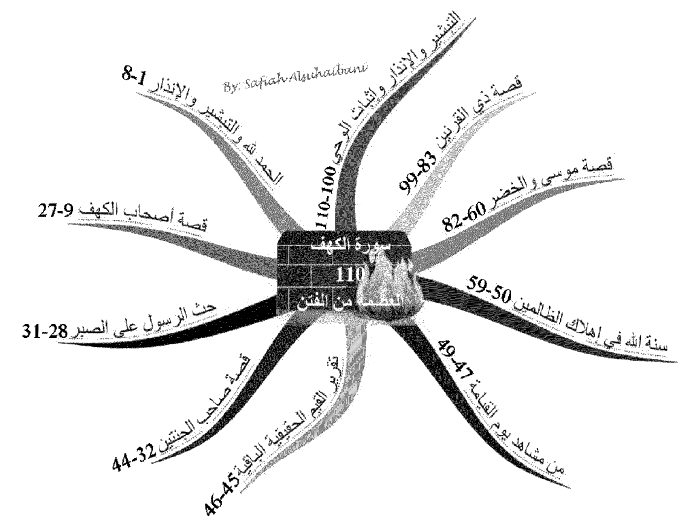
سورة الكهف
110
العصمة من الفتن
By: Safiah Alsuhaibani
الحمد لله والتبشير والإنذار 1-8
التبشير والإنذار وإثبات الوحي 100-110
قصة ذي القرنين 83-99
قصة موسى والخضر 60-82
قصة أصحاب الكهف 9-27
سنة الله في إهلاك الظالمين 50-59
حث الرسول على الصبر 28-31
من مشاهد يوم القيامة 47-49
قصة صاحب الجنتين 32-44
تقرير القيم الحقيقية الباقية 45-46